سلسلۂ مطبوعات مکتبۂ ابراہیمیہ

مقدماتِ عبدالحق

حصۂ اوّل

مُرتّبہ

مولوی مرزا محمد بیگ صاحب
اسپشل تعلقدار نظام ساگر

سنہ ۱۹۳۱ء

اول (۵۰۰)

قیمت (سے)

فہرست مندرجات



مقدمہ

از

جناب مولانا مولوی محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی

صدر یار جنگ بہادر سابق صدر الصدور سلطنت آصفیہ (حیدرآباد دکن)

مرزا محمد بیگ صاحب دکن کے ان نوجوانوں میں ہیں جو اپنے سینے میں لولہ اور دل میں علم و ادب اور وطن کی خدمت کا ذوق رکھتے ہیں۔ اسی کا اثر ہے کہ باوجود ملازمت کے فرائض کو خوبی سے انجام دینے کے اہتمام کے علم وطن کی خدمت بھی کرتے رہتے ہیں۔ میں نے قیام حیدرآباد میں مرزا صاحب کو وطنی و علمی خدمت کے لئے ہمیشہ مستعد پایا۔ اس مستعدی کی بنا پر میرے دل میں ان کی عزت ہے۔ اسی پاس عزت کا اثر تھا کہ جب میرے قیام حیدرآباد کے آخری ایام میں مرزا صاحب نے مولوی عبدالحق صاحب کے مقدمات کے مجموعے کو شائع کرنے کا خیال ظاہر کرکے اس پر مقدمہ لکھنے کی فرمائش کی تو میں نے بے تامل اس کو قبول کرلیا۔ اس قبول میں ایک اور گہرا خیال بھی معین ہوا اور وہ ایک ممنونی کے اظہار کا موقع ہاتھ آنا ہے۔ اگرچہ میں منت پذیری کا اعتراف ذاتی طور پر کرچکا ہوں تاہم دل اعلان کے موقع کا

جو پایا تھا۔ مجھکو خوب یاد ہے کہ سب سے اول جس مقدمہ کو پڑھکر میں متاثر ہوا وہ عبد الحق صاحب کا نوشتہ تھا۔ یہ یقینی ہے۔ البتہ یہ ظنی ہے کہ وہ مقدمہ "ارتقاء الاسلام" پر لکھا گیا تھا شبہ ہے کہ کوئی اور مقدمہ ہو بہرحال مقدمہ کوئی سا ہو مقدمہ نگار مولوی عبد الحقؒ صاحب ہی تھے اس مقدمہ کے پڑھنے کے بعد مجھ کو بہت سے مقدمے لکھنے پڑے ہیں جن میں سے بعض کو لکھوانے میں خود مولوی صاحب کی فرمائش کا زور فرما رہا ہے جو اعتراف علی الاعلان کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اگر ان مقدمات میں کوئی خوبی پیدا ہو سکی ہے تو دل میں اُس کا نقش اول مقدمہ بالا کے پڑھنے سے قائم ہوا تھا دعوی تلمذ تو چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی پیروی کی سعی لنگ کا دعوی البتہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ بھی مدعی کمال بننے کے لئے نہیں ادائی شکر و سپاس کے لئے۔

مقدمہ کیا ہے۔ اس دور عجیب میں جہاں مؤلفین اور مصنفین کی کثرت ہے وہاں مقدمہ نگار بھی روز افزوں ہیں لیکن سچ یہ ہے کہ کمتر مقدمے پڑھنے کے قابل ہوتے ہیں یا یوں سمجھیے کہ بہت مقدمے مقدمے ہوتے ہیں شاید اسکی وجہ یہ ہو کہ تقریظ اور مقدمے میں امتیاز نہیں کیا جاتا کہ اصل میں تو مقدمہ لیا گیا ہے مقدمۃ الجیش سے جب ہم صاحب جیش تھے تو مقدمۃ الجیش کو خوب سمجھتے تھے کہ کیا ہے اب نہ جیش نہ مقدمۃ الجیش۔ روزمرہ کے مشاہدے سے مدد لیجئے۔ آپ جب کاروبار کے کسی ممتاز مرکز پر گذریں گے تو دیکھیں گے کہ دوکانوں کے سامنے کا ایک حصہ سلیقے اور دلفریب طریقے سے آراستہ

سب سے اوّل دیدہ نواز ہوگا۔ یہ اپنی دلفریبی سے نگاہ کو اپنی جانب متوجہ کریگا اور متوجہ ہونے پر جب نگاہ تفصیل کی جویا ہوگی تو وہ بتائیگا کہ آپ کو جو جنس دکان میں ملیگی وہ کیا ہے بعینہٖ یہی حال ایک کتاب کے مقدمہ کا ہے کہ وہ آپکو دلکش طریقے سے بتاتا ہے کہ کتاب میں کیا ہے۔

بیش طاق کے واسطے دو شرطیں تھیں سلیقہ اور تفصیل بعینہٖ یہی دو شرطیں ایک مقدمہ کے واسطے ہیں لکھنے میں اس کا سلیقہ ہو کہ دلکش ہو یہ میں کیا لکھا جائے اور کیا نہ لکھا جائے کتاب کا کونسا حصّہ نمایاں کیا جائے اور کونسا مخفی رہے تفصیل ایسی ہو کہ کتاب پڑھنے کے بعد مایوسی نہ ہو بلکہ یہ اعتراف ہو کہ مقدمہ نگار راست نگار تھا اگر مقدمہ نگار مطالب کتاب میں ترقی پیدا کر سکے اور پڑھنے والوں کے لئے مناسب موقع مزید معلومات بہم پہنچا دے اس طرح کہ یہ نہ معلوم ہو کہ وہ کتاب پڑھ رہا ہے تو اُس کو کمال مقدمہ نگاری ماننا چاہیے مولوی عبدالحق صاحب کے مقدمات اس معیار پر کامل اُترتے ہیں مولوی صاحب اپنے موضوع پر قلم اُس وقت اٹھاتے ہیں جب کہ اس پر پورا عبور حاصل کر لیتے ہیں نہ صرف کتاب پر بلکہ مصنف پر اور موضوع کتاب پر اس لئے ان کے مقدمات میں یہ سہ گانہ پہلو روز روشن کی طرح عیاں نظر آتے ہیں جس کتاب پر مقدمہ لکھا ہے اُس کے موضوع پر اس کے مطالب پر ایسی محققانہ بحث کی ہے کہ بعض اوقات مقدمہ کتاب سے بہتر فیصلہ موضوع کر گیا ہے۔ ہاں یہ خیال رہے کہ تقریظ نہیں لکھتے مقدمہ لکھنے میں ما لہ و ما علیہ دونوں سے بحث کرتے ہیں خوبی بھی دکھاتے ہیں عیب بھی جتاتے ہیں اسی کے ساتھ آپ کے لئے رائے قائم کرنیکا موقع بھی چھوڑتے ہیں نیاز، وجہ ہے

جو یا تھا۔ مجھکو خوب یاد ہے کہ سب سے اول جس مقدمہ کو پڑھکر میں متاثر ہوا وہ عبدالحق صاحب کا نوشتہ تھا۔ یہ یقینی ہے۔ البتہ یہ ظنی ہے کہ وہ مقدمہ "ارتقاء الاسلام" پر لکھا گیا تھا شبہ ہے کہ کوئی اور مقدمہ ہو بہرحال مقدمہ کوئی سا ہو مقدمہ نگار مولوی عبدالحقؒ صاحب ہی تھے اس مقدمہ کے پڑھنے کے بعد مجھ کو بہت سے مقدمے لکھنے پڑے ہیں جن میں سے بعض کو لکھوانے میں خود مولوی صاحب کی فرمائش کارفرما رہا ہے جو اعتراف علی الاعلان کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اگر ان مقدمات میں کوئی خوبی پیدا ہو سکی ہے تو دل میں اس کا نقش اول مقدمہ بالا کے پڑھنے سے قائم ہوا تھا دعوی تلمذ تو چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی پیروی کی سعی لنگ کا دعوی البتہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ بھی مدعی کمال بننے کے لئے نہیں ادائی شکر و سپاس کے لئے۔

مقدمہ کیا ہے — اس دورِ عجیب میں جہاں مؤلفین اور مصنفین کی کثرت ہے وہاں مقدمہ نگار بھی روز افزوں ہیں۔ لیکن سچ یہ ہے کہ کمتر مقدمے پڑھنے کے قابل ہوتے ہیں یا یوں سمجھئے کہ بہت مقدمے متقدمے ہوتے ہیں شاید اسکی وجہ یہ ہو کہ تقریظ اور مقدمے میں امتیاز نہیں کیا جاتا کہ اصل میں تو مقدمہ لیا گیا ہے مقدمۃ الجیش سے جب ہم صاحب جیش تھے تو مقدمۃ الجیش کو خوب سمجھتے تھے کہ کیا ہے اب نہ جیش نہ مقدمۃ الجیش۔ روزمرہ کے مشاہدے سے مدد لیجئے، آپ جب کاروبار کے کسی ممتاز مرکز پر گذریں گے تو دیکھیں گے کہ دوکانوں کے سامنے کا ایک حصہ سلیقے اور دلفریب طریقے سے آراستہ

سب سے اوّل دیدہ نواز ہوگا۔ یہ اپنی دلفریبی سے نگاہ کو اپنی جانب متوجہ کریگا اور متوجہ ہونے پر جب نگاہ تفصیل کی جویا ہوگی تو وہ بتائیگا کہ آپ کو جو جنس دکان میں ملیگی وہ کیا ہے بعینہ یہی حال ایک کتاب کے مقدمہ کا ہے کہ وہ آپکو دلکش طریقے سے بتاتا ہے کہ کتاب میں کیا ہے۔

پیش طاق کے واسطے دو شرطیں تھیں سلیقہ اور تفصیل بعینہ یہی دو شرطیں ایک مقدمہ کے واسطے ہیں لکھنے میں اس کا سلیقہ ہو کہ دلکش ہو۔ یہ میں کیا لکھا جائے اور کیا نہ لکھا جائے کتاب کا کونسا حصہ نمایاں کیا جائے اور کونسا مخفی رہے تفصیل ایسی ہو کہ کتاب پڑھنے کے بعد مایوسی نہ ہو بلکہ یہ اعتراف ہو کہ مقدمہ نگار درست نگار تھا اگر مقدمہ نگار مطالب کتاب میں ترقی پیدا کرسکے اور پڑھنے والوں کے لئے مناسب موقع مزید معلومات بہم پہنچائے اس طرح کہ یہ نہ معلوم ہو کہ وہ کتاب پڑھ رہا ہے تو اس کو کمال مقدمہ نگاری ماننا چاہیے مولوی عبدالحق صاحب کے مقدمات اس معیار پر کامل اترتے ہیں۔ مولوی صاحب اپنے موضوع پر قلم اس وقت اٹھاتے ہیں جب کہ اس پر پورا عبور حاصل کر لیتے ہیں نہ صرف کتاب پر بلکہ مصنف پر اور موضوع کتاب پر اس لئے ان کے مقدمات میں یہ سہ گانہ پہلو روز روشن کی طرح عیاں نظر آتے ہیں جس کتاب پر مقدمہ لکھا ہے اس کے موضوع پر اس کے مطالب پر ایسی محققانہ بحث کی ہے کہ بعض اوقات مقدمہ کتاب سے بہتر فیصلہ موضوع کر گیا ہے۔ ہاں یہ خیال ہے کہ تقریظ نہیں لکھتے مقدمہ لکھنے میں مالہ و ما علیہ دونوں سے بحث کرتے ہیں خوبی بھی دکھاتے ہیں عیب بھی جتلاتے ہیں اسی کے ساتھ آپ کے لئے رائے قائم کرنیکا موقع بھی چھوڑتے ہیں بیان وہ ہے

جس میں صفائی ہے، محاورہ ہے، ادب ہے، زور ہے، ہاں کہیں ادب
نہیں بھی ہے اور زور تو ایسا ہے کہ معلوم ہوتا ہے مقدمہ لکھتے نہیں لڑاتے
ہیں ان تمام اوصاف کی وجہ سے بیان دلاویز بھی ہے اور غور آفریں بھی۔

تفصیل مقدمات | مقدمات کا حصّہ اوّل جو ہمارے سامنے ہے اس میں ۱۴
مقدمے ہیں تین حصّوں پر ۱۴ مقدمے تقسیم کئے گئے ہیں۔ اسلامیات، سائنس
فلسفہ۔ تاریخ و تذکرہ اسلامیات میں اعظم الکلام تحقیق الجہاد۔ معراج العاشقین
پر مقدمے ہیں دونوں اول الذکر نواب اعظم یار جنگ بہادر مولوی چراغ علی
مرحوم کی مصنفہ ہیں۔ تیسری حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز قدس سرہٗ کی

مولوی چراغ علی مرحوم سرسیّد مرحوم کے پیروؤں میں باعتبار اپنے خاص
اوصاف کے درخشندہ گوہر تھے۔ حیدرآباد کی حاضری کے زمانے میں یہ مسلسل کوشش
میں نے کی کہ انکی حیات اُنکی شان کے مطابق لکھی جائے۔ کامیابی نہ ہوئی اگرچہ
مرحوم کے بعض اعزہ نے وعدہ اور ارادہ بھی کیا مولوی صاحب مرحوم
کے مذہبی خیالات وہی ہیں جو سرسید مرحوم کے تھے۔ سرسیّد مرحوم کا دل جب
مسلمانوں کی پسماندگی بلکہ درماندگی دیکھ کر دکھا تو انہوں نے کمر ہمت اصلاح
پر مضبوط باندھی اور خدا کا نام لیکر کام کرنے کو کھڑے ہوگئے۔ علی گڈھ کے لئے یہ فخر
ہے اور رہیگا کہ سرسید کی محنتوں اور جانفشانیوں کی رزم گاہ بھی ہے۔ قدرتاً
علی گڈھ والوں کو سرسیّد کے دیکھنے اور اُن کے ساتھ کام کرنے کا موقع سب سے
زیادہ ملا۔ میرے بزرگوں نے اُن کے ساتھ کام کئے ہیں میں نے بھی اپنی بساط کے
مطابق بزرگوں کی نقل کی۔ یہ ہماری خاندانی روایت ہے کہ سرسیّد کی صداقت

اور نیک نیتی میں شبہ نہیں۔ اسی کے ساتھ یہ رائے بھی تھی کہ سرسیّد کا مذہبی خیال صحیح نقطے سے ہٹا ہوا تھا (اور یہ رائے ایسی کھلی ہوئی تھی کہ سرسیّد بھی اس سے خوب واقف تھے۔ اور باوجود مخالفت کے وقعت کرتے تھے) تفصیل کی ضرورت ہے نہ موقع۔ مختصراً وہ رائے نتیجہ تھی یورپ اور سائنس سے مرعوبیت کا یعنی خیال یہ تھا کہ یورپ میں کمال ہی کمال تھا سائنس کی صداقت شبہ سے بالا تر اور راہ تھی مسلمانوں کو الحاد سے روکنے کے لئے انہوں نے تطبیق کی کوشش کی۔ چونکہ سائنس پر حاوی نہ تھے۔ اس کو مذہب تک نہ لا سکے مذہب کو سائنس ہی کی سطح پر لانے کی کوشش فرمائی یہیں غلطی کی۔ اگر آج سرسیّد زندہ ہوتے اور آج تفسیر لکھتے تو یقیناً یورپ اور سائنس سے اتنے مرعوب نہ ہوتے جتنے انیسویں صدی کے وسط میں ہوئے۔ حال ہی میں جو عظیم الشان کانفرنس سائنس کے علما کی لندن میں ہوئی اس کے پریسیڈنٹ کا ایڈریس بتاتا ہے کہ بیسویں صدی کی سائنس انیسویں صدی کی سائنس سے بہت مختلف ہے اس کے اندر اتنا انقلاب ہو گیا ہے کہ رفتہ رفتہ ان باتوں کا اقرار کرنے لگی جنکو گذشتہ صدی میں محالات میں سے کہہ چکی تھی۔ مادہ اپنی ساری ہیئت کے ساتھ فنا ہو چکا ہے زمان و مکان کا نظریہ پچھلے نظریوں کو تہ و بالا کر رہا ہے مادہ سے ماورا اس دنیا کے سوا کچھ اور نظر آ جانے کے آثار ہیں۔ آمدم بر سر مطلب۔ سرسیّد کے رفقاء نے بھی مذہب کی خدمت کا وہی پہلو اختیار کیا جو سرسید نے ان کے سامنے پیش کیا تھا۔ ایک سے زیادہ مقدمے بتاتے ہیں کہ مقدمہ نگار بھی انہی خیالات کے قدرداں ہیں۔ اس لئے ان دونوں مقدموں میں دل کھول کر اعظم یار جنگ بہادر

کے خیالات کی پرزور تائید کی ہے اور مخالفین کی پوری قوت سے دارو گیر۔ یہ ضروری ہے کہ یہ خیالات ایک طبقے کو گراں گزریں گے اور شاید وہ دار و گیر کو قابل معافی نہ سمجھیں۔ اور بد دینی کا ملزم قرار دینے پر آمادہ ہو جائیں مگر انکو فیصلہ کرنے سے پہلے یہ امر بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ سرسید کے مخالفین نے بھی جو کچھ لکھا یا کہا وہ بھی سب کا سب تہذیب اسلام کے دائرے اندر یا حکمت و موعظت حسنہ کا مصداق نہ تھا اگر اُس طرف سے یہ روش اختیار نہ ہوئی ہوتی تو اُن کے مخالف بھی قلم کی باگ ڈھیلی نہ کرتے انصاف یہ ہے کہ اب بھی پلّہ اودھر ہی جھکا رہیگا۔

اس موقع پر یہ لکھنا حق پوشی ہوگا کہ زیادہ محتاط علما نے اُس وقت بھی سرسید کی تکفیر سے ہمیشہ اپنا دامن بچایا میرے ذاتی علم میں حضرت مولانا فضل رحمن۔ مولانا محمد لطف اللہ صاحب مولانا سیّد محمد علی صاحب اسی طبقہ علما میں شامل تھے مولانا رحمت اللہ صاحب مرحوم نے مکہ مکرمہ میں اپنے مدرسہ صولتیہ کے علما کو یہ حکم دے رکھا تھا کہ کبھی کسی تکفیر پر یا اخلاقی مسئلہ پر فتویٰ نہ دیا جائے۔

اعظم الکلام کا مقدمہ مجھکو یوں بھی دلچسپ معلوم ہوتا ہے اُس میں مولوی چراغ علی مرحوم کے حالات اور علمی اوصاف پر بہت کچھ روشنی ڈالی گئی ہے وہ علمی اوصاف ایسے ہیں کہ قدیم و جدید دونوں طبقوں کے اہل علم اُن سے سبق حاصل کر سکتے ہیں۔ جن اصحاب کو مولوی عبد الحق صاحب کے خیالات بالا سے غصّہ آئے وہ اُن کے ملحد بنانے میں جلدی نہ کریں اور میرے اوپر کرم فرما کر

معرکہ مذہب و سائنس کا مقدمہ غور سے حرف بحرف پڑھ لیں۔ اُس سے واضح ہوجائیگا
کہ مولوی صاحب کے دل میں مذہب کا کتنا گہرا عقیدہ اور ادب ہے اس کا اخیر
حصہ پڑھکر میری آنکھیں تو پرنم ہوگئیں مقدمہ مذکور اس قابل ہے کہ وہ خوشنما تقطیع پر
بہت عمدہ طبع کراکے خصوصاً طلبہ میں بکثرت تقسیم کیا جائے میرا مضبوط خیال ہے کہ بہت سے
بڑے بڑے رسالوں سے زیادہ یہ مقدمہ مذہب کی تائید بمقابلہ سائنس کے کرنے
میں کامیاب تر ثابت ہوگا میرے خیال میں یہ مقدمات تمام مقدمات میں زیادہ بلند پایہ
ہے۔ تمدن ہند کا مقدمہ بھی بہت مفید اور علم آموز ہے مجھکو بڑی دلچسپی اُس حصہ
سے ہوئی جسمیں سید علی مرحوم کے حالات ہیں یہ حالات نمونہ ہیں کہ کسی ممتاز آدمی کے
اوصاف پر مخالف موافق رائے کس طرح ظاہر کیجائے۔ نادر بات یہ ہے کہ مترجم
تمدن ہند کے ایسے ضروری حالات یکجا کردئے ہیں کہ ان سے بہتر دوسری جگہ شاید
ہی ملیں اس پر جتنا افسوس ہو کم ہے کہ ہم اس طبقے کو ابھی سے فراموش کر چلے جو سرسید
سے شروع ہوکر وقار الملک پر ختم ہوا تھا حالانکہ انکی حیات میں ایسے جوانمردانہ
کارنامے ہیں جو ہمت آفرینی میں اکسیر کا کام دے سکتے ہیں کیسا ہی عبرتناک یہ بیان
ہو مگر واقعہ ہے کہ آج مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں سب سے زیادہ کم ہمتی سرسید احمد خاں
مرحوم کی ہے نام جاننے والے یا لینے والے بہت نکلیں گے مگر ان کے حالات جاننے
والا ان کے کارناموں سے متاثر ہوکر پیروی کا شوق رکھنے والا مجھکو تو کوئی
نظر نہیں آتا کیا یہ علامت کسی قوم کی زندگی کی ہے پس مولوی عبدالحق صاحب
کی وہ سعی جو انہوں نے اس طبقے کے کارنامے یاد دلانے کے کی ہے ہمارے
شکر کی مستحق ہے نیز اُس جامع کی جسکی کوشش سے یہ مقدمات یکجا طبع ہوکر ملک وملت کے

سامنے آ رہے ہیں۔ کاش ایک بات میری مولوی عبدالحق صاحب سن لیتے اگرچہ ابتک نہیں سنی ہے۔ عبداللہ خاں مرحوم جن کا ذکر بار بار متعدد مقدموں میں آیا ہے ضرور اس کے مستحق تھے کہ ان کے حالات پبلک کے سامنے لائے جاتے کوئی شبہ نہیں کہ یہ حالات ایک ایسا نقشہ دکھاتے جس کو دیکھکر دنیا دنگ رہجاتی کم سے کم یہ ہو کہ رسالہ اردو میں ایک لمبا مضمون چھپ جائے یہ بھی کہدوں کہ اگر مولوی صاحب نے یہ حالات نہ لکھے تو پھر دوسرا لکھنے والا نظر نہیں آتا۔

حیات النذیر کے مقدمہ کے متعلق ایک واقعہ کا اظہار ضروری ہے۔ مولوی نذیر احمد خاں صاحب مرحوم کے رسالہ امہات الامۃ جلائے جانے کے واقعہ کو مولوی صاحب نے بڑی دلسوزی سے بیان کیا ہے ایسا کہ دلسوزی نے اس میں کیا بلکہ چٹپٹاپن پیدا کردیا ہے واجب الاظہار واقعہ یہ ہے کہ ندوۃ العلماء کے ارکان و ممبر کا اس کے جلانے پر آخر تک آمادہ نہ تھے خود مولوی صاحب مرحوم کی تحریک تھی اس طرف کے تامل نے تحریک کو اصرار سے بدلدیا اصرار نے شدت اختیار کی بلکہ دھمکی کی صورت جیسی کہ مولوی صاحب مرحوم کی طرف سے ایسے موقع پر ہوا کرتی تھی مسیح الملک مرحوم نے (جو واسطہ تھے) بالآخر کہا کہ میں نے شیر کو کٹہرہ میں بند کردیا ہے آپ نکالتے ہیں۔ اس پر جلسہ کرکے غور کیا گیا اور مؤلف مرحوم کی رائے کی تائید ہوئی۔ چنانچہ رسالے جلائے گئے۔ مٹی کا تیل لاکر دو بجے رات کو جس نے رسالوں پر ڈالا تھا وہ میں ہی تھا اتفاق یہ کہ جلانے کے بعد آندھی نے خاکستر اڑادی بارش نے جگہ صاف کردی۔ اس طرح "بُو باس" سونگھنے کا موقع کسی کو نہ مل سکا۔

اب تخفیف تصدیرہ۔ مقدمات کی جانب توجہ کیجیے۔

حبیب گنج ضلع علیگڑھ ۱۹؍ اکتوبر سنہ ۱۹۳۳ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

کوئی چھ سات برس پہلے کی بات ہے کہ میں کسی کتاب پر مولوی عبدالحق صاحب کا مقدمہ پڑھ رہا تھا۔ اس سے قبل بھی میں نے دو تین مقدمات پڑھے تھے مولوی صاحب کے مقدمات خاص انداز کے ہوتے ہیں جن میں نہ صرف ادبیت ہوتی ہے بلکہ وہ ہر کتاب کے مضامین پر بھی گہری نظر ڈالتے ہیں اور اس طرح نقد و بحث فرماتے ہیں کہ ہر مقدمہ بجائے خود تنقیدات کا موضوع بن جاتا ہے میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر تمام مقدمات ایک جگہ جمع کر دئے جائیں تو ادب کا اور مفید ترین معلومات کا ذخیرہ ہو جانے کے علاوہ تنقیدی اصولوں پر غور کرنیوالوں کے لئے بھی بے حد معاون ہوگا چنانچہ میں نے مولوی صاحب کی خدمت میں جس زمانے میں کہ وہ اورنگ آباد میں تشریف رکھتے تھے ایک نیاز نامہ ارسال کرکے استدعا کی کہ وہ اپنے جملہ مقدمات کو ایک جگہ کرکے کتاب کی صورت میں شائع فرمادیں۔ انہوں نے

جواباً ارقام فرمایا کہ وہ خود اس کام کی جانب توجہ کرنیکی ضرورت محسوس نہیں کرتے اگر کوئی شخص ایسا کرنا چاہے تو انہیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔

کسی کو مقدمات کے اجتماع اور اشاعت پر آمادہ کرنے کی بجائے بوجہ اس کے کہ محرک میں ہی تھا میں نے خود ہی اس کام کو انجام دینے کا ارادہ کیا اور مولوی صاحب کی خدمت میں اپنے ارادہ کی اطلاع دیتے ہوئے استدعا کی کہ وہ ان تمام مقدمات کے مسودات ارسال فرمائیں جو مختلف کتابوں پر لکھے گئے ہیں

مولوی صاحب نے میرے خط کے جواب میں یہ مشورہ دیا کہ میں خود اس کام کو انجام دینے کی ذمہ داری نہ لوں اور نہ یہ ایسا کوئی ضروری کام ہے اور یہ کہ اُنکے پاس مقدمات کے مسودات موجود نہیں ہیں۔

لیکن میں نے پھر اصرار کیا اور یہ خواہش بھی کی کہ اقل درجہ ان کتب کی فہرست عنایت فرمائیں جن پر مقدمات لکھے گئے ہیں آخر کار مولوی صاحب نے صرف چند کتابوں کے نام تحریر فرمائے اور بقیہ کے متعلق تلاش و جستجو کی ہدایت فرمائی۔

میں نے اپنی تلاش اور احباب کی مدد سے مقدمات کی ایک فہرست بنائی مگر یہ ناکافی تھی مجھے معلوم ہوا کہ جناب ہاشمی صاحب، مولوی صاحب کے مقدمات سے زیادہ واقفیت رکھتے ہیں اس لئے میں ایک مرتبہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا جناب موصوف نے بڑی مہربانی کے ساتھ متعدد مقدمات کی یادداشتیں لکھوا دیں جن سے مجھے بڑی قیمتی مدد ملی۔

یکے بعد دیگران کتب کو فراہم کیا گیا جن پر مقدمات لکھے گئے ہیں اور انکی نقلیں بھی کرلی گئیں۔ کتابوں کو فراہم اور نقول کے تیار کرنے میں میرے کرمفرما مولوی

سید عبد الغفور صاحب عابدی نے زیادہ محنت اٹھائی جس کے لیے میں انکا مشکور ہوں نقول تیار ہو جانے کے بعد میں نے انکو مولوی صاحب کی خدمت میں اس غرض سے روانہ کیا کہ وہ ایک نظر ملاحظہ فرمالیں انہوں نے مسودات کو واپس کرتے ہوئے بعض مقدمات کو (جو اس وقت میرے حافظہ میں محفوظ نہیں ہیں) حذف کر دینے کا مشورہ دیا لیکن جو سرمایہ کہ جمع کیا گیا تھا اس میں کوئی کمی کرنیکے لئے جی نہ چاہا کیونکہ ہر مقدمہ پڑھنے، سمجھنے اور قدر کرنے کے قابل ہے چنانچہ میں نے مشورہ کے خلاف عمل کرنیکی جسارت کی ہے جسکو امید ہے کہ مولوی صاحب ازراہ عنایت معاف فرمائیں گے

مقدمات جمع ہوگئے اب طباعت کا مرحلہ پیش آیا حیدرآباد میں یہ کام کچھ آسان نہیں ہے اس میں مجھ سے مختلف وجوہ کی بنا پر ناقابل معافی تساہل بھی واقع ہوا بعد ازاں میں نے مہتمم صاحب انجمن مکتبہ ابراہیمیہ کو کتاب کی طباعت و اشاعت پر آمادہ کیا اور انہوں نے اپنی علم دوستی کے ثبوت میں اس کا ذمہ لے لیا مگر انہیں کاپی کے تیار کرانے میں بہت سی دشواریاں لاحق ہوئیں اور ایک طویل زمانہ نکل گیا

مقدمات پر ایک مقدمہ بھی ضروری تھا اور مولوی صاحب کے مقدمات پر مقدمہ لکھنے کے لئے کسی بڑی ہستی کی تلاش رہی - ایک مرتبہ مولانا مولوی حبیب الرحمن خانصاحب شروانی صدر یار جنگ بہادر سابق صدر الصدور سلطنت آصفیہ خلد اللہ ملکہ کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوکر التماس کی مولانا ممدوح ان دنوں حیدرآباد میں تشریف رکھتے تھے بڑی عنایت کے ساتھ میری ہمت افزائی فرمائی اور مقدمہ تحریر فرما دینے کا ارادہ ظاہر فرمایا لیکن تھوڑے عرصہ کے بعد مولانا ممدوح نے حج بیت اللہ کا قصد فرمایا مراجعت فرمائی کے بعد بعض اہم مصروفیتوں

نیز حیدرآباد سے جدا ہونے کے باعث مقدمہ نویسی کا کام انجام نہ پا سکا۔

مولانا کے وطن تشریف لے جانے کے کچھ عرصہ بعد میں نے عریضہ ارسال کر کے یاد دہانی کی اور مولانا نے بکمال شفقت بزرگانہ ایک بہترین مقدمہ تحریر فرما کر ارسال فرمایا مقدمہ کے ملاحظہ سے معلوم ہوجائیگا کہ مولوی عبدالحق صاحب کے مقدمات پر کس خوبی سے روشنی ڈالی گئی ہے اور کس عالمانہ شان سے نقد و بحث فرمائی گئی ہے ان دونوں بزرگوں کے علم و فضل کی جولانگاہ الگ الگ ہے مگر مقاصد دونوں کے ایک ہیں اور ایک دوسرے سے خوب واقف ہیں لہذا ناظرین لطف اندوز ہوں گے اور اپنی اپنی رائے قائم فرمائیں گے

ہر کتاب کے موضوع بحث کے اعتبار سے اس پر مقدمہ بھی مرتب ہوتا رہا ہے مثلاً اسلامیات، سائنس و فلسفہ، تاریخ و تذکرہ وغیرہ ان میں سے جس موضوع پر جتنے مقدمات ملے ان کو اسی عنوان کے تحت قائم کیا گیا ہے جسکی وجہ سے ہر ایک سلسلہ تنقیدات کا ایک مستقل باب بن گیا ہے اس سے ناظرین کتاب کو یہ بڑی سہولت حاصل ہوجائیگی کہ وہ ہر باب کے تحت اس کے تنقیدی اصولوں کو بآسانی ذہن نشین کرسکیں گے اس کا بڑا افسوس ہے کہ کتاب میں بہت سے غلط الفاظ چھپ گئے ہیں اس لئے ایک صحت نامہ بھی شامل کرنا پڑا کتاب ظاہری حسن و خوبی کے اعتبار سے بھی چنداں خصوصیت نہیں رکھتی مالک مطبع سے اس کی شکایات ناروا ہی ہوگی مجھے اپنی کوتاہی کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ میں خود اہتمام یا انتظام عمل میں لا نہ سکا بہرحال میرے لئے یہی غنیمت ہے کہ کسی طرح مقدمات جمع ہو گئے اور وہ اب شائع ہو رہے ہیں یقین ہے کہ مہتمم صاحب انجمن مکتبہ ابراہیمیہ بمصداق

"نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اوّل"

بہت جلد اشاعت ثانیہ زیادہ صحت و پاکیزگی کے ساتھ عمل میں لا سکیں گے۔

مولوی عبدالحق صاحب اور ان کے مصنفہ مقدمات کے متعلق کچھ عرض کرنا میرے بس کی بات نہیں ہے اس فرض کی انجام دہی کے لئے تو کسی قابل شخص کی ضرورت ہے میرا حال تو یہ ہے کہ گذشتہ بارہ چودہ برس سے دفتری مشاغل میں پھنس گیا ہوں دفتری مذاق رچ گیا ہے خیالات کو جمع کرنا چاہتا ہوں مگر ہو نہیں سکتے اور حقیقت یہ ہے کہ مولوی صاحب کسی تعارف مزید کے محتاج بھی نہیں ہیں ان کے علمی کارناموں اور زبان اردو کی مہتم بالشان خدمات سے کوئی تعلیمیافتہ ایسا نہ ہوگا جو واقفیت نہ رکھتا ہو اور یہ حقیقت بھی کسی سے مخفی نہیں ہے کہ مولوی صاحب ان بزرگوں میں سے ایک ہیں جو صفِ اولیں میں شمار کئے جاتے ہیں انہوں نے زبان اردو پر وہ احسانات کئے ہیں جو کبھی بھلائے نہیں جا سکتے جب تک کہ زبان اردو زندہ رہے گی مولوی صاحب کا نام بھی زندہ رہیگا یہ وہ حیات جاوید ہے جو صرف علم کی سیوا کرنے والوں کو حاصل ہوتی ہے۔

دنیا میں بہت سے لوگ تعلیم سے بہرہ ور ہیں اور بہت سے علم و فضل بلند مرتبہ بھی ممتاز ہیں مگر بڑی فضیلت تو اس میں ہے کہ علم سے دوسروں کو منور فرمائیے کہ کیسی جائے عوام کی بصیرتوں کو بڑھایا جائے ورنہ ایسے علم جس پر تنقیدیں فرمائی ہیں اس کے حاملوں کے سینوں کو تو منور رکھتا ہو مگر ہزاروں شبلی مرحوم اور عطیہ بیگم نہ پڑتا ہو میرا حافظہ قصور نہ کرتا ہو تو میں کہہ سکتا ہوں کہ تقریباً زیں مقدمہ لکھا گیا ہے جبکہ مولوی عبدالحق صاحب کا تعلق مدرسہ آصفیہ سے تھا جتنے مقدمات لکھے گئے

کیسے پرلطف اور کتنے قیمتی معلومات کے حامل ہیں۔

غرض یہ کہ ہر ایک مقدمہ ایک خاص مرتبہ رکھتا ہے اور مصنف کے مرتبہ کو بھی منوالیتا ہے مجھ میں نہ استعداد ہے کہ زیادہ شرح وبسط کے ساتھ عرض کروں اور نہ اتنی فرصت ہے کہ ایسی کوشش کروں۔ جن چند سطور کو میں نے لکھا ہے سمجھتا ہونکہ وہ دیباچہ کی تقریب میں ناکافی ہیں اور اس سے زیادہ لکھنا چاہئیے تھا لیکن میری معذوری بھی قابل معافی ہے اور امید کرتا ہونکہ مقدمات کو پڑھکر استفادہ اور مصنف کی مزید قدر و منزلت کی جائیگی۔

کیمپ بورلم ۱۹ امہمن ۱۳۱۲ف محمد بیگ

اسلامیات

(۱) مقدمہ اعظم الکلام
(۲) مقدمہ تحقیق الجہاد
(۳) مقدمہ معراج العاشقین

مُقدّمہ

اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام

حصّہ اوّل

مشتمل بر حالات مصنف

نواب اعظم یار جنگ بہادر مولوی چراغ علی مرحوم ان لوگوں میں سے تھے جو اپنے بل بوتے پر آپ کھڑے ہوئے اور اپنی محنت سے دنیا میں جاہ و ثروت ولیاقت و فضیلت حاصل کی۔ اپنے سہارے آپ کھڑے ہونا خدا کی بڑی نعمت اور بڑے پن کی علامت ہے۔ جو دوسروں کا سہارا تکتا رہتا ہے وہ خود کبھی نہیں بڑھتا۔ اور جو بڑھتا ہے تو جتنا پاتا ہے اُس سے زیادہ کھوتا ہے۔ مولوی چراغ علی مرحوم نے ابتدا میں ایک معمولی منشی کی طرح دفتر میں ملازمت کی اور محض اپنی لیاقت اور محنت سے اعلیٰ رُتبے پر پہنچ گئے۔ اُن کی تعلیم بہت معمولی درجے کی ہوئی تھی۔ لیکن لگاتار مطالعہ اور محنت کی بدولت اُنھوں نے وہ فضیلت حاصل کی جو بڑے بڑے ڈگری یافتوں اور صاحبان دستار فضیلت کو میسّر نہیں ہوئی۔ ان کی زندگی ایک سبق ہے اُن

لوگوں کے لئے جو دنیا میں بڑھنا اور کچھ کرنا چاہتے ہیں اور اُن کے کارنامے نوجوانان ملک کے لئے دلیل راہ کا کام دینگے۔ ان کے آبا و اجداد در اصل سری نگر (کشمیر) کے رہنے والے تھے۔ ان کے دادا ایک مدت تک پنجاب میں ملازم رہے اور وہاں سے میرٹھ آئے اور پھر وہیں آباد ہوگئے۔ مولوی چراغ علی کے والد مولوی محمد بخش میرٹھ میں ملازم ہوئے۔ بعد ازاں ان کا تبادلہ سہارنپور ہوگیا جہاں وہ کلکٹر کے دفتر کے ہیڈ کلارک تھے۔ سہارنپور میں یہ محمد بخش کرانی کے نام سے مشہور تھے۔ کرانی کا لفظ اس زمانے میں انگریزی کلارکوں کے لئے بجائے بابو کے استعمال ہوتا تھا چنانچہ کرانی خانہ منشی خانہ کو کہتے تھے جہاں کلارک کام کرتے تھے۔ چونکہ مولوی محمد بخش انگریزی دان تھے اور کسی قدر انگریزی لباس بھی پہنتے تھے لہٰذا لوگ انہیں کرانی کہنے لگے۔

لہ مولوی چراغ علی مرحوم کے ابتدائی حالات ہمیں زیادہ تر مولوی محمد زکریا صاحب سہارنپوری (حال وظیفہ یاب حسن خدمت سرکار نظام) سے معلوم ہوئے ہیں جو مرحوم کے پُرانے دوست اور رفیق ہیں اور مرحوم اور اُن کے خاندان کو اس وقت سے جانتے ہیں جب کہ مرحوم کے والد سہارنپور میں ملازم تھے۔ مرحوم مولوی صاحب موصوف کا بہت اعزاز و احترام کرتے تھے اور مولوی صاحب کے تعلقات اب تک مرحوم کے خاندان سے ویسے ہی چلے جاتے ہیں اور زمانہ حیدرآباد کے اکثر حالات ہمیں مولوی صاحب موصوف کے بھتیجے مولوی انوارالحق صاحب سے معلوم ہوئے ہیں جو مرحوم کے پاس بچپن سے تھے اور مرحوم ان پر بہت عنایت فرماتے تھے۔ نیز دیگر حضرات سے جو جو حالات معلوم ہوئے ہیں وہ اُن کے نام کے ساتھ بعد تحقیق کے لکھ دئے گئے ہیں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی بہادر کے معزز ترین عہدہ گورنری جنرلی پر لارڈ ڈلہوزی نئے نئے تشریف لائے تھے ۔ یہ صاحب تھے تو کم عمر مگر بلا کے ذہین جفاکش مستقل مزاج اور اپنے ارادے کے پکے تھے ۔ انھوں نے ملک کی آبادی اور آسایش خلائق عامہ کے لئے بہت سے نیک کام کئے ۔ لیکن افسوس ہے کہ ایک کام اُن کے ہاتھ سے ایسا ہوا کہ ان کی ساری نیکیوں پر پانی پھر جاتا ہے ۔ ابتدا سے یہ بات اُن کے ذہن نشین ہوگئی تھی کہ جہانتک ہوسکے اور جس طرح بن سکے دیسی ریاستوں کو نیست و نابود کر دیا جائے اور ان کے ملک کمپنی کے علاقہ میں ضم کر دئے جائیں ۔ وہ اپنے بہاویں رعایا کے حق میں اسے عین انصاف اور نیکی سمجھتے تھے ۔ وہ اس خیال پر اخیر تک جمے رہے اور بڑے تشدد اور استقلال سے اسے عمل میں لائے ۔ لیکن اس سے جو بُرے نتائج پیدا ہوئے وہ ظاہر ہیں اور اُس کا بُرا اثر اب تک رعایا کے دل سے پُورے طور پر زائل نہیں ہوا ۔ لارڈ ڈلہوزی سے قبل کمپنی بہادر کے گورنر جنرل لارڈ ہارڈنگ تھے ۔ وہ جیسے لڑائی میں سخت تھے ویسے ہی فتح کے بعد معتدل مزاج بھی تھے ۔ سکھوں سے پہلی لڑائی فتح کرلنے کے بعد بیرونی اضلاع کو الگ کر کے پنجاب اُنہیں لوگوں کے ہاتھ میں چھوڑ دیا گیا کہ وہ اپنا انتظام خود کرلیں ۔ لیکن رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد سکھ سرداروں میں پھوٹ پڑگئی تھی ۔ فوج الگ اپنے زور میں آپے سے باہر ہوئی جاتی تھی ۔ رانی میں اتنی قوت اور دور اندیشی نہ تھی کہ وہ ان سب کو سنبھالے بلکہ اس نے کج رائے اور ناعاقبت اندیش لوگوں کے ہاتھ میں پڑکر ملک کی حالت اَور بگاڑ دی ۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سکھ ایک ایسی اچھی اور سرسبز سلطنت کو ہاتھ سے کھو بیٹھے ۔ پہلی جنگ کے بعد لارڈ ہارڈنگ نے اندرونی انتظامات میں دخل دینے سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی

اور مہاراجہ کے دربار کو پورا اختیار تھا کہ وہ اپنی مرضی اور دستور و آئین کے مطابق اپنا انتظام کریں۔ لیکن جب روز بہ روز خرابیاں بڑھتی گئیں تو بمجبوری ایک کونسل مقرر کی گئی کہ اُس کے صلاح و مشورہ سے انتظام ریاست چلایا جائے اور کونسل کا میر مجلس انگریز ہو۔ پنجاب کی بڑی خوش نصیبی تھی کہ ہنری لارنس جیسا پاک نفس نیک دل اور ہوشمند پریزیڈنٹ ملا۔ وہ لوگوں کے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کرتے تھے اور اس خوبی اور نیک نیتی سے کام چلایا کہ رعایا ان کی عاشق ہوگئی۔ اتنے میں لارڈ ہارڈنگ ولایت کو سدھارے اور اُن کی جگہ لارڈ ڈلہوزی آئے۔ اور لارڈ ہارڈنگ کے جاتے ہی سر ہنری لارنس رخصت پر ولایت تشریف لے گئے۔ سر ہنری لارنس کے جانے کے بعد ناتجربہ کار انگریزی افسروں نے رعایا کی دلداری کا مطلق خیال نہ کیا اور انتظام کے جوش میں ایسی ایسی غلطیاں کیں کہ لوگوں میں انگریزوں کی طرف سے بددلی اور نفرت پیدا ہوگئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزوں اور سکھوں میں بڑی خونریز اور خونخوار جنگ ہوئی جس سے ہندوستان اور انگلستان میں تہلکہ مچ گیا اور ایک دفعہ انگریزی حکومت جڑ بنیاد سے ہل گئی۔ آخر انگریزوں کی فتح ہوئی اور مہاراجہ رنجیت سنگھ نے جو ہندوستان کے نقشے میں انگریزی کمپنی کی عملداری کا سُرخ رنگ دیکھ کر یہ پیشگوئی کی تھی کہ نقشہ کا سارا رنگ سُرخ ہوتا نظر آتا ہے وہ اس کے مرنے کے بعد پوری ہو کے رہی اور اب پنجاب پر انگریزوں کا پورا تسلط ہوگیا۔ اس جدید صوبے کے انتظام کے لیئے ہندوستان سے جہاں اور تجربہ کار اور لایق عہدہ داران منتخب کیئے گئے وہاں مولوی محمد بخش کا بھی انتخاب ہوا۔

۱۸۴۹ء میں مولوی محمد بخش محکمۂ بندوبست میں داخل ہوئے اور رفتہ رفتہ عہدہ مہتممی بندوبست پر سرفراز ہوئے۔ اور کچھ عرصہ تک صوبہ پنجاب کے

اضلاع ملتان - ڈیرہ غازی خاں بنوں وغیرہ میں مامور رہے - سرحدی اضلاع کے بندوبست سے فارغ ہونے کے بعد ضلع سیالکوٹ میں متعین کئے گئے - اس کے بعد ضلع شاہ پور میں اسی اہم کام پر مامور رہے یہاں اس امر کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مہتممی بندوبست جیسا وقیع اور اعلیٰ عہدہ جب کہ آج کل بھی دیسی لوگوں کو شاذ و نادر ہی ملتا ہے تو اس زمانے میں جبکہ نہ ہندیوں کے حقوق تسلیم کئے گئے تھے اور نہ اُن حقوق پر زور دینے والے ابھی میدان میں آئے تھے کیسا کچھ وقیع اور معززانہ سمجھا جاتا ہوگا -

افسوس ہے کہ ہمیں اس سے زیادہ مولوی محمد بخش کے حالات اور اُس وقت کے واقعات معلوم نہ ہو سکے - لیکن صرف ایک یہی واقعہ مولوی صاحب کی قابلیت اور لیاقت کی کافی شہادت ہے کہ حکومت وقت نے انہیں ایک ایسے عہدے پر جو کسی طرح ڈپٹی کمشنر یا کلکٹر کے عہدے سے کم نہیں سرفراز فرمایا -

سُنا گیا ہے کہ مولوی محمد بخش کو اپنی اولاد کی تعلیم کے متعلق بڑے بڑے خیال تھے - لیکن اجل نے مہلت نہ دی اور عین عالم جوانی میں (جبکہ اُن کی عمر غالباً پینتیس ۳۵ سال سے زائد نہ تھی) سن ستاون کی مشہور فوجی شورش سے ایک سال قبل یعنے ۱۸۵۶ء میں انتقال فرمایا اور سارے منصوبے دل کے دل ہی میں رہ گئے - مرحوم نے چار بیٹے چھوڑے جن میں سب سے بڑے مولوی چراغ علی تھے اور اُس وقت ان کی عمر بارہ سال سے زیادہ نہ تھی - مولوی محمد بخش مرحوم کا مقبرہ اب تک میرٹھ میں موجود ہے -

مولوی محمد بخش کے انتقال کے بعد ان کے سب اہل و عیال یعنے اُن کی والدہ بیوی اور چاروں بچے (چراغ علی - ولایت علی - عنایت علی اور منصب علی) میرٹھ واپس آ گئے -

مولوی چراغ علی نے اپنی دادی اور والدہ کے زیر سایہ میرٹھ میں تعلیم پائی۔ لیکن یہ تعلیم بالکل معمولی تھی۔ اور سوائے معمولی اردو۔ فارسی اور انگریزی کے نہ کسی اور علم کی تحصیل کی اور نہ کوئی امتحان پاس کرنے پائے۔ اسی زمانہ میں کمشنری گورکھ پور میں ضلع بستی نیا نیا قائم ہوا تھا وہاں کے خزانے کی منشی گری پرجس کی تنخواہ بیس۲۰ روپیہ تھی مرحوم کا تقرر ہوا۔ مطالعہ کتب اور لکھنے پڑھنے کا شوق انہیں ابتدا سے تھا۔ سرکاری کام کے بعد باقی تمام وقت وہ لکھنے پڑھنے میں صرف کرتے تھے۔ چنانچہ پادری عماد الدین کی کتاب تاریخ محمدی کے جواب میں آپ کا رسالہ تعلیقات اسی زمانہ کا لکھا ہوا ہے۔ علاوہ اس کے منشور محمدی۔ مخبر صادق لکھنو وغیرہ میں بھی ان کے اکثر مضامین شائع ہوئے۔ اسی زمانے میں مولوی محمد زکریا صاحب سہارن پور سے بستی میں محکمہ انجینیری میں مقرر ہوکر آئے اور چونکہ مولوی صاحب کے تعلقات ان سے اور ان کے خاندان سے قدیم تھے لہذا دونو صاحب ایک ہی جگہ رہنے سہنے لگے۔ کچھ دنوں بعد مولوی محمد زکریا صاحب بستی کی خدمت سے مستعفی ہوکر لکھنو چلے گئے اور وہاں اُن کا ایک اچھی خدمت پر تقرر ہوگیا وہاں سے انہوں نے مولوی چراغ علی کو اطلاع دی کہ آپ کے والد کے محسن مسٹر گوراوسلی یہاں جوڈیشل کمشنر ہیں۔ اگر آپ یہاں آئیں اور ان سے ملیں تو غلب ہے کہ کوئی معقول خدمت مل جائے۔ چنانچہ اس اطلاع پر غالباً ۱۸۷۲ء یا ۱۸۷۳ء میں مولوی چراغ علی لکھنو گئے اور مسٹر گوراوسلی سے ملے۔ اتفاق سے اس وقت جوڈیشل کمشنری میں عارضی طور پر ڈپٹی منصرمی کی جگہ خالی تھی لہذا اس وقت اُن کا تقرر اسی خدمت پر بمشاہرہ ۱۵۰ ہوگیا۔ کچھ دنوں بطور قائم مقام رہے بعد میں مستقل ہوگئے تھوڑے عرصہ کے بعد سیتاپور

میں تبادلہ ہوگیا۔

مولوی چراغ علی کا میلان طبع شروع سے مذہب کی طرف تھا انہوں نے ہمیشہ یا تو عیسائی معترضین کے جواب لکھے یا مذہب اسلام کی حقانیت ظاہر کی۔ چونکہ اس عالم کا یہ قانون ہے کہ قوی تر شئے اپنے سے کم قوی کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے اس لئے مولوی چراغ علی بھی خودبخود امام وقت کی طرف جھکے۔ اور وحدت ذوق سرسید رح سے اُن کے تعارف کا باعث ہوئی۔ اگرچہ اب تک ملاقات کی نوبت نہیں آئی تھی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ خط و کتابت شروع ہوگئی تھی۔ اور تہذیب الاخلاق میں بھی اُن کے بعض مضامین شائع ہوئے تھے۔ چنانچہ جب سرسید رح لکھنو تشریف لائے تو مولوی صاحب مرحوم اُن سے ملنے کے لئے سیتاپور سے لکھنو گئے۔ کچھ عرصہ بعد جب ریاست حیدرآباد سے کچھ کام ترجمہ وغیرہ کا سرسید رح کے پاس آیا تو اُنہوں نے مولوی چراغ علی کو اُس کام کے سرانجام دینے کے لئے منتخب کیا۔ اس بنا پر ۱۸۷۶ء میں مولوی چراغ علی رخصت لیکر علی گڑھ گئے اور کئی مہینے سرسید رح کے پاس رہ کر اس کام کو بکمال خوبی انجام دیا۔ جس کا معاوضہ بھی ریاست سے اُن کو ملا۔ اس کے ایک سال بعد (۱۸۷۷ء) میں نواب سرسالار جنگ اعظم نے بتوسط مولوی مہدی علی (نواب محسن الملک) مرحوم سرسید رح سے ایک لائق شخص طلب کیا۔ سرسید رح نے مولوی چراغ علی کو منتخب کیا اور وہ حیدرآباد چلے آئے۔ جہاں وہ عہدہ اسسٹنٹ ریونیو سکرٹری (مددگار معتمد مالگزاری) پر بمشاہرہ چار سَو روپیہ مامور ہوئے۔ معتمد مالگزاری اس وقت نواب محسن الملک مولوی مہدی علی مرحوم تھے۔ اس وقت سے مولوی چراغ علی کی زندگی کا نیا دَور شروع ہوا۔

کسی ملک یا کسی قوم میں طبعی طور سے اعلیٰ قابلیت کا ہونا بالکل ممکن ہے لیکن اگر وہ تعصب یا کسی اور وجہ سے اپنے آپ کو بیرونی اثر سے الگ اور محفوظ رکھنا چاہیگی اور صرف اپنے اندرونی وسائل اور ذرائع سے بڑھنے کی کوشش کرے گی تو اُس کی ترقی شاہراہ تمدن پر بہت سست ہوگی۔ دنیا میں کسی قوم کی ایسی مثال نہیں ملتی کہ اس نے بیرونی وسائل سے فائدہ اُٹھائے بغیر دنیا میں اعلیٰ ترقی کی ہو۔ ابتدا ابتدا میں مسلمانوں کی فتوحات اپنی ذاتی قوت سے دنیا میں آناً فاناً میں پھیل گئی لیکن ان فتوحات کو قائم رکھنے یا وسیع کرنے کے لئے یہی کافی نہ تھا۔ پھر جب انھوں نے عجم میں قدم رکھا اور امن و جنگ۔ تجارت وسفارت کے ذریعہ سے انہیں روزانہ دوسری اقوام سے سابقہ پڑا تو اُس وقت سے ان کی ترقی کی بنیاد مستحکم ہونے لگی۔ آخر انہی لوگوں نے یونان کی علم وحکمت کو زندہ کیا اور تمدن میں ایسی ترقی کی کہ جس سے ایک عالم میں اُجالا ہوگیا۔ یہی حال یونان وروما اور یورپ و دیگر اقوام کی ترقی کا ہے۔ تازہ مثال جاپان کی ہے۔ وہی جاپان جو اپنے آپ کو غیر ملک والوں کی ہوا تک نہیں لگنے دیتا تھا اور غیر صورت کو دیکھ کر چونک اُٹھتا تھا آج انہیں سے اُن کے گر سیکھ کر اُن کا اُستاد بنا چاہتا ہے۔ اہل جاپان کی ترقی کا ایک راز یہ بھی ہے کہ جو کام وہ خود نہیں کر سکتے تھے وہ اُنھوں نے غیر ملک والوں سے ملازم رکھ کر لیا اور پھر خود سیکھ کر اُن کی معلمی سے مستغنی ہوگئے۔ چنانچہ ابتدا میں اُنھوں نے ریلوے۔ ٹیلیگراف۔ لائٹ ہوس اور بحری فوج کا انتظام انگریزوں کے سپرد کیا۔ قانونی اصلاح اور فوجی تربیت اہل فرانس کے ہاتھوں ہوئی۔ تعلیمی معاملات۔ ڈاکخانہ کے انتظام اور زراعت میں اہل امریکہ سے سبق لیا۔ طبی تعلیم۔ تجارتی قواعد۔ لوکل گورنمنٹ کا دستور اور فوجی افسروں

کی تعلیم جرمن والوں کے حوالہ کی اور سنگ تراشی (مصوری) میں اٹلی والوں کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا۔ غرض ابتدا میں ان سب سے کام لیا اور پھر خود سیکھ کر ان میں ایسا کمال پیدا کیا کہ آج دنیا کی اعلیٰ دول میں ان کا شمار ہے۔ یہ زمانہ تجربات کا زمانہ ہے اور جاپان نے جو تمدن کی مختلف اور بے شمار شاخوں میں اس قدر جلد اور قابل تعریف ترقی کی ہے اسے اگر انیسویں صدی کا اعجاز کہا جائے تو کچھ بیجا نہیں ہے۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ سرسالار جنگ اول کی تدبیر اور چارہ سازی اور جاپان کی بیداری کا بالکل ایک زمانہ تھا۔ جاپان نے اپنے ملک کو ہشیار کرنے اور اپنے تمدن کی اصلاح و ترقی کے لئے جو تدبیر اختیار کی تھی بعینہ وہی تدبیر اس دوربین اور عالی دماغ وزیر نے اس ملک میں اختیار کی اور باہر سے قابل ۔ تجربہ کار اور شایستہ لوگوں کو بلا کر کام لیا۔ ان لوگوں نے ملک کے انتظامات کو درست کیا۔ پرانی خرابیوں کی اصلاح کی، نئے نئے دفاتر قائم کئے اور اُن کو صحیح اصول پر چلایا۔ ملک کے ذرائع آمدنی پر غور کیا۔ اور آمدنی کو بڑھایا۔ تعلیم کو رونق دی، تہذیب و شایستگی پھیلائی، اور ملک اور گورنمنٹ کو خاصا مہذب اور شایستہ بنا دیا۔ لیکن کیا وجہ ہے کہ جاپان اس عرصہ میں کہیں سے کہیں پہنچ گیا اور یہ ملک وہیں کا وہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بیرونی امداد بڑی کارآمد اور مفید چیز ہے بشرطیکہ دلوں میں شوق اور جوش اور ہمت ہو لیکن اگر کوئی یہ چاہے کہ ہم کچھ نہ کریں اور ہمارے لئے سب کچھ ہوتا چلا جائے تو یہ محض خیال بلکہ جنون ہے۔ اہل جاپان میں حب وطنی کوٹ کوٹ کے بھری تھی اور ہر جاپانی اس شد و مد اور جوش سے کام کرتا تھا کہ گویا ساری سلطنت کا بار اسی کے سر پر پڑنے والا ہے، اور ہر شخص کی دلی آرزو یہ تھی اور اسی خیال سے

محنت کرتا تھا کہ وہ سارے عالم میں جاپان کی دھاک بٹھا دے اور طرفۃ العین میں اُسے عروس الممالک بنا دے۔ برخلاف اس کے یہاں یہ باتیں ابھی خواب وخیال سے بھی کوسوں دور ہیں۔ دفاتر اور ہر قسم کے سررشتے جو ایک مہذب ملک میں ہونے چاہئیں یہاں بھی موجود ہیں۔ کونسلیں ہیں، کمیٹیاں ہیں، قابل سے قابل ڈگری یافتہ افسر بھی ہیں۔ کمیٹیاں ہوتی ہیں، تجویزیں پیش ہوتی ہیں، رزولیوشن پاس ہوتے ہیں، نئی نئی اسکیمیں جاری ہوتی ہیں، روپیہ وصول ہوتا ہے، ذرائع آمدنی بھی سوچے جاتے ہیں، رپورٹیں بھی لکھی جاتی ہیں، یہ سب کچھ ہوتا ہے لیکن حیات کا نام نہیں۔

سرسالار جنگ نے اس تدبیر کے ساتھ بڑی دانشمندی یہ کی تھی کہ ابتدا میں انہوں نے قابل لوگوں کو سرسید رح سے طلب کیا۔ یہ دو عالی دماغ شخص سرزمینِ ہندوستان میں ایسے پیدا ہوئے ہیں کہ اُنیسویں صدی کے مسلمان اُن پر جس قدر فخر کریں وہ بجا ہے۔ اور ایسے وقت میں ہوئے جبکہ موقع بہت نازک ہو چلا تھا۔ سرسید رح کے انتخاب اور سرسالار جنگ مرحوم کی قدردانی اور کار فرمائی نے سونے میں سہاگے کا کام کیا۔ اس طرح جو لوگ انتخاب کیئے گئے انہوں نے اپنے فرائض کمال وفاداری اور قابلیت سے ادا کیئے۔ اور وہ ہمیشہ عزت وحرمت کے ساتھ یاد کئے جائیں گے۔ اُنہیں میں سے ایک مولوی چراغ علی مرحوم بھی تھے۔

ابتدا میں مولوی چراغ علی کا تقرر مددگاری معتمدی مالگزاری پر بمشاہرہ چارسو روپیہ ماہانہ ہوا۔ مگر کچھ عرصے کے بعد سات سو روپیہ ہوگئے۔ بعد ازاں عہد وزارت نواب عماد السلطنۃ مرحوم میں جب نواب محسن الملک مرحوم معتمد پولٹیکل وفینانس مقرر ہوئے تو مولوی چراغ علی کا تقرر معتمدی مالگزاری پر

بمشاہرہ پندرہ سو روپیہ ہوا۔ عہد وزارت سر آسمان جاہ بہادر مرحوم میں جب کہ بہ مصالح وقت مولوی مشتاق حسین (نواب وقار الملک) معتمد مالگزاری مقرر ہوئے تو مولوی چراغ علی صوبہ داری ورنگل پر مامور ہوئے اور پھر صوبہ داری گلبرگہ پر تبادلہ ہو گیا۔ دو سال بعد نواب محسن الملک مرحوم کے چلے جانے پر معتمد مال و فینانس مقرر ہوئے۔

غالباً مولوی چراغ علی سے بڑھ کر کسی شخص نے سرکاری کام کو اس طرح بے لاگ، بے تعلق اور بے لوث رہ کر انجام نہ دیا ہوگا۔ وہ رعایت اور جانبداری جانتے ہی نہ تھے۔ معاملات میں وہ یہ بالکل بھول جاتے تھے کہ ان کا تعلق کسی انسان سے ہے۔ صرف واقعات اُن کے پیش نظر رہتے تھے اور انہیں پر بے وہ بلا رُو و رعایت فیصلہ کرتے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اہل حیدر آباد جو ان باتوں کے عادی نہیں اُن سے کبھی خوش نہیں رہے۔ وہ روزانہ سوائے اہم امور کے بہت کم کام کرتے تھے۔ جب کام بہت سا جمع ہو جاتا تھا تو دو تین روز جم کر کام کرتے تھے اور سب کو ایک ہی دفعہ ختم کر دیتے تھے۔ وہ کبھی طول طویل فیصلہ نہیں کرتے تھے۔ بڑی بڑی ضخیم مسلوں اور مدتوں کے پیچیدہ معاملات کو چند سطروں میں سلجھا دیتے تھے اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا معاملے کی جان نکال کر رکھ دی ہے۔ ان کی تحریر جامع دماغ اور حشو و زوائد سے پاک ہوتی تھی اور یہی حال اُن کا تمام تصانیف کا ہے۔ لفظ اشد ضروری سے انہیں سخت چڑ تھی، اور اس قسم کے جو مراسلات آتے وہ انہیں اُلٹا کے پھینک دیتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ لوگ سمجھتے سمجھاتے خاک نہیں، خواہ مخواہ مراسلات پر اشد ضروری لکھ دیتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ مولوی صاحب مرحوم نے لکڑی کا ایک صندوق بنا رکھا تھا، جو اشد ضروری کا لفافہ آتا وہ اس میں بے پڑھے

ڈال دیتے تھے۔ ایک بار مدارالمہام بہادر کے ہاں کمیٹی تھی، اُس میں اُن کے بعض ہمعصر و ہمرتبہ معزز عہدہ داروں نے مدارالمہام بہادر کے سامنے مولوی صاحب سے شکایت کی کہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ تالیف و تصنیف میں مصروف رہتے ہیں یا سوتے رہتے ہیں کہ ہمارے ضروری اور اشد ضروری مراسلات کا بھی جواب نہیں دیتے۔ مولوی صاحب نے کہا ذرا تامل فرمائیے، میں اس کا جواب دیتا ہوں۔ آدمی سے کہا وہ صندوق لاؤ۔ صندوق آیا اور انہوں نے مدارالمہام بہادر سے مخاطب ہوکر کہا کہ سرکار دیکھئے ان صاحبوں کے تمام اشد ضروری لفافے اس میں موجود ہیں۔ میں نے ان میں سے ایک لفافہ بھی نہیں کھولا، سب کے سب بند پڑے ہیں۔ اب میں ان میں سے کوئی سا ایک اٹھا لیتا ہوں۔ چنانچہ انہوں نے ان میں سے ایک لفافہ اُٹھا لیا۔ اُسے کھولا تو اُس میں یہ لکھا تھا کہ فلاں تختہ بھیج دیا جائے۔ مراسلہ پڑھ کر سُنانے کے بعد مدارالمہام سے عرض کی کہ اس کا اب آپ ہی انصاف فرمائیے کہ یہ کونسا اشد ضروری کام تھا۔ یہ لوگ اشد ضروری کے معنے نہیں سمجھتے اور خواہ مخواہ لفافوں پر اشد ضروری لکھ دیتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ میں جواب نہیں دیتا۔ پھر فرمایا کہ شاید سال بھر میں دو تین ہی واقعہ اشد ضروری درپیش آتے ہوں گے۔ اِن حضرات نے ہر ایک بات کو اشد ضروری خیال کر لیا ہے۔

مولوی طالب الحق صاحب مددگار صدر محاسب جو سرکار عالی کے ایک نہایت متدین، قابل اور تجربہ کار عہدہ دار ہیں اور سر سالار جنگ مرحوم کے زمانے سے اب تک مختلف عہدوں پر رہے ہیں اور خود بھی مولوی چراغ علی مرحوم کے تحت میں کام کر چکے ہیں، فرماتے ہیں کہ اگرچہ مجھے سرکار عالی میں ایسے ایسے عہدہ داروں کے ساتھ کام کرنے کا سابقہ ہوا ہے جو اپنے اپنے کمال اور

خصوصیات کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ تھے، لیکن مرحوم میں بعض ایسی خصوصیات تھیں کہ پھر کسی میں نظر نہ آئیں۔ وہ نہایت مستقل مزاج تھے، بڑی غور و خوض کے بعد رائے قائم کرتے، اور رائے قائم کرنے کے بعد پھر اس سے کبھی نہ ٹلتے تھے، گویا وہ رائے پتھر کی لکیر ہوتی تھی۔ مولوی صاحب موصوف نے راقم سے ایک خاص معاملے کے متعلق ذکر کر کے فرمایا (اور اس کی مسل کا بھی حوالہ دیا) کہ مرحوم کی زمانۂ مددگاری میں سر سالار جنگ مرحوم نے مولوی صاحب مرحوم کی رائے سے اس میں اختلاف کیا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان کا رجحان معتمد (نواب محسن الملک مرحوم) کی طرف ہے۔ اور مولوی صاحب مرحوم کی رائے پر چند سوالات کیئے۔ مرحوم نے نہایت مدلل جواب دیا۔ اس پر کچھ سر سالار جنگ مرحوم نے اعتراض اور سوال کیئے، ادھر سے پھر اس کا جواب ادا کیا گیا۔ کوئی چار پانچ مرتبے ایسے ہی سوال و جواب ہوئے، اور آخر نواب مدار المہام بہادر مرحوم قائل ہو گئے اور یہ تحریر فرمایا کہ میں دیکھتا تھا کہ آپ اپنی رائے کے متعلق کیا دلائل رکھتے ہیں اور بیشک آپ کی رائے صحیح اور درست ہے۔ اگرچہ بہت کم باتیں کرتے تھے مگر معاملات میں خوب گفتگو کرتے تھے۔ لیکن اس میں بھی کوئی لفظ زائد اور فضول نہیں کہتے تھے اور ان کا جملہ اکثر دو تین یا ایک دو لفظ سے زیادہ کا نہیں ہوتا تھا۔ صرف کام کے ایک دو لفظ کہہ دیتے تھے جس سے مافی الضمیر ادا ہو جائے۔ جب کسی مسودے میں کچھ بنا دیتے تو گویا ساری تحریر میں جان ڈال دیتے تھے۔ نہایت تیز فہم اور صائب الرائے تھے۔

جناب مولوی سید علی حسن خاں بہادر سابق معتمد فینانس و حال وزیر جاورہ جو مولوی چراغ علی مرحوم کے بہترین جانشین ہوئے اور بوجہ اپنی اعلیٰ قابلیت تدین، تجربہ کاری، عالی ظرفی اور راستی و راست بازی کے،

ہماری قوم کے بے مثل افراد میں سے ہیں راقم سے فرماتے تھے کہ ایک بار نواب سروقارالامرا بہادر مرحوم فرمانے لگے کہ مولوی چراغ علی بھی عجیب و غریب آدمی تھے۔ اور اس کے بعد اُنھوں نے ایک پارسی جنٹلمین کا واقعہ بیان کیا جسے وظیفہ رعایتی یا رقم دینے کے متعلق نواب صاحب مرحوم نے حکم دیا تھا۔ مولوی چراغ علی مرحوم نے معاملہ کو ڈال رکھا تھا۔ اُس نے آکر نواب صاحب سے شکایت کی کہ معتمد صاحب کچھ تصفیہ نہیں کرتے اور معاملہ کو ڈال رکھا ہے۔ نواب صاحب نے پھر حکم لکھا۔ مولوی صاحب مرحوم پھر چُپ سادھ گئے۔ اس نے کچھ عرصہ کے بعد پھر شکایت کی۔ نواب صاحب نے پھر لکھا مگر مولوی صاحب مرحوم ٹس سے مس نہ ہوئے۔ بیچارہ سائل کچھ دنوں تک اپنے معاملہ میں تگ و دو کرتا رہا۔ لیکن جب دیکھا کہ یہاں دال گلتی نظر نہیں آتی تو پریشان ہو کر پھر نواب صاحب مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا اور رو پا دھویا۔ نواب صاحب مرحوم جو مروّت کے پُتلے تھے فرمانے لگے کہ اچھا جب مولوی چراغ علی یہاں آئیں تو ہمیں یاد دلا دینا۔ غرض وہ تاک میں رہا جس روز مولوی صاحب بارگاہ وزارت میں حاضر ہوئے تو اس نے یاد دہانی کرائی۔ نواب صاحب نے مولوی صاحب سے دریافت کیا کہ میں نے فلاں معاملہ میں آپ کو تین بار حکم دیا، مگر آپ نے اب تک اُس میں کچھ نہ کیا۔ مولوی صاحب نے اُس کا کچھ جواب نہ دیا اور مسل صندوق میں سے نکال کر سامنے رکھ دی۔ نواب صاحب نے کسی قدر جھنجلا کے کہا کہ میں مسل کو کیا کروں آپ کو کئی بار لکھا گیا ہے اور آپ نے اب تک ہمارے حکم کی تعمیل نہیں کی۔ مولوی صاحب نے اُس کے جواب میں فرمایا کہ "آپ اس لئے وزیر نہیں بنائے گئے کہ سرکار کا خزانہ لٹا دیں۔ آپ کا کام خزانہ کی حفاظت

ہے۔" یہ جواب سُن کر نواب صاحب مرحوم بالکل ساکت رہے، اور پھر کبھی آپ نے مولوی صاحب سے اس معاملہ کے متعلق تحریک نہیں کی۔ یہ واقعہ خود نواب سر وقار الامرا بہادر مرحوم کی زبانی ہے۔ اور حق یہ ہے کہ سوائے مولوی چراغ علی کے کوئی دوسرا شخص یہ جواب نہیں دے سکتا تھا۔ اس سے اُن کی اخلاقی جرأت اور راست بازی کا پورا اندازہ ہو سکتا ہے۔

مولوی سید علی حسن صاحب یہ بھی فرماتے تھے کہ اضلاع پر سے جو تختے (گوشوارے) آتے تھے اور اُن پر جو مولوی صاحب مرحوم تنقیح کرتے تھے اس سے اُن کی دقت نظر اور اعلیٰ درجہ کی ذہانت معلوم ہوتی تھی۔ جو عہدہ دار کہ بڑے بڑے دورے کرتے ہر معاملہ کی چھان بین کرتے اور انتظامی معاملات میں باخبر رہتے تھے، اُن سے تعلقدار لوگ اتنا نہیں ڈرتے تھے، جتنا مولوی چراغ علی مرحوم کی گھر بیٹھے تختوں کی تنقیح سے

مطالعہ میں بے حد شغف تھا۔ گویا یہی اُن کا اوڑھنا بچھونا تھا یہاں تک کہ کھانا کھاتے وقت بھی کتاب سامنے رہتی تھی، اور وقتاً فوقتاً نشان کرتے جاتے تھے۔ اور انتہا ہے کہ بیت الخلا میں بھی کتابیں رہتی تھیں، اور وہاں بھی پڑھنے سے نہیں چوکتے تھے۔ رات کو تین چار گھنٹے سے زیادہ نہیں سوتے تھے۔ آرام کرسی پر پڑھتے پڑھتے سو گئے، اس کے بعد پلنگ پر جا لیٹے اور پڑھنے لگے اتنے میں سو گئے۔ کچھ دیر کے بعد میز پر جا کر لکھنے لگے۔ مسٹر محبوب علی (سپرنٹنڈنٹ مدرسہ حرفت و صنعت اورنگ آباد فرزند مرحوم) اپنی والدہ کی زبانی یہ بیان کرتے ہیں کہ وہ فرماتی تھیں کہ میری ایک ڈیوٹی یہ بھی تھی کہ رات کو اُن کے سینے پر سے کتاب اُٹھا کے رکھوں ورنہ کتاب کے جلد پٹھے سب ٹوٹ کے رہ جاتے۔ تین چار گھنٹے سونے میں اور ایک

آدھ گھنٹہ ہوا خوری میں تو البتہ جاتا تھا ورنہ باقی تمام وقت کام میں اور خاص کر مطالعہ کتب اور تالیف و تصنیف میں صرف ہوتا۔ کتابوں کا بہت شوق تھا اور بہت سی عمدہ عمدہ کتابیں جمع کی تھیں۔ اُن کا کُتب خانہ قابل دید تھا، اور اس میں بہت کم ایسی کتابیں تھیں جو اُن کی نظر سے نہ گزری ہوں، یا جن پر اُن کے نشان یا نوٹ نہ ہوں مطالعہ میں اُنھیں ایسی محویت رہتی تھی کہ کچھ ہو جائے اُنھیں خبر تک نہ ہوتی تھی۔ مولوی سید تصدق حسین صاحب مہتمم کتب خانہ آصفیہ کو جو بہت با وضع اور ہمدرد بزرگ ہیں، علاوہ قدیم تعلقات کے ایک مدت تک شب و روز مرحوم کی صحبت میں رہنے کا اتفاق ہوا ہے، مرحوم کے ملازم کلّو کی زبانی فرماتے تھے کہ بلدہ میں مرحوم کا جو بنگلہ ہے اُس میں ڈرائینگ روم کے سامنے ایک شہ نشین ہے۔ اُس کے نیچے تہ خانہ بنا ہوا ہے جس میں کاٹھ کباڑ اور ڈیرے خیمے پڑے رہتے تھے۔ ایک روز مولوی صاحب مرحوم اس شہ نشین پر بیٹھے کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے کہ اتفاق سے تہ خانہ میں آگ لگ گئی اور دھواں نکلنا شروع ہوا۔ ملازموں نے بہتیرا شور و غل مچایا کہ آگ لگی۔ مگر حضرت کو کچھ خبر نہیں۔ غرض آگ لگی اور بجھ بھی گئی، مگر آپ جس طرح کتاب پڑھ رہے تھے پڑھتے رہے اور یہ بھی تو خبر نہ ہوئی کہ کیا تھا اور کیا ہوا۔ مولوی انوار الحق صاحب نے اپنی چشم دید واقعہ جو بیان کیا ہے وہ یہ ہے کہ مولوی صاحب مرحوم کھانا کھا رہے تھے اور اس کے نیچے تہ خانہ میں آگ لگ گئی اور وہ اسی طرح بے تکلف بے ہراس کھانا کھاتے رہے۔ یا تو یہ دونو واقعے ایک ہیں یا کلّو کے بیان کرنے میں غلطی ہو گئی ہے۔ مگر دونوں کی نوعیت ایک ہے۔ اور اس سے اُن کی استقلال طبع کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ ایک دوسرا واقعہ اسی قسم کا ایک صاحب نے اپنی چشم دید

بیان کیا ہے۔ کہ ایک مقام پر ٹانگہ میں سوار دورہ کر رہے تھے۔ رستے میں ٹانگہ ٹوٹ گیا۔ آپ اُسی میں پڑے پڑے کتاب کا مطالعہ کرتے رہے۔ لوگ گئے اور کسی دوسری جگہ سے ٹانگہ کا انتظام کیا اور لے کر آئے تو آپ اُس میں سوار ہو کر آگے بڑھے۔

تحقیق و تفتیش کی چیٹک تھی۔ وہ جس مضمون کا خیال کرتے اُس کی تہ تک پہنچتے اور اُس کے مالہ و ما علیہ کے سُراغ میں پتے پتے اور ڈالی ڈالی پھرتے، اور پتال تک کی خبر لاتے۔ اپنی کتاب کے واسطے سامان جمع کرنے کے لیئے کتابوں کے دفتر چھان ڈالتے، اور لوگوں کو بھیج کر مصر و شام و دیگر مقامات سے نایاب کتابیں تلاش کرا کر بہم پہنچاتے، چنانچہ اسی غرض سے مولوی عبد اللہ صاحب ٹونکی کو بغرض تلاش کتب مصر کو روانہ کیا تھا مولوی عبد اللہ صاحب مرحوم نے جو خط مرحوم کو مصر سے لکھا تھا وہ ہم نے خود دیکھا ہے، اور بعض اوقات ایسے ایسے مقامات سے خوشہ چینی کرتے جہاں دوسروں کا خیال بھی نہ پہنچا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جس مضمون پر اُنہوں نے قلم اٹھایا دوسروں کے لیئے بہت کم گنجایش چھوڑی ہے اُن کی تصانیف پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مطالعہ کس قدر وسیع تھا، اور مواد فراہم کرنے کے لیئے انہوں نے کس قدر محنت اور مشقت اُٹھائی ہے۔

مولوی مرزا مہدی خاں صاحب کوکب سابق اسسٹنٹ سکرٹری پولٹیکل فینانس و ناظم مردم شماری (اشوشئیٹ رائل اسکول آف مائنز، فیلو آف دی جیولاجیکل سوسائٹی وغیرہ وغیرہ) راقم سے فرماتے تھے کہ جب برٹش گورنمنٹ کی طرف سے ریاست میں مسٹر کرالی کے کنٹرولر جنرل مقرر ہونے کی

خبر آئی تو چونکہ مولوی صاحب مرحوم فنانشل سکرٹری تھے، انہیں فکر ہوئی۔ آخر انہوں نے فنانس پر انگریزی میں جس قدر مستند اور اعلیٰ درجہ کی کتابیں تھیں سب منگوالیں، اور اُن کا خوب مطالعہ کیا اور دو مہینے میں اس قدر عبور حاصل کیا کہ جب مسٹر کرالی سے ملاقات ہوئی، اور فنانشل معاملات پر گفتگو آئی تو وہ مولوی صاحب کے وسیع معلومات کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔

اسی طرح جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ ہندی موسیقی پر یورپین لوگوں کو اعتراض ہے۔ تو انہوں نے اسے سیکھنا شروع کیا اور پیانو پر گیتیں نکالنی شروع کیں اُن کا ارادہ تھا کہ ہندی موسیقی کو سائنٹفک طور پر مدوّن کریں۔ چنانچہ لکھنا بھی شروع کیا تھا اور اس کا نا تمام سا مسودہ اب بھی موجود ہے۔ لیکن اس کام کے لئے بڑی فرصت درکار تھی لہذا اُسے انجام نہ دے سکے۔ علم ہیئت میں بھی انھیں خوب دخل تھا۔

متعدد علوم اور کئی زبانوں کے عالم تھے۔ چنانچہ سر سید رح اُن کی وفات کے حال میں لکھتے ہیں "متعدد علوم میں نہایت دستگاہ رکھتے تھے؛ عربی و کالڈی زبان میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے، لیٹن اور گریک بقدر کارروائی جانتے تھے عربی زبان و عربی علوم کے عالم تھے؛ فارسی نہایت عمدہ جانتے تھے اور بولتے تھے اعلیٰ درجہ کے مصنف تھے انگریزی زبان میں بھی اونھوں نے تصنیفیں کی ہیں" زیادہ تر اُن کی تصنیفیں انگریزی زبان میں ہیں جنکا مفصل ذکر اُنکی مذہبی تصانیف میں آگے چل کر بیان کیا جائیگا۔ لیکن یہاں اس قدر بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ اُن کی ابتدائی تعلیم خاص کر انگریزی زبان میں بہت کم ہوئی تھی لیکن اُنھوں نے صرف اپنے مطالعہ کے زور سے انگریزی زبان میں بہت اچھی مہارت اور دستگاہ حاصل کر لی تھی۔ نہ صرف ہم اُن کی مطبوعہ کتب کو ہی دیکھ کر نہیں کہتے بلکہ ہم نے اُن کے

ہاتھ کے لکھے ہوئے مسودے بھی دیکھے ہیں۔ اُن کی انگریزی کتابوں پر ہندوستان اور انگلستان کے اخبارات نے جو زبردست ریویو کئے ہیں اُن میں اُنکی انگریزی تحریر کی بھی تعریف ہے۔ ہم بطور نمونہ یہاں ایک دو ریویوؤں سے صرف اُن کی انگریزی "دانی" کے متعلق چند فقرے نقل کرتے ہیں:-

اسے تھی نیم نے جو انگلستان کا ایک مشہور پرچہ ہے اور جس کی ادبی تنقید کی دھوم ہے ان کی کتاب زیر دیباچہ پر ایک بڑا ریویو لکھا ہے۔ لکھتا ہے "مولوی صاحب کی انگریزی قابل قدر ہے" بابت ۵ جنوری ۱۸۸۴ء۔

بمبئی گزٹ جو بمبئی پریسیڈنسی کا بہت قابل قدر اخبار ہے لکھتا ہے "یہ کتاب نہایت عمدہ انگریزی میں لکھی گئی ہے (بمبئی گزٹ بابت ۲۱ جولائی ۱۸۸۳ء)۔

جنرل آف دی انجمن پنجاب نے دو نمبروں میں اس کتاب پر بہت بڑا ریویو لکھا ہے اور اُس میں لکھتا ہے کہ "مصنف کو انگریزی زبان پر بہت بڑی قدرت حاصل ہے اور وہ شرع و مذہب اسلام کا بڑا عالم ہے"۔

مولوی انوار الحق صاحب فرماتے ہیں کہ انہوں نے اپنی آنکھ سے سید محمود مرحوم کا خط مولوی چراغ علی کے نام دیکھا جس میں سید محمود مرحوم نے مولوی صاحب کے وسیع معلومات اور ان کی انگریزی دانی اور انگریزی کی بڑی تعریف کی تھی۔

علاوہ مذہبی تصانیف کے جن کا ذکر مفصل طور پر الگ کیا جائیگا یہاں اُن کی بعض اُن تالیفات کا ذکر کیا جاتا ہے جو انہوں نے سرکاری تعلق اور حیثیت سے لکھیں یہ سب انگریزی زبان میں ہیں۔

(۱) بجٹ (موازنہ) سب سے اول مولوی چراغ علی مرحوم نے تیار کیا۔ اگرچہ موازنہ اب کچھ کا کچھ ہوگیا ہے اور خاصہ ایک دفتر ہے۔ لیکن بعض اہل الرائے کا یہ قول ہے کہ جو اختصار اور صفائی اُس موازنہ میں پائی جاتی ہے وہ موجودہ موازنہ میں نہیں۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ آج کل موازنہ کی ترتیب میں بہت کچھ ترقی ہوئی ہے لیکن بفحوائے الفضل للمتقدم فضیلت کی دستار مولوی صاحب مرحوم ہی کے سر رہے گی۔

(۲) اڈمنسٹریشن رپورٹ (رپورٹ نظم ونسق) بابت ۱۲۹۵ف مطابق ۸۴-۱۸۸۳ء لکھی جو چھ سو سینتیس ۶۳۷ بڑے بڑے صفحوں پر ہے۔ اس قسم کی پہلی رپورٹ ہے۔ اور بعدازاں جتنی رپورٹیں لکھی گئی وہ سب اسی کی پیروی میں لکھی گئیں۔

(۳) حیدرآباد (دکن) انڈر سر سالار جنگ۔ یہ کتاب چار ضخیم جلدوں میں ہے اور ریاست کی انتظامی حیثیت سے نہایت قابل قدر اور بےمثل کتاب ہے۔ مولوی صاحب مرحوم نے اس کے لکھنے میں بڑی محنت اور جان کاہی سے کام لیا ہے۔ اگرچہ زیادہ تر بحث اس میں اُن تمام انتظامات اور اصلاحات سے ہے جو سر سالار جنگ اعظم کے عہد میں عمل میں آئیں۔ لیکن جس انتظام اور صیغے پر انہوں نے قلم اُٹھایا ہے اُسے ابتدا سے لیا ہے اور اس کی اصل، تغیرات، وجہ تسمیہ اور تاریخی حیثیت وغیرہ کو محققانہ طور سے بیان کیا ہے اور اس کے متعلق تمام مواد اور اعداد کو گوشواروں کی صورت میں مہیا کر دیا ہے۔ علاوہ اس تاریخی اور انتظامی حیثیت کے ساتھ ساتھ ممالک محروسہ سرکاری کا مقابلہ آس پاس کے صوبہ جات

سے بھی کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب کو پڑھے بغیر کوئی شخص حیدرآباد کی گزشتہ اور موجودہ حالت انتظامی سے پورا واقف نہیں ہو سکتا۔ خصوصاً جن لوگوں کے ہاتھ میں انتظام کی باگ ہے، انہیں اس کتاب کا مطالعہ کرنا بہت ضروری بلکہ لازمی ولابدی ہے۔ اس کتاب کو مولوی صاحب مرحوم نے نواب سر سالار جنگ کے نام سے معنون کیا ہے۔ اگرچہ کتاب نواب صاحب مرحوم کے زمانہ میں آپ کی اجازت سے لکھنی اور چھپنی شروع ہوگئی تھی، لیکن افسوس ہے کہ وہ اس کے اختتام سے قبل راہی ملک بقا ہوگئے بعد میں فاضل مؤلف نے اپنی احسانمندی کے اظہار میں نواب مرحوم کے نام سے اُسے منسوب کیا۔ انگریزی اخبارات نے اس پر بہت عمدہ عمدہ ریویو کئے ہیں اور فاضل مؤلف کی محنت و تحقیق کی داد دی ہے۔ چنانچہ بمبئی گزٹ اپنے نمبر مورخہ ۴ ۔ اکتوبر ۱۸۸۵ء میں اس کتاب پر ریویو کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"مولوی چراغ علی نے اپنی کتاب کے تاریخی اور اعدادی حصہ میں بڑی محنت اور احتیاط صرف کی ہے۔ لیکن سب سے دلچسپ وہ حصہ ہے جس میں موجودہ نظم و نسق کی کیفیت درج ہے۔ اس میں متجسس ناظرین اُن مختلف محکموں اور سررشتوں کے طرز عمل اور حقیقت کو دیکھیں گے جو سر سالار جنگ کی بدولت ایسے وقت میں ظہور میں آئے جبکہ بے عنوانی اور بے ترتیبی پھیلی ہوئی تھی اور اُنھوں نے نظم و ترتیب کی صورت قائم کی"۔

اسی طرح اُس وقت کے رزیڈنٹ مسٹر کارڈی نے اپنے خط مورخہ ۱۷۔ اکتوبر ۱۸۸۵ء میں مولوی صاحب مرحوم کے نام ہے اس کتاب کی بہت تعریف لکھی ہے

اسی کا ایک ضمیمہ صرف خاص انڈر سر سالار جنگ ہے۔ جن میں اُن اصلاحات و ترقیات کا ذکر ہے جو سر سالار جنگ کی تدبیر و دانشمندی سے علاقہ صرف خاص میں عمل میں آئیں۔

(۴) جاگیرات و جاگیرداران۔ افسوس یہ کتاب ناتمام رہ گئی۔ مولوی صاحب کا ارادہ تھا کہ اس میں تمام جاگیرداران ممالک محروسہ سرکار عالی کی اصل اور تاریخ، اُن کا رقبہ اور آمدنی، پیداوار، حرفت و صنعت، اور دیگر تمام عجیب اور مفصل حالات درج کریں۔ لیکن اس کے لئے اُنہیں مواد بہم پہنچانے میں بہت دقت پیش آئی یہاں کے جاگیردار صاحبان مولوی صاحب کے اس کام کو غالباً شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے، اور مُراسلوں کے جواب میں حوصلہ شکن تساہل سے کام لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مرحوم کی زندگی میں یہ کتاب ختم نہ ہونے پائی۔ اور اُن کے بعد جو لوگ عہدۂ فنانسل سکرٹری پر اُن کے جانشین ہوئے۔ اُن میں سے نہ کسی کو اس سے دلچسپی تھی اور نہ اتنی فرصت کہ اس کام کو انجام تک پہنچاتا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اگر یہ کتاب لکھی جاتی تو نہ صرف دلچسپ ہوتی بلکہ بہت سی عمدہ معلومات کا خزانہ ہوتا جو گورنمنٹ اور ملک دونوں کے لئے مفید ہوتا۔

غرض مولوی چراغ علی مرحوم نہ صرف بحیثیت ایک مصنف کے بلکہ بحیثیت ایک عام انسان کے بھی ایک عجیب و غریب شخص تھے، اور یہی وجہ ہے کہ ان کی نسبت رائے قائم کرنے میں اکثر لوگوں کو مغالطہ ہوا ہے۔ عموماً ہر شخص دوسرے سے اپنی طبیعت اور مزاج کے مطابق توقع رکھتا ہے، اور چونکہ وہ تقریباً ہر شخص سے جدا اور نرالی طبیعت رکھتے تھے اس لئے بہت کم لوگ ایسے تھے جو اُن کی صحیح طور پر قدر

کر سکتے تھے۔ مثلاً مولوی صاحب مرحوم ایک تو طبعاً خاموش طبع تھے دوسرے انہیں اپنے وقت کی قدر بہت تھی۔ وہ ایسی ہنسی بہلانے کو فضول باتوں میں ضائع کرنا نہیں چاہتے تھے چنانچہ اسی وجہ سے وہ عام طور پر لوگوں سے ملنے سے بہت گھبراتے تھے اور جو لوگ ملنے آتے تھے ان سے صرف کام کی بات کے سوائے دوسری بات نہیں کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ بہت جلد ملاقات ختم ہو جائے۔ اور جو کوئی خواہ مخواہ دیر لگاتا تھا اور نہیں ٹلتا تھا تو وہ بہت جزبز ہوتے تھے، کبھی اخبار اٹھا لاتے، کبھی کتاب پڑھنے لگتے۔ عام طور پر بہت کم سخن تھے، بہت اختصار کے ساتھ اپنا مطلب ادا کرتے تھے، اور سوائے بعض ہم مذاق احباب کے کسی سے زیادہ باتیں نہیں کرتے تھے لیکن چھوٹے بچوں سے بے تکلف باتیں کرتے تھے اور ان سے مزے مزے کے سوالات کرتے، اور ان کے سوالوں کے جواب نہایت شرح و بسط اور خوبی کے ساتھ دیتے۔ مثلاً اگر کسی بچے نے کسی پودے کی نسبت پوچھا تو آپ پورا حال اس پودے کا اور پودوں کی نشوونما اور آب و ہوا اور زمین کے اثر کا بیان کر دیتے اور ان چھوٹی چھوٹی مگر مشکل باتوں کو نہایت صفائی کے ساتھ سمجھاتے تھے۔ لیکن جب لڑکا سیانا ہو جاتا اور اس میں ادب و تمیز پیدا ہو جاتی تو پھر اس سے باتیں کرنا چھوڑ دیتے تھے۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ چھوٹے بچوں میں جو بھولا پن، خیال کے ظاہر کرنے میں بے تکلفی اور سادگی، گفتگو میں بے ساختہ پن اور سب سے بڑھ کر جو مساوات ہوتی ہیں وہ بڑے ہو کر نہیں رہتی۔ بڑے ہو کر خیال کے ظاہر کرنے میں کچھ تو تصنع اور کچھ ادب اور لحاظ ہوتا ہے، پھر مساوات کا خیال بھی نہیں رہتا، خودی و بزرگی کے خیالات

پیدا ہوجاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ باتیں کرتے ہوئے چھوٹے بچے زیادہ پیارے ہوتے ہیں۔ اور اگر کوئی بتانے والا ہو تو اُس وقت انہیں بہت کچھ سکھا سکتا ہے۔ مولوی صاحب مرحوم اپنے دوستوں اور عزیز و اقربا سے بھی بہت سلوک کرتے تھے لیکن کبھی کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے۔ روپیہ پیسہ کی بالکل محبت نہیں تھی بہت سیر چشم اور عالی ظرف واقع ہوئے تھے، نوکروں پر کبھی سختی نہیں کرتے تھے، نہ کبھی کسی معاملہ میں اُن سے باز پرس کرتے، اور نہ کبھی کوئی سخت کلمہ کہتے۔ بعض اوقات ایسا ہوا کہ کسی نوکر نے اُن کی کوئی عزیز یا بیش قیمت چیز توڑ دالی، مگر خفا ہونا تو درکنار انہوں نے پوچھا تک نہیں کہ کیونکر ٹوٹی اور کس نے توڑی۔ مولوی صاحب مرحوم کے بھتیجے مولوی محمد علی صاحب جو نیک سیرتی اور سادگی میں اپنے والد مرحوم اور چچاؤں کی سچی یادگار ہیں، راقم سے فرماتے تھے کہ رات کا کوئی وقت ایسا نہیں تھا کہ جب ہم نے انہیں کام کرتے ہوئے نہ دیکھا ہو۔ تھوڑی دیر سوئے، پھر اُٹھ کر لکھنے یا پڑھنے بیٹھ گئے، اور پھر سو گئے، اور اس کے بعد کیا دیکھتے ہیں کہ دوسرے کمرے میں بیٹھے لکھ رہے ہیں یا پڑھ رہے ہیں۔ چونکہ ذیابیطس کی شکایت تھی، پانی زیادہ پیتے تھے، اور یوں بھی رات کے وقت وہ اکثر کام کرتے رہتے تھے لیکن کبھی کسی نوکر کو نہ بلاتے اور خود ہی سب کام کر لیتے تھے۔

غرض مولوی صاحب مرحوم ایک کم سخن، خاموش طبع، فلاسفر مزاج، کوہ وقار، عالی خیال شخص تھے۔ کبھی اپنا وقت بیکار ضائع جانے نہیں دیتے تھے۔ ہر وقت مطالعہ یا غور و فکر یا لکھنے میں مصروف رہتے تھے۔ ایسے وقت میں کسی طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے۔ یہی نہیں کہ بات چیت

کم کرتے ہوں بلکہ فضول اور زائد باتوں سے انہیں طبعی نفرت تھی۔ یہ حال غیروں ہی سے نہ تھا بلکہ بیوی بچوں سے بھی یہی کیفیت تھی۔ سب کی سُن لیتے تھے مگر اپنی کچھ نہیں کہتے تھے، کبھی کسی سے مناظرہ اور بحث نہیں کرتے تھے، کوئی کچھ کہا کرے، انہیں جو کچھ کرنا ہوتا تھا کر گزرتے تھے۔

سب کی سُن لیتے ہیں لیکن اپنی کچھ کہتے نہیں
ہے کوئی بھیدی اور ان کا رازداں سب سے الگ } حالی

وقار اور متانت اُن پر ختم تھی، استقلال میں پہاڑ تھے، آزاد خیال ایسے تھے کہ سچ بات کہنے یا لکھنے میں کہیں نہ چوکتے تھے، مطالعہ اور تحقیق میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے، اسلام کے سچے حامی تھے، اور اُن کی عمر اور محنت کا زیادہ حصہ اسی میں گزرا۔ اُن سے پہلے صرف دو شخصوں نے انگریزی زبان میں یوروپین مصنفین کے اعتراضات کی تردید اور اسلام کی حمایت میں کتابیں لکھی تھیں، ایک تو سر سید جن کی کتاب خطباتِ احمدیہ کا ترجمہ انگریزی میں ہوا اور دوسرے رائٹ آنریبل مولوی سید امیر علی بالقابہ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس تحقیق و تدقیق کے ساتھ مولوی چراغ علی مرحوم نے اس مبحث پر کتابیں لکھی ہیں اُس کی اس وقت تک نظیر نہیں ہے۔ یہاں تک کہ خود اُن کے حریف ریورنڈ کینن میکال نے اُن کے علم و فضل اور تحقیق کو تسلیم کیا ہے۔ لیکن باوجود اس کے نہایت بے تعصب تھے اور کسی مذہب و ملت سے انہیں خصومت یا پرخاش نہ تھی، یہاں تک کہ وہ اسلامی فرقوں میں سے بھی کسی سے تعلق نہیں رکھتے تھے، چنانچہ گزشتہ مردم شماری سے قبل جب مردم شماری ہوئی تو انہوں نے مذہب (فرقہ) کے خانہ میں اپنی بیوی کے نام کے سامنے لفظ شیعہ لکھ دیا، لیکن اپنے

اور اپنے بیٹوں کے نام کے مقابل صفر صفر لکھدئے۔ اس سے ان کی کمال بے تعصبی ظاہر ہوتی ہے۔ وہ اُس اسلام کو جس کی تعلیم قرآن نے کی ہے حقیقی مذہب خیال کرتے تھے، اور باقی تمام تفریقوں کو فضول اور لچر سمجھتے تھے۔

اس موقع پر یہ واقعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جب ہم مولوی صاحب مرحوم کی حالات کی جستجو میں تھے تو ہمیں مولوی صاحب کے کاغذات میں سے چند خطوط مرزا غلام احمد صاحب قادیانی مرحوم کے بھی ملے جو انہوں نے مولوی صاحب کو لکھے تھے اور اپنی مشہور اور پُرزور کتاب براہین احمدیہ کی تالیف میں مدد طلب کی تھی۔ چنانچہ مرزا صاحب اپنے ایک خط میں کہتے ہیں کہ "آپ کا افتخار نامہ محبت آمود ۔۔۔۔ عز ورود لایا۔ اگرچہ پہلے سے مجھ کو بہ نیت الزام خصم اجتماع براہین قطعیہ اثبات نبوت وحقیت قرآن شریف میں ایک عرصہ سے سرگرمی تھی مگر جناب کا ارشاد موجب گرم جوشی و باعث اشتعال شعلہ حمیت اسلام علی صاحبہ السلام ہوا اور موجب ازیاد تقویت و توسیع حوصلہ خیال کیا گیا کہ جب آپ سا اولوالعزم صاحب فضیلت دینی و دنیوی تہ دل سے حامی ہو، اور تائید دین حق میں دل گرمی کا اظہار فرماوے تو بلا شائبہ ریب اس کو تائید غیبی خیال کرنا چاہیے جزاکم اللہ نعم الجزاء ۔۔۔۔۔۔ ماسوائے اس کے اگر اب تک کچھ دلائل یا مضامین آپ نے نتائج طبع عالی سے جمع فرمائے ہوں تو وہ بھی مرحمت ہوں"۔ ایک دوسرے خط میں تحریر فرماتے ہیں "آپ کے مضمون اثبات نبوت کی اب تک میں نے انتظار کی، پر اب تک نہ کوئی عنایت نامہ نہ مضمون پہنچا، اس لئے آج مکرر تکلیف دیتا ہوں کہ براہ عنایت بزرگانہ بہت جلد مضمون اثبات حقانیت فرقان مجید

طیار کر کے میرے پاس بھیج دیں، اور میں نے بھی ایک کتاب جو دس حصے پر مشتمل ہے تصنیف کی ہے اور نام اس کا براہین احمدیہ علی حقانیہ کتاب اللہ القرآن والنبوۃ المحمدیہ رکھا ہے، اور صلاح یہ ہے کہ آپ کے فوائد جرائد بھی اُس میں درج کروں اور اپنے مختصر کلام سے اُن کو زیب و زینت بخشوں۔ سو اس امر میں آپ توقف نہ فرماویں اور جہاں تک جلد ہو سکے مجھ کو مضمون مبارک اپنے سے ممنون فرماویں۔" اس کے بعد پنجاب میں آریوں کے شور و شغب اور عداوت اسلام کا کسی قدر تفصیل سے ذکر کیا ہے اور آخر میں لکھا ہے کہ "دوسری گزارش یہ ہے کہ اگرچہ میں نے ایک جگہ سے وید کا انگریزی ترجمہ بھی طلب کیا ہے، اور اُمید کہ عنقریب آ جائیگا اور پنڈت دیانند کی ویدبھاش کی کئی جلدیں بھی میرے پاس ہیں، اور اُن کا ستیارتھ پرکاش بھی موجود ہے، لیکن تاہم آپ کو بھی تکلیف دیتا ہوں کہ آپ کو جو اپنی ذاتی تحقیقات سے اعتراض ہنود پر معلوم ہوئے ہوں یا جو وید پر اعتراض ہوتے ہوں، اُن اعتراضوں کو ضرور ہمراہ دوسرے مضمون اپنے کے بھیج دیں۔ لیکن یہ خیال رہے کہ کتب مسلّمہ آریہ سماج کی صرف وید اور منوا سمرت ہے، اور دوسری کتابوں کو مستند نہیں سمجھتے بلکہ پرانوں وغیرہ کو محض جھوٹی کتابیں سمجھتے ہیں۔ میں اس جستجو میں بھی ہوں کہ علاوہ اثبات نبوت حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ہنود کے وید اور اُن کے دین پر بھی سخت اعتراض کئے جائیں کیونکہ اکثر جاہل ایسے بھی ہیں کہ جب تک اپنی کتاب کا ناچیز اور باطل اور خلاف حق ہونا ان کے ذہن نشین نہ ہو تب تک گو کیسی ہی خوبیاں اور دلائل حقانیت قرآن مجید کے اُن پر ثابت کئے جائیں۔

اپنے دین کی طرفداری سے باز نہیں آتے، اور یہی دل میں کہتے ہیں کہ ہم اسی میں گزارہ کر لیں گے۔ سو میرا ارادہ ہے کہ اس تحقیقات اور آپ کے مضمون کو بطور حاشیہ کے کتاب کے اندر درج کر دوں گا۔" ایک اَور خط مورخہ ۱۹ فروری ۱۸۷۹ء میں تحریر فرماتے ہیں "فرقان مجید کے الہامی اور کلام الٰہی ہونے کے ثبوت میں آپ کا مدد کرنا باعث ممنونی ہے نہ موجب ناگواری۔ میں نے بھی اسی بارے میں ایک چھوٹا سا رسالہ تالیف کرنا شروع کیا ہے۔ اور خدا کے فضل سے یقین کرتا ہوں کہ عنقریب چھپ کر شائع ہو جائیگا۔ آپ کی اگر مرضی ہو تو وجوہات صداقت قرآن جو آپ کے دل پر القا ہوں میرے پاس بھیج دیں، تاکہ اُسے رسالہ میں حسب موقع اندراج پا جائے یا سفیر ہند میں . . . . . لیکن جو براہین (جیسے معجزات وغیرہ) زمانہ گزشتہ سے تعلق رکھتے ہوں اُن کا تحریر کرنا ضروری نہیں، کہ منقولات مخالف پر حجت قویہ نہیں آسکتیں۔ جو نفس الامر میں خوبی اور عمدگی کتاب اللہ میں پائی جائے یا جو عند العقل اُس کی ضرورت ہو وہ دکھلانی چاہیئے۔ بہر صورت میں اُس دن بہت خوش ہوں گا کہ جب میری نظر آپ کے مضمون پر پڑے گی۔ آپ بمقتضا اس کے کہ الکریم اذا وعد۔ وفا مضمون تحریر فرماویں۔ لیکن یہ کوشش کریں کہ کیف ما اتفق مجھ کو اس سے اطلاع ہو جائے۔ اور آخر میں دُعا کرتا ہوں کہ خدا ہم کو اور آپ کو جلد تر توفیق بخشے کہ منکر کتاب الٰہی کو دندان شکن جواب سے ملزم اور نادم کریں، ولاحول ولا قوۃ الا باللہ۔" اس کے بعد ایک دوسرے خط مورخہ ۱۰ مئی ۱۸۷۹ء میں تحریر فرماتے ہیں "کتاب (براہین احمدیہ) ڈیڑھ سو جزء ہے جس کی لاگت تخمیناً نو سو چالیس روپیہ،

اور آپ کی تحریر محققانہ ملحق ہوکر اور بھی زیادہ ضخامت ہو جائیگی۔"

ان تحریروں سے ایک بات تو یہ ثابت ہوتی ہے کہ مولوی صاحب مرحوم نے مرزا صاحب مرحوم کو براہین احمدیہ کی تالیف میں بعض مضامین سے مدد دی ہے۔ دوسرے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب مرحوم کو حمایت و حفاظت اسلام کا کس قدر خیال تھا۔ یعنے خود تو وہ یہ کام کرتے ہی تھے مگر دوسروں کو بھی اس میں مدد دینے سے دریغ نہ کرتے تھے۔ چنانچہ جب مولوی احمد حسین صاحب امروہی نے اپنی کتاب تاویل القرآن شائع کی تو مولوی صاحب مرحوم نے بطور امداد کے سَو روپیہ مصنف کی خدمت میں بھیجے۔ اسی طرح جو لوگ حمایت اسلام میں کتابیں شائع کرتے تھے ان کی کسی نہ کسی طرح امداد کرتے تھے اور اکثر متعدد جلدیں ان کی کتابوں کی خرید فرماتے تھے، چنانچہ مولوی محمد علی صاحب کی کتاب پیغام محمدی کئی سَو جلدیں خرید کر دکن میں تقسیم کر دیں۔

وہ میانہ قد اور بھاری جسم کے آدمی تھے، چہرے سے اُن کے رعب داب اور متانت ٹپکتی تھی، چہرہ بھاری بھرکم، سر بڑا، اور آنکھیں بڑی بڑی تھیں اور دیکھنے سے رعب اور اثر پڑتا تھا۔ اُن کے اکثر ہم عصر اور ہم رتبہ لوگ اُن کا بہت احترام اور بہت ادب کرتے تھے اور اس طرح ملتے تھے، جیسے چھوٹے بڑوں سے ملتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ علاوہ شکل وصورت کے لوگوں پر اُن کے علم وفضل اور قابلیت کا بھی رعب پڑتا تھا۔

حیدر آباد میں جہاں ہمیشہ کوئی نہ کوئی فتنہ بپا رہتا ہے، اور ایک بکھیڑے سے نجات نہیں ملتی کہ دوسرا جھگڑا کھڑا ہو جاتا ہے، وہ اس طرح

سے رہے، جیسے طوفان موج خیز میں لائٹ ہوس۔ حالانکہ وہ ہمیشہ بڑے بڑے عہدوں پر رہے لیکن کبھی کسی جھگڑے، کسی سازش، کسی پولٹیکل سوشل تحریک میں اُن کا نام نہیں آیا۔ وہ ہمیشہ دھڑے بندیوں سے الگ رہے، نہ اپنا کوئی جتھا بنایا اور نہ کسی کے جتھے میں شریک ہوئے۔ وہ اپنے تمام سرکاری نیز خانگی امور میں ہر قسم کے تعصبات سے بری تھے، وہ ان سب جھگڑوں کو فضول اور ہیچ سمجھتے تھے، ان کی توجہ اور اُن کا دل کہیں اور تھا۔

پاک ہیں آلائشوں میں بندشوں میں بے لگاؤ
رہتے ہیں دنیا میں سب کے درمیاں سب سے الگ } حالی

جو لوگ یہاں کامیابی اور عزت کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں، اُنہیں مولوی چراغ علی مرحوم کی مثال پیش نظر رکھنی چاہیئے، اور یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ زمین شور میں قلبہ رانی کا نتیجہ سوائے ندامت کے کچھ نہیں۔ انہیں مولوی چراغ علی مرحوم کی طرح اُس زرخیز زمین میں تخم ریزی کی کوشش کرنی چاہیئے جس کے نتائج اب تک بارآور ہیں، اور جس کی وجہ سے اُن کا نام ہمیشہ عزت و حرمت کے ساتھ یاد کیا جائیگا۔

بارے دنیا میں رہو غمزدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کرکے چلو یاں کہ بہت یاد رہو } میر

وفات

اگر صد سال مانی ور یکی روز بباید رفت زین کاخ دل افروز

مرحوم کو ذیابطیس کی شکایت تو پہلے ہی سے تھی، اب اسہال کے

اثر سے ایک گلٹی دہنی کنپٹی اور گردن کے درمیان دائرہ کے نیچے نمودار ہوئی، ڈاکٹر ہیراٹن کے فیملی ڈاکٹر تھے۔ اور ڈاکٹر لاری مشہور سرجن وسابق ناظم محکمۂ طبابت سرکارعالی کی یہ رائے ہوئی کہ عمل جراحی کیا جائے۔ اس وقت تک مرحوم بالکل تندرست اور صحیح معلوم ہوتے تھے اور سرکاری کام میں برابر مصروف تھے۔ چنانچہ حسب مشورہ باہمی ڈاکٹر لاری نے نشتر دیا۔ اس کے بعد صحت میں یک بارگی فرق آگیا اور ضعف طاری ہوگیا۔ بعدازاں دو تین بار پھر نشتر کیا گیا اور ہر بار حالت ردّی ہوتی گئی اور زہر آلود خون پھیلتا گیا۔ حالانکہ یہ زخم بہت ہی نازک ہوگیا تھا اور پکے پھوڑے سے زیادہ اس میں تکلیف ہوتی تھی، لیکن جب ڈاکٹر زخم صاف کرتا اور اُسے اندر باہر سے صاف کرکے دھوتا تھا، تو مولوی صاحب خاموش اسی طرح بیٹھے رہتے تھے، کیا مجال جو جو زبان سے اُف نکل جائے، یا تیور سے کسی قسم کی درد یا تکلیف کا اظہار ہو، چونکہ حالت ناقابل اطمینان تھی لہذا مولوی صاحب اور اُن کے اعزہ و احباب کی یہ رائے قرار پائی کہ بمبئی جاکر علاج کیا جائے۔ چنانچہ روز سہ شنبہ بتاریخ ۱۱ جون ۱۸۹۵ء مرحوم مع اہل وعیال کے بمبئی تشریف لے گئے۔ وہاں بڑے بڑے حاذق ڈاکٹروں نے علاج کیا۔ مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا، حالت بہت ردی ہوچکی تھی، زہر آلود خون جسم میں پھیل گیا تھا۔ حکیموں اور ڈاکٹروں کی حذاقت اور چارہ سازی دھری رہ گئی، اور حکمت و تدبیر کچھ کارگر نہ ہوئی۔ وہ وقت جو ٹلنے والا نہیں ہے اور جس سے کوئی جان دار بچ نہیں سکتا آخر آپہنچا۔ پندرھویں جون دو شنبہ صبح کے آٹھ بجے سے تنفس شروع ہوگیا اور گیارہ بجتے بجتے

دارِ فنا کا مسافر زندگی کی پچاس منزلیں طے کر کے راہی ملکِ بقا ہوا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ؏

کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ، وَّیَبْقٰی وَجْہُ رَبِّکَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِکْرَام

مرحوم بمبئی کے قبرستان میں دفن ہوئے

انسان نہیں رہتا، لیکن اُس کے اعمال رہ جاتے ہیں، جو کسی کے مٹائے نہیں مٹ سکتے۔ یہی اس کی پونجی، یہی اُس کی آل اولاد اور یہی اُس کی کمائی ہے۔ اولاد مرحوم کی یہی ہے یعنے پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں اور بفضلِ خدا سب کے سب صحیح سلامت اور بقیدِ حیات ہیں۔ اور اولاد کس کے نہیں ہوتی اور کون جاندار ہے جو اس پر قادر نہیں، بلکہ جتنے ادنے اور ذلیل جانور ہیں اُتنی ہی اُن کے زیادہ اولاد ہوتی ہے۔ چنانچہ بعض کیڑے ایسے ہیں کہ اُن کے چند گھنٹوں میں ہزاروں لاکھوں بچے پیدا ہوتے اور مر جاتے ہیں۔ لیکن انسان کا نام اس کے کام سے ہے۔ آج جو ہم مرحوم کو یاد کر رہے ہیں تو کیا اُن کی اولاد اور مکانات اور جاہ و ثروت کی وجہ سے؟ ہرگز نہیں۔ یہ سب آنی جانی چیزیں ہیں۔ بلکہ اُن کے کیرکٹر اور کام کی وجہ سے۔ اور ہم کیا یاد کر رہے ہیں بلکہ اُن کا کیرکٹر اور اُن کا کام خود ہمیں اُن کی یاد دلا رہا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج ہم اُن کی کتابیں شوق سے پڑھتے، اُن کا ترجمہ کرتے اور اُنہیں یاد کرتے ہیں اور اُن کے نیک نام اور کام کی یاد دوسروں کو دلاتے ہیں۔ پس یہی ایک چیز ہے جو مرحوم کو زندہ رکھے گی اور یہی ایک چیز ہے جو دُنیا میں اللہ کے نیک بندوں کو زندہ رکھتی ہے۔

مرحوم کی وفات پر تمام اردو انگریزی اخبارات میں اظہارِ افسوس

و ملال کیا گیا تھا۔ لیکن یہاں ہم بخوف طوالت صرف دو تحریروں کی نقل کرتے ہیں۔ ایک نواب سر وقار الامرا بہادر مرحوم (مدار المہام وقت) کا اظہار افسوس جو انہوں نے سرکار کی طرف سے کیا۔ اور جریدۂ اعلامیہ سرکار عالی میں طبع اور شائع ہوا۔ دوسرا سر سیدؒ کا نامۂ الم جو اس دردناک خبر کے سنتے ہی اُنہوں نے تہذیب الاخلاق میں لکھا تھا حقیقت میں یہ دونو تحریریں سچی اور دل سے لکھی گئی ہیں۔

"مولوی چراغ علی کی وفات سے ریاست کا ایسا بے لاگ، بے لوث، مستقل مزاج، تجربہ کار عہدہ دار جاتا رہا کہ پھر اس کا بدل نہ ملا۔ اُدھر قوم میں سے ایک حامئ ملت اور فاضل محقق گم ہو گیا۔ جن مضامین پر مولوی چراغ علی مرحوم نے قلم اُٹھایا ہے اُس پر اور بھی بہت سے لکھنے والے پیدا ہو گئے ہیں اور زمانۂ آئندہ اس سے بھی بہتر لوگ پیدا کر یگا۔ لیکن ایسے دُھن کے پکے، دُنیا و مافیہا سے بے خبر اور اپنے کام میں ہمہ تن محو، مشکل سے پیدا ہوں گے۔"

(از جریدۂ اعلامیہ احکام سرکار نظام الملک آصف جاہ، جلد ست و ششم نمبر چہل و یکم مطبوعہ ہفدہم امرداد ماہ الٰہی ۱۳۰۵ ف مطابق سی ام ذی الحجہ ۱۳۱۲ھ

"نواب مدار المہام سرکار عالی نے نہایت درجہ افسوس کے ساتھ سُنا کہ مولوی چراغ علی صاحب اعظم یار جنگ بہادر معتمد مال و فینانس سرکار عالی نے بتاریخ ہشتم امرداد ۱۳۰۴ف یوم یکشنبہ بمقام بمبئی جہاں وہ علیل ہو کر بغرض علاج و تبدیل آب و ہوا گئے تھے، انتقال کیا۔ مرحوم ایک نہایت لائق کارگزار، واقف کار، ذی علم، مستقل مزاج، اور سنجیدہ عہدہ دار تھے۔ نواب مدار المہام سرکار عالی مکرر اظہار افسوس کرتے ہیں کہ طبقۂ عہدہ داراں میں سے مولوی چراغ علی صاحب مرحوم کے ایسے منتخب اور برگزیدہ شخص کے انتقال سے سرکار کو درحقیقت بہت نقصان پہنچا۔" (صفحہ ۳۹۵ نشان ۱۶۴)۔

(از تہذیب الاخلاق علی گڑھ) سلسلہ سوم جلد دوم۔ مطبوعہ یکم محرم الحرام ۱۳۱۳ھ)۔

"افسوس! ہزار افسوس! صد ہزار افسوس! کہ پندرھویں جون ۱۸۹۵ء کو نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی نے بمقام بمبئی چار ہفتہ کی بیماری میں انتقال کیا۔ اُن کا خط خود اُن کے ہاتھ کا

لکھا ہوا مورخہ نہم جون مقام حیدرآباد سے ہمارے پاس آیا تھا، جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ تین ہفتہ سے بیمار ہوں، ڈاڑھ کے نیچے ایک گلٹی نکلی ہے، ڈاکٹروں نے اس اندیشہ سے کہ مغز میں ورم نہ ہو جائے کلورفارم کا عمل کر کے کاٹا اور بعد میں پھر دوبارہ کلورفارم کا عمل کیا بہت ہی کمزور ہو گیا ہوں، کھاتا پیتا نہیں، چلنا پھرنا موقوف، مگر اب زخم بھرتا چلا آتا ہے، اور ارادہ ہے کہ تبدیل آب و ہوا کے لئے بمبئی جاؤں۔ اس کے بعد بارھویں جون کا بمبئی سے اُنہیں کا بھیجا ہوا تار ہمارے پاس آیا کہ میں بمبئی آ گیا ہوں۔ افسوس کہ پندرھویں تاریخ کو جب کہ ہم بعض کاغذات اُن کے نام روانہ کر رہے تھے اور خیر و عافیت چاہ رہے تھے، اُسی وقت انہوں نے بمبئی میں انتقال کیا۔

مولوی چراغ علی مرحوم ایک بے مثل اور مرنج و مرنجان شخص تھے۔ ہمارے کالج کے ٹرسٹی اور بہت بڑے معاون تھے، حیدرآباد میں سالار جنگ اعظم نے اُن کو بُلایا تھا۔ اس زمانے سے اس وقت تک متعدد انقلابات حیدرآباد میں ہوئے اور پارٹیاں بھی قائم ہوئیں مگر اُن کو بجز اپنے کام کے کسی سے کچھ کام نہ تھا۔ اُن کو بجز اپنے کام یا علمی مشغلے کے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ حیدرآباد میں یا دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔

متعدد علوم میں نہایت اعلیٰ درجہ کی دستگاہ تھی۔ عربی علوم کے عالم تھے۔ فارسی نہایت عمدہ جانتے تھے اور بولتے تھے، جبری و کالڈی میں نہایت اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ لیٹن اور گریک بقدر کارروائی جانتے تھے۔ اعلیٰ درجہ کے مصنف تھے۔ انگریزی زبان میں بھی انہوں نے کتابیں تصنیف کی ہیں۔ مذہب اسلام کے ایک فلاسفر حامی تھے۔ ہمارے بڑے دوست تھے۔ ایسی خوبیوں کے شخص کا انتقال کرنا ایسے زمانے میں کہ انکی عمر کچھ زیادہ بھی نہ تھی نہایت افسوس و رنج کے لائق ہے (انا للہ وانا الیہ راجعون) افسوس ہے کہ وہ مضمون اور لاحل سوال کا جواب جو انہوں نے تہذیب الاخلاق میں لکھنا چاہا تھا ناتمام رہ گیا، اور اب امید نہیں کہ کوئی شخص اس لاحل سوال کو حل کرے گا۔"

مرحوم کے انتقال پر بہت سی تاریخیں لوگوں نے کہیں۔ اُن میں سے

چند یہاں لکھی جاتی ہیں۔

سید محمود مرحوم (خلف سر سید رح) نے بھی جو فارسی صنائع میں تاریخ کی صنعت کو بہت پسند کرتے تھے یہ تاریخ نکالی۔

حیف چراغ علی از دنیا نہاں شد

۱۸۹۵

مولانا حالی مدظلہ العالی نے اسے نظم میں اس طرح موزوں فرمایا ہے۔

زخمے از مرگ چراغ علی آمد بر دل   کہ از و خاطر افگار بصد غم شد جفت
از خرد سال وفاتش چو بجستم "محمود"   "شد نہاں حیف چراغ علی از دنیا" گفت

مولانا حالی نے خود بھی ایک قطعہ مرحوم کی وفات پر لکھا ہے، جس میں گویا مرحوم کے کام اور کیریکٹر کی کامل تصویر کھینچ دی ہے۔ وہ یہ ہے

آہ آہ! از رحلت بیگاہِ اعظم یار جنگ   کز میانِ رہ ز ہمراہان عنان پیچید و رفت
حیف دنیا را بہ پنجاہ سالگی کردہ وداع   بزم ما را بزم ماتم بازگردانید و رفت
مستفیدان پُر نہ کردہ دامن معنی ہنوز   مشتی از گنجینۂ لعل و گہر پاشید و رفت
از سحاب فیض کلکش ناشدہ سیراب خلق   ساعتی برق ایمانی از افق تابید و رفت
عقدہا نکشودہ ماند و نکتہ ہا ننوشتہ ماند   بہر جوی شیر کوہ بی ستون کندید و رفت
کرد بی آزارِ خلق اعمالِ سلطانی ادا   نے ز کس رنجیدنی کس را برنجانید و رفت
یاوران قوم را تا زیست یاور بود و یار   ہر چہ بتوانست در تائید شان کوشید و رفت
از دل پُر درد او گاہی صدای برنخاست   مدتی چون بحر کاہل در نہان جوشید و رفت
طبع از ادش بہر ملت کہ بینی صُلح داشت   در دلِ خویش و دلِ بیگانہ در گنجید و رفت
گر نہ دید صد سال کس انجام او مرگست و بس   چوں شرر بر وضعِ دوران ہیچ و ان خندید و رفت

مولوی محمد اعظم صاحب چریا کوٹی نے بھی جو ایک عالم شخص ہیں اور ایک

زمانے تک حیدرآباد میں ملازم تھے اور اب وظیفہ یاب حسن خدمت ہیں، ایک اچھا قطعہ تاریخی لکھا ہے، جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے: ـــ

آں گرامی معتمد کز حسن رایش بید رنگ
یافت آرے در دکن مال و خزانہ آب و رنگ

محکم اخلاص دلی با ملت اسلام داشت
در معیشت بود در فتارش بر آداب فرنگ

علم را جو ہر شناسے، قدر دانِ اہل علم
طالبِ حکمت نگہدارندہ آئین ہنگ

با علوِ فکر نش مرغِ ہما برکندہ بال
عقل کل در مرغزار جو دتش آہوی لنگ

با سبک روحی متینی بود چون کوہ گران
کلک او در دشتِ معنی برق رفتاری بہ تنگ

بہر معنیہا دلش دریای گوہر خیز بود
وقت گویائی دہانش بود شکر باد تنگ

شد نمایاں ناگہاں از گوشۂ رخسارِ او
دانۂ ریش قضا چیزی کم از قدر خشنگ

بارہا از بہر اصلاحش بر و نشتر زدند
تا شد از نشتر زنیہا کار بر بیمار تنگ

رفتہ رفتہ شد بس ابتر حال او در چند روز
بود گویا صورتِ تصویر بر پشت پلنگ

عاقبت بے وقت مرگ از گلشنِ گیتی ربود
آنچنانش کز کمین ساحل نشینان را نہنگ

الغرض چوں رخت ہستی بست از دنیای دون
ہاتفی گفت از جلالی، وای اعظم یار جنگ
۱۳۱۲ھ

سید محمد واحد علی صاحب کاکوروی نے بھی مرحوم کی دو تاریخیں، ایک سنہ عیسوی میں دوسری ہجری نبوی میں کہی تھیں۔ جو یہ ہیں: ـــ

۱ ـــ ہاتفی گفت از سر افسوس
گوہرِ شب چراغ بود نماند
۱۸۹۵ع

۲ ـــ ہائے اعظم یار جنگ ـــ
۱۳۱۲ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ عظم الکلام فی ارتقاء الاسلام



غدر ۱۸۵۷ء سے مسلمانانِ ہند کی حالت میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہوا۔ اگرچہ اقبال کبھی کا منہ موڑ چکا تھا۔ لیکن پھر بھی برائے نام باریک سا پردہ آنکھوں کے سامنے حائل تھا۔ اس پردہ کے اٹھتے ہی ادبار کی بھیانک اور مہیب تصویر نظروں کے آگے پھر گئی۔ رسی کے جلنے پر بھی بل ویسے ہی رہتے ہیں، نشہ اتر جانے پر بھی خمار کا اثر باقی رہتا ہے سب کچھ چھن جانے پر بھی غفلت وہی رہی۔ فرداً فرداً سب اپنی قسمت کے شاکی اور اپنے حال پر نالاں تھے لیکن بدبخت قوم کے حالِ زار پر کسی کو نظر نہ تھی اور جو کسی کے دل میں درد اٹھا بھی تو اتنی ہمت اور سکت کہاں تھی جو اس پر آشوب اور تاریک زمانے میں

جب کہ ہر طرف یار و اغیار مُنہ کھولے بیٹھے تھے، اور زمین و آسمان دشمن ہو رہے تھے اپنے اور اپنے بھائیون کے لئے ہاتھ پاؤن مارے۔ قومیت کا خیال سالہا سال سے مٹ چکا تھا؛ اخوت اور محبت کے اثر دلون سے محو ہو چکے تھے، البتہ مذہب سے محبت ضرور تھی، مگر وہ بھی نادان دوست کی محبت سے زیادہ نہ تھی۔ حکومت جا چکی تھی؛ اقبال مُنہ موڑ چکا تھا، دولت سے بہرہ نہ تھا؛ علم پاس نہ تھا؛ اغیار تو اغیار خود یار و مددگار جان کے لیوا تھے، آفات کا نزول تھا، ادبار کی چڑھائی تھی۔ ایسے اڑے وقت پر، ایسے نازک زمانے میں، ایسے ہنگامۂ رُستخیز میں جب کہ نفسی نفسی کا عالم اور عزت و غیرت کا ماتم بپا تھا؛ اپنے بھائیون کے کام آنا عین جوان مردی اور اصل انسانیت ہے۔

چیست انسانی؟ تپیدن از تپ ہمسائیگان۔ وز سموم نجد در باغ عدن بریان شدن

مسلمانون کی حالت اس وقت اس بے سرو سامان اور لُٹے قافلہ کی سی تھی جو ایک لق و دق صحرا میں جا نکلا ہے، جہان راستہ کا نشان گم ہے۔ زاد راہ مفقود ہے، ہر طرف سے طوفان بپا ہے۔ مگر اس پر بھی ایک دوسرے سے لڑتے مرتے ہیں اور نفسانیت پر تلے ہوئے ہیں، لیکن ان میں سب سے زیادہ غافل اور لایعقل ان کے رہبر و رہنما ہیں۔ اس بُرے وقت میں انہیں میں سے ایک بندۂ خدا اٹھتا ہے، جو انہیں راستہ دکھانے اور کھوئی دولت کا نشان بتانے پر آمادہ ہوتا ہے، اہل قافلہ اس پر ہنستے اور اُسے بے وقوف بناتے ہیں۔ اور جب یہ بڑھ کر ان کے راہ گم کردہ اور رہ گم راہ کُن

رہنما اس کے دشمن ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ آپس کے لڑائی جھگڑے چھوڑ اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ اس پر طرح طرح کی بدگمانیاں کی جاتی ہیں۔ اس کی محبت کو عداوت، اس کی ہمدردی کو بدخواہی اس کی دل سوزی کو خودغرضی پر محمول کیا جاتا ہے، وہ جوں جوں ان کی دل دہی کرتا ہے اوہ اس سے اور بدکتے ہیں، وہ جوں جوں اُن کی فلاح وبہبودی کی کوشش کرتا ہے وہ اور اس سے بدظن ہوتے ہیں۔ ایک عرصہ تک اس کی صدا صدا بہ صحرا اور اس کی بے ریا کوشش سعی لاحاصل رہی۔ لیکن آخر اسکی صداقت نے فتح پائی۔ اسکے خلوص نے سب کو قائل کر دیا۔ اُسکی بے ریائی نے خودغرضیوں کے طلسم کو توڑ دیا اور زمانے نے خود کھوٹے کھرے کو پہچان لیا۔ جھوٹ کو زک ہوئی اور میدان سچ کے ہاتھ رہا۔ جاء الحق وزہق الباطل۔

وہ کوئی انوکھا شخص نہ تھا۔ وہ ہمیں میں سے تھا۔ ہماری ہی سوسائٹی میں اس نے پرورش پائی تھی۔ وہ کوئی عالم وفاضل نہ تھا، مالدار اور دولت مند نہ تھا، صاحب جاہ ذی اثر نہ تھا، وہ ہر لحاظ سے ایک معمولی آدمی تھا لیکن ہاں اسے ایک دل ملا تھا۔ جس میں درد تھا اور واقعات سے متاثر ہونے کی صلاحیت تھی۔ لیکن کیا کسی اور کے دل میں درد نہ تھا، ہوگا۔ اور ممکن ہے کہ اس سے زیادہ ہو۔ لیکن اگر نرا درد ہی درد ہوا تو پھر انسان اس کے جذبہ اور زور میں اپنے تئیں نہیں سنبھال سکتا وہ آپے سے باہر ہو جاتا اور کپڑے پھاڑ کر دیوانے نکل جاتا ہے یا ایسا مخواسر ہو جاتا ہے کہ اس کی نوبت خبرش یا زنیا مد تک پہنچ جاتی ہے، مگر اس درد کے ساتھ اُسے

دماغ بھی ویسا ہی عطا ہوا تھا۔ درد اس میں حرکت اور اشتعال پیدا کرتا تھا اور عقل اس کی تحریک پر اسے سیدھے راستہ سے بھٹکنے نہیں دیتی تھی۔ یہی ایک سچے مذہب اور خصوصاً اسلام کی تعلیم کا حاصل ہے کہ انسان نہ تو جذبات ہی سے ایسا مغلوب ہو جائے کہ دنیا کے کام کا نہ رہے اور نہ درد سے خالی عقل ہی کا بندہ ہو جائے کہ ایک بگولے کی طرح دنیا میں مارا مارا پھرے۔ اس لئے ایسے نازک وقت میں قوم کو سنبھالنا ایک ایسے ہی شخص کا کام تھا جس کے سینہ میں درد بھرا دل ہو اور اس کے ساتھ ہی روشن دماغ رکھتا ہو۔ ریفارمر اور مجتہد ہونے کا حق ایسے ہی شخص کو حاصل ہے۔

آج یہ اسی کا طفیل ہے کہ ہم مسلمانوں میں ایک حرکت سی دیکھتے ہیں اسی نے ہمیں قومیت اور ہمدردی کا سبق پڑھایا۔ اسی نے ہمیں علم سیکھنے کا شوق دلایا۔ اسی نے ہمیں اپنے مذہب کی حقیقت سے واقف کیا اور دین و دنیا کو ساتھ ساتھ لے چلنے کی تعلیم دی۔

باوجود ان تمام بیش بہا اور بے نظیر خدمات اور احسانات کے جو سرسیدؒ نے اپنی قوم پر کئے اس نے اپنی مثال سے دنیا میں پھر ایک بار ثابت کر دیا کہ علم و فضل دستار فضیلت میں نہیں، حکمت و دانش یونیورسٹی کی ڈگریوں میں نہیں، لیاقت و قابلیت امتحان سے حاصل نہیں ہوتی۔ اور اگر بالفرض یہ سب کچھ ہو بھی تو کیا وکیا کتابوں کے تودے اور عمامہ فضیلت کے وزن سے انسان انسان بنتا ہے؟ نہیں بلکہ

کچھ اور ہر کہ بھی استادہ چاہیئے

بعض "حاملان اسفار" اب تک اسی خام خیالی میں پڑے ہوئے ہیں کہ ایسے شخص کو جس نے کبھی باقاعدہ نصاب نظامیہ پڑھ کر فضیلت کی دستار حاصل نہیں کی، کیا حق حاصل تھا کہ وہ تفسیر لکھے، یا جس نے کبھی علوم کی تحصیل کی نہیں اس کو علوم کی اشاعت اور اس کے متعلق رائے دینے کا کیا منصب تھا۔ لیکن ان کو کولھو کے چکر سے باہر نکل کر اور آنکھوں پر سے اندھیری اُٹھا کر ذرا دنیا کو دیکھنا چاہیئے۔

لیکن بڑی مشکل یہ تھی کہ قوم میں ایک خرابی نہ تھی کہ جس کی اصلاح کیجائے کوئی ایک بیماری نہ تھی جس کا علاج ہو۔ اس کی کوئی کل بھی سیدھی نہ تھی اور سر سے پاؤں تک رگوں بھری تھی۔ یہ اسی کا دل و دماغ تھا کہ ہمت نہ ہارا اور ہر خرابی کا مقابلہ کرنے کے لئے آمادہ ہوگیا۔ وہ اس دُھن میں ایسا لگا کہ اپنے آپ کو بھول گیا۔ یہ جہاد کا وقت تھا۔ اور اس نے جہاد کیا۔ اور جہاد بھی کیا جہاد اکبر۔ یہاں اس کے بے مثال احسانات گنوانا ایک قصہ طویل ہوجائیگا مختصر یہ کہ اگرچہ اُس نے ہر قسم کی اصلاحات پر کمر باندھی، لیکن اس کی دوربین نظر نے یہ بھی دیکھ لیا کہ جہاں مسلمان عزت و حکومت، علم و دولت کھو چکے ہیں، وہاں وہ اپنے سچے مذہب کو بھی فراموش کر چکے ہیں۔ اور یہی تمام خرابیوں کی جڑ اور سارے فساد کی اصل ہے۔ چنانچہ اس نے جان توڑ کر اس خرابی کا مقابلہ کیا۔ اور اپنی ساری ہمت و قوت اس میں صرف کر دی۔

دنیا کبھی ایک حالت پر نہیں رہتی، اس کی نیرنگیاں کبھی کم نہیں ہوتیں، اور ہمیشہ کسی نہ کسی نئے دور کا نزول و شور رہتا ہے۔ اسی زمانے میں

بھی یورپ میں علم وحکمت کا وہ سیلاب آیا کہ اس نے پچھلے دور دن پر پانی پھیر دیا۔ اس میں شک نہیں کہ جب کسی خاص زمانے میں کسی خاص طرف میلان ہوتا ہے تو اس میں مبالغہ بھی بے حد ہو جاتا ہے۔ لیکن حقیقت بھی بہت کچھ ہوتی ہے۔ اور اس لئے انسان کی گذشتہ کوششون کے مقابلہ میں اس خاص لحاظ سے بہت بڑی ترقی ہو جاتی ہے اور اس کے اثر سے بڑے بڑے تغیر اور انقلاب ہوتے ہیں۔ فلسفہ اور مذہب کا بیر قدیم سے چلا آرہا ہے اب اس دور میں سائنس نے نیا چولا بدلا اور سارے عالم میں کھلبلی مچا دیکا تو اول اول اہل مذاہب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور اس کی عالمگیر اور حیرت انگیز ترقی دیکھ کر ششدر سے رہ گئے۔ مگر پھر وہ سنبھلے اور سنبھل کر اپنے بچاؤ کی فکر کرنے لگے مگر یہہ ترقی یافتہ اقوام کی حالت تھی۔ لیکن وائے بر آن قوم جس پر جہالت اور تعصب چھایا ہوا ہو۔ جس کے مجتہد اور مصلح اپنے مقتدیون سے زیادہ ناواقف اور جاہل ہون! ہمارے علما کی حالت اس وقت اصحاب کہف کی سی تھی، وہ اپنے ساتھ ساری دنیا کو وہیں سمجھ رہے تھے جہان وہ تھے زمانہ کا تغیر اور اس دور کی خصوصیت ان کی سمجھ ہی میں نہیں آتی تھی اور آئے تو کیون کر؟ جو یہہ سمجھے کہ رات کو سویا اور صبح ہوتے ہوتے اُٹھ کھڑا ہوا اُسے کوئی کیون کر سمجھا سکتا ہے کہ اس اثنا میں کئی صدیون کا پھیر پڑ گیا ہے اور زمانہ میں ایک نیا دور شروع ہو گیا ہے۔

یہان آلات حرب سرے سے بدل گئے ہیں اور ہم ہیں کہ اپنی بوسیدہ تلوار، ڈھال اور تیر و ترکش سنبھالے مقابلہ کے لئے چلے جا رہے ہیں۔ اور

چونکہ غنیم کی قوت کا اندازہ نہیں ہے اس لئے اسے بے حقیقت سمجھتے ہیں اور اپنی قوت پر نازاں ہیں۔

سرسید رح نے دیکھا کہ اور تو ہم سب کچھ کھو چکے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ عزیز مذہب بھی ہاتھ سے جاتا رہے۔ اور ہم کہیں کے نہ رہیں) وہ مذہب کی قوت اور اثر سے خوب واقف تھا اور جانتا تھا کہ ہم مذہب ہی کے بل پر دنیا میں اُٹھے تھے اور اب بھی اگر سنبھلے تو اسی کے سہارے سے سنبھلیں گے۔ اور اس لئے اپنی تمام اصلاحوں کی بنیاد مذہب پر رکھی) اور ساتھ ہی ان تمام توہمات باطلہ کے مٹانے کی کوشش کی جو مسلمانوں کی غلطی سے مذہب کا جزو بن گئے تھے اور ان تمام الزامات کو نہایت تحقیق اور شد و مد کے ساتھ رفع کیا جو اس نئے زمانہ میں اسلام پر ہر طرف سے وارد ہو رہے تھے۔ اس نے ان الزامات کا جواب ملّانوں کی طرح کج بحثی سے نہیں دیا بلکہ اس نے اس کے لئے ایک نئے علم کلام کی بنیاد ڈالی۔ کیونکہ پرانے ہتیار بے کار ہو چکے تھے۔ اور اس دم دعوی کے ساتھ اسلام کی حقانیت ثابت کی جس کی نظیر اسلام کی تاریخ میں نہیں ملتی اس کام میں بعض اور بندگان خدا نے بھی جو اسلام سے محبت رکھتے تھے سرسید رح کا ہاتھ بٹایا۔ اور جس عظیم الشان کام کو سرسید نے انجام دیا تھا۔ اسی کی پیروی میں بھی ان لوگوں نے اپنی اپنی بساط کے موافق اسلام کی خدمت کی۔ ان سب میں زیادہ محقق، وسیع النظر اور زبردست مصنف، مولوی چراغ علی (نواب اعظم یار جنگ بہادر) مرحوم تھے ان کی تقریباً تمام تصانیف اسلام کی

حمایت میں ہیں، ان کتابوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کا مطالعہ کس قدر وسیع اس کی نظر کیسی غائر اور اس کی تحقیق کس پایہ کی تھی۔ وہ لفاظی اور عبارت آرائی کچھ نہیں جانتے اور نہ ان کو فصاحت و بلاغت سے کچھ سروکار ہے، جیسا کہ اکثر مذہبی تصانیف کے مصنفین کا قاعدہ ہے مگر ان کی کتابیں معلومات علمی سے لبریز ہیں۔ واقعات کی تنقید و تنقیح، صحیح نتائج کے استخراج میں انہیں کمال حاصل ہے۔ وہ کبھی اپنی بحث سے الگ نہیں ہوتے، کبھی کوئی غیر متعلق بات نہیں کہتے اور نہ کبھی الزامی جواب دیتے ہیں۔ بلکہ امر زیر بحث کو ہمیشہ مد نظر رکھتے اور اس کے مالہ و ماعلیہ پر ایک وسیع نظر ڈالتے ہیں، تمام واقعات متعلقہ کو جمع کر کے اُن کی تنقید کرتے اور حتی الامکان قرآن مجید سے استدلال کرتے اور نہایت صحیح اور عجیب نتائج استنباط کرتے ہیں اور اسی ضمن میں وہ بڑے بڑے مستند لوگوں کی رایوں کو پیش کرتے ہیں یا اُن کی غلطیوں پر نظر ڈالتے جاتے ہیں۔ غرض یہ کہ جس بات کو وہ لیتے ہیں اس پر اس خوبی اور جامعیت سے بحث کرتے ہیں کہ پھر اس میں کسی اور اضافہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ البتہ ایک کسر ان کی مذہبی تصانیف میں ضرور نظر آتی ہے اور وہ یہ کہ ان کی تحریر میں گرمی نہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ سرد مہر منطقی ایک ایسے بحث پر جس سے اُسے دلچسپی ہے بحث کر رہا ہے۔ اور واقعات اور دلائل و براہین پیش کر کے بال کی کھال نکال رہا ہے حالانکہ مذہب کو منطق و استدلال سے اتنا تعلق نہیں جتنا کہ انسان کے جذباتِ لطیفہ یا وجدانِ قلب سے ہے اور اس لئے مذہب پر بحث

کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان رسمی قیود سے باہر نکل کر نظر ڈالے اور اس میں وہ جوش اور حرارت ہو جو ایک سرد مہر منطقی یا ایک کالئیاں دینا دار میں نہیں ہوسکتی۔ لیکن معلوم یہ ہوتا ہے کہ مولوی صاحب مرحوم کو نہ تو مذہب کے اس حصے سے بحث تھی اور نہ وہ غالباً اس بحث کے اہل تھے۔ بلکہ ان کا مقصد مذہب کے صرف اس حصہ سے تھا جس کا تعلق امور دنیا سے ہے اور یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ مذہب اسلام کسی طرح انسان کی دنیاوی ترقی کا مانع نہیں بلکہ اس کا ممد و معاون ہے اور جو لوگ اس کے مخالف ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ اور کچھ شک نہیں کہ اس میں مولوی صاحب مرحوم کو پوری کامیابی ہوئی ہے۔

ان کی مذہبی تصانیف کی تفصیل یہ ہے۔

ا۔ تعلیقات۔ یہ رسالہ پادری عمادالدین آنجہانی کی کتاب تاریخ محمدی کے جواب میں ہے۔ مرحوم نے اس رسالہ میں اس امر کو ثابت کرکے دکھایا ہے کہ پادری صاحب کے ماخذ سب کے سب غلط اور پوچ ہیں۔ اور ایسی کم زور بنیاد پر اعتراضات کی عمارت کرنا خلاف دانشمندی ہے اسی ضمن میں احادیث کی تنقید اور صحت و غیر صحت پر بحث کی ہے۔ اور بعض منصف مزاج یوربین فاضلوں کی رایوں کا اقتباس بھی درج کیا ہے۔ نیز مسیح و اناجیل اربعہ پر تفصیلی رد و قدح کی ہے۔ اور یہ ثابت کیا ہے کہ مسیح کی سوانح عمری نہایت غیر معتبر ہے۔ اور چاروں انجیلیں تاریخی اعتبار سے گری ہوئی ہیں۔ (مطبوعہ لکھنو ۱۸۸۸ء)

۲ - تحقیق الجہاد - یہہ کتاب انگریزی زبان میں ہے اور بڑے معرکہ کی کتاب ہے - عیسائیون کی طرف سے اسلام پر یہہ بہت بڑا اعتراض کیا گیا ہے کہ یہہ مذہب جہاد کے ذریعہ یعنے بزور شمشیر دنیا میں پھیلایا گیا ہے - مرحوم نے نہایت خوبی اور بسط کے ساتھ جہاد کی حقیقت اور ماہیت پر بحث کی ہے - اور یہہ ثابت کیا ہے کہ آنحضرت صلعم کے زمانہ میں جو لڑائیاں ہوئیں اوہ تمام حالت مجبوری میں اور اپنے بچاؤ کے لئے تھیں ان سے ہرگز اسلام کا بجبر پھیلانا یا کفار کا قتل کرنا مقصود نہ تھا - اس ضخیم کتاب میں یہہ بحث اس شرح وبسط اور تحقیق وتدقیق کے ساتھ کی گئی ہے کہ آج تک کسی نے اس مسئلہ پر اس خوبی کے ساتھ بحث نہیں کی تھی - تمام بڑے بڑے یوروپین مصنفین مثلاً سر ولیم میور، ڈاکٹر اسپرنگر، مارکس ڈاڈ - ہیوسیس، ڈاکٹر سیموئل رین، باسورتھ اسمتھ وغیرہ نے جو اس بحث پر تحریریں لکھی ہیں، ان کے اقوال نقل کرکے اُن پر تنقید کی ہے اور ان کی غلطیاں دکھائی ہیں - مرحوم کی یہہ کتاب درحقیقت نہایت قابل قدر ہے - اور کہا جا سکتا ہے کہ یہہ کتاب دنیا میں اپنی نوعیت اور طرز کی ایک ہی کتاب ہے -

۳ - ریفارمز انڈر مسلم رول - اس کتاب کے متعلق ہم آخر میں مفصل بحث کرینگے

۴ - محمد دی ٹرو پرافٹ - (محمد صلعم پیغمبر برحق ہیں) یہہ کتاب بھی انگریزی زبان میں ہے اور مرحوم کی تصانیف میں بڑے پایہ کی ہے - اس کتاب میں آنحضرت کی نبوت اور کیرکٹر کے متعلق تمام شکوک اور اعتراضات

عالمانہ اور محققانہ تحقیق سے رقم کیا ہے۔ اور بڑے زور شور سے
اس امر کو ثابت کیا ہے کہ محمد صلعم پیغمبر برحق ہیں۔

افسوس ہے کہ یہہ کتاب ابتک کامل نہیں ملی، کچھ کچھ مطبوعہ حصے
کہیں کہیں سے دستیاب ہوئے ہیں۔ نہ یہہ معلوم ہوا کہ یہہ کتاب
طبع کہاں ہوئی تھی۔ خود مرحوم کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مسودے بھی
موجود ہیں مگر وہ بھی کسی قدر ناقص ہیں۔ یہہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ایک بار
یہ کتاب کسی وجہہ سے چھپتے چھپتے رہ گئی تھی اور مصنف نے دوبارہ
بعد ترمیم واضافہ کے چھپوائی، چنانچہ ہمارے پاس ہر دو طبع کے پروف
موجود ہیں اگر کسی صاحب کے پاس یہہ کتاب کامل موجود ہو تو اس
قابل ہے کہ چھپوادی جائے ورنہ کم سے کم اس کا ترجمہ ضرور طبع کر دیا
جائے۔ آج کل کے زمانہ میں اور خاص کر تعلیم یافتہ نوجوان مسلمانوں
کے لئے ایسی کتابوں کی بہت سخت ضرورت ہے۔

۵۔ اسلام کی دینوی برکتیں۔ اس رسالہ میں مرحوم نے یہہ ثابت کیا ہے کہ
اسلام دنیا میں کن کن برکات کے نزول کا باعث ہوا ہے۔ اور اہل عالم کو اس
سے کیا کیا نعمتیں حاصل ہوئی ہیں۔ یہہ کتاب پنجاب میں کئی بار طبع ہو چکی ہے بہت
دلچسپ اور مفید کتاب ہے۔

۶۔ قدیم قوموں کی مختصر تاریخ۔ ایام الناس ایک اردو کا چھوٹا سا رسالہ ہے قرآن مجید پر
ایک یہہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس میں بعض ایسی قوموں کا ذکر ہے جن کا دنیا میں کبھی وجود نہ
تھا اور یہہ قصے بے بنیاد قصے اور افسانے ہیں مرحوم نے بحیثیت غیر مشتبہ تحقیق بیانات اور کاوش سے ان

اقوام کا تاریخی ثبوت بہم پہونچایا ہے اور قدیم یونانی اور عبرانی کتابوں سے مدد لی ہے۔ اور ثبوت میں ان قدیم مورخوں کی تاریخوں کو پیش کیا ہے جنمیں ثمود و عاد کا ذکر ہے اور وہ سب نزول قرآن پاک سے کئی صدیوں پیشتر کی تصنیف ہیں۔ یہ رسالہ صرف ایک دفعہ طبع ہوا ہے اب نہیں ملتا۔

مرحوم نے کئی رسالے مثلاً بی بی ہاجرہ۔ ماریہ قبطیہ۔ تعلیق نیاز نامہ وغیرہ ناتمام چھوڑے لیکن ان سب سے زیادہ قابل قدر اور بے مثل کتاب "العلوم الجدیدۃ والاسلام" ہے جسے وہ اپنی آخری عمر میں لکھ رہے تھے۔ اور جس کا ابتدائی حصہ تہذیب الاخلاق سلسلہ جدیدہ کی جلد دوم کے ابتدائی پرچوں میں چھپ چکا تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ اُن کی بے وقت موت نے اس بے نظیر کتاب کو پورا نہ ہونے دیا یہ کتاب درحقیقت مصنف نے سرسید مرحوم کے ایک سوال کے جواب میں لکھنی شروع کی تھی۔ اس کی پوری حقیقت ظاہر کرنے کے لیئے ہم یہاں سرسید مرحوم کا وہ خط نقل کرتے ہیں جس میں اُنہوں نے اس تصنیف کے موضوع پر بحث کی ہے۔

نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی صاحب کو جو مضمون لکھنا ہے وہ نہایت ہی مشکل اور نہایت دلچسپ اور نہایت مفید و بکار آمد ہے۔ ابھی تک اُنہوں نے صرف تمہید ہی تمہید لکھی ہے۔ فلسفہ کے طرقہ اول اور مخالفوں کا حال لکھا ہے ان کے نام اور ان کا زمانہ بتایا ہے۔ پھر علماء اسلام میں جو بڑے بڑے فلسفی

گزرے ہیں ایک ایک کو گنایا ہے۔ اس کے بعد اب وہ اصل مضمون کی تحریر پر متوجہ ہونگے جس کو ہمارے ناظرین اخبار پڑھ کر امید ہے کہ تعجب کرینگے۔ نواب اعظم یار جنگ درحقیقت ایک لاحل سوال حل کرنے پر مستعد ہوئے ہیں معلوم نہیں کہ ہمارے ناظرین پرچہ کو اس کا کہ وہ کیا سوال ہے خیال ہے یا نہیں اس لیئے ہم سوال کو بطور یاد دہانی کے اس مقام پر چھاپتے ہیں تاکہ ان کو معلوم ہو کہ کیسا مشکل لاحل سوال ہے۔ اور اس کا جواب جو ہو وہ کیسا قابل توجہ اور ہماری قوم کے لیئے فائدہ مند ہوگا مدت سے یہ سوال کیا گیا ہے اور آج تک کسی نے اس کا جواب نہیں دیا خدا کرے کہ نواب صاحب ممدوح پورا اور قابل تشفی جواب دیں۔

سوال مذکور یہ ہے۔

اکثر لوگوں کی رائے میں یہ مسلم ہے کہ یورپین علوم و فنون کی تعلیم عقائد اسلام سے برگشتگی پیدا کرتی ہے اور اُن کی رائے میں اس کا علاج اُن علوم کے ساتھ دینی علوم کی اعلیٰ درجہ کی تعلیم دینا ہے۔ اگر یہ رائے صحیح ہے تو یورپین علوم و فنون کے ان مسائل اور اُن کے دلائل کو جو اس برگشتگی کا باعث ہیں بیان کرنا چاہیئے

اور اُن کتب دینیہ اور ان مقامات کا نشان دینا ضروری ہے جن کے تعلیم میں داخل کرنے سے اس برگشتگی کی روک ہو سکے مع اس بیان کے کہ کس وجہ سے وہ کتابیں اور مقامات روک ہو سکیں گی۔ اگر یہ رائے صحیح نہیں تو جہاں تک مفصل اور دلیل سے اس کی عدم صحت کا بیان ممکن ہو بیان کیا جائے۔"

(تہذیب الاخلاق جلد دوم نمبر ۲ مطبوعہ یکم ذی قعدہ ۱۳۱۲ھ)

اس کے بعد سر سید مرحوم نے اس کتاب کے متعلق تحریر فرمایا ہے کہ:۔

جس سوال کا جواب نواب اعظم یار جنگ بہادر کو لکھنا ہے۔ اس جواب کے قبل انہوں نے بہت سی تمہیدات قائم کی ہیں۔ ہم سے لوگ دریافت کرتے ہیں کہ اصل سوال کا جواب کب آئیگا۔ واضح ہو کہ نواب صاحب ممدوح کا ایک خط ہمارے پاس آیا ہے اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ ان کے جواب کے مضامین کی ترتیب کیونکر ہے ہم اس خط کو جہاں تک کہ ترتیب مضامین سے متعلق ہے ذیل میں چھاپتے ہیں۔"

انتخاب خط

وہ لکھتے ہیں کہ "چھٹی صدی تک کے حکماء اسلام کی فہرست بھیج دی گئی ہے (جو چھپ بھی گئی ہے) اس کے بعد تھوڑا سا ذکر اس انقلاب عظیم کا ہے جو ایشائی اسلامی دنیا میں چنگیز خاں کی طرف سے ہوا اور اس کی وجہ سے تصنیف و تعلیم علوم حکمیہ بند ہو گئی۔ اس کے بعد حال کے زمانہ تک کے اہل حکمت و منطق کی فہرست مختصر سی ہے اس کے بعد تصنیفات یعنی کتب مصنفۂ علوم حکمیہ و معقولات کا بیان ہے اس کے بعد اسلام میں مختلف فرقے پیدا ہونے کا ذکر ہے۔ اور معتزلہ اور دیگر متکلمین کے اسماء مذکور ہوئے ہیں۔ اس کے بعد کتب علم کلام و عقائد کی تفصیل ہے ان سب کے بعد اب اصل بحث آتی ہے کہ علم کلام و عقائد کے رو سے کون کون سا مسئلہ حکما و فلاسفہ کے خلاف ہے اور انہیں مسائل کے متعلق علوم جدیدہ میں ان کی تائید ہوتی ہے یا مخالفت۔ اور بتایا گیا ہے کہ علوم جدیدہ ان مسائل اختلافیہ میں علم کلام کی تائید میں ہیں اور علم کلام کے ذکر

کے قبل یہ میں لکھنا بھول گیا ہوں کہ علوم دینیہ کیا کیا ہیں اور وہ کہاں تک فلسفہ وحکمت کے اعتراضات کی تردید کر سکتے ہیں۔ فقہ و تفسیر و حدیث حکما کے مقابلہ میں کچھ کارآمد نہیں ہیں اور اس غرض سے علم کلام ایجاد کیا گیا تھا مگر اب وہ بھی مُفید و کارآمد نہیں رہا۔ اخیر پر اس سوال کا جواب ہے جو اس مضمون کی ابتدا میں تھا۔ اس کے بعد میں کچھ اس کا ذکر ہوگا کہ اب تک اس قسم کی کتابیں جن میں تطبیق بین الحکمتہ والاسلام ہوتی ہے کیا کیا تصنیف ہوئیں اور آیندہ کس قسم کی کتابیں تصنیف ہونی چاہئیں۔ غرض کہ یہ ایک مختصر سی کیفیت اور فہرست مضامین رسالہ ہے جو آپ کی اطلاع کے لئے عرض کی گئی۔ والسّلام۔

(تہذیب الاخلاق جلد دوم نمبر ۳ مطبوعہ
یکم ذیحجہ سنہ ۱۳۱۲ھ)

افسوس ہے اسی زمانہ میں مولوی چراغ علی مرحوم کا انتقال ہو گیا۔ جب سر سید کو نواب صاحب مرحوم کے انتقال کی خبر پہنچی تو اُنہوں نے تہذیب الاخلاق میں جو آرٹیکل اس حادثۂ جاں گزا پر لکھا ہے اس میں اس مضمون کے متعلق یہ تحریر فرمایا ہے۔

افسوس ہے کہ وہ مضمون اور لاحل سوال کا جواب جو

انہوں نے تہذیب الاخلاق میں لکھنا چاہا تھا، ناتمام رہ گیا
اور اب اُمید نہیں ہے کہ کوئی شخص اس لاحل سوال کو
حل کریگا۔
(تہذیب الاخلاق جلد دوم نمبر ۷ مطبوعہ
یکم محرم ۱۳۱۳ھ)

اس ناتمام رسالہ کے متعلق ہم نے کسی قدر تفصیل سے اس لئے بحث کی ہے کہ ناظرین کو اس مضمون کی اہمیت معلوم ہو جائے نیز یہ بھی ظاہر ہو جائے کہ مرحوم اس پایہ کے شخص تھے کہ اُن کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں میں کسی کو یہ ہمت نہ ہوئی کہ اس سوال کے جواب پر قلم اُٹھائے۔ اس کتاب کے ناتمام رہنے میں مرحوم کا کچھ قصور نہ تھا۔ یہ اللہ کی مرضی تھی کہ اُنہیں ایسے وقت میں اُٹھا لیا جب کہ انہیں ابھی بڑے بڑے کام کرنے تھے۔ اور افسوس کہ جن لوگوں کی نظریں اس اہم سوال کے جواب پر لگی ہوئی تھیں اُنہیں مایوس ہونا پڑا۔ علاوہ مذکورہ بالا تصانیف کے مرحوم کے متعدد رسالے مثلاً غلامی، تسری، تعدد ازدواج، ناسخ و منسوخ، ردشہادت قرآنی برکتب ربانی مصنفہ سرولیم میور وغیرہ دستیاب ہوئے ہیں جو بڑی محنت و تحقیق سے لکھے گئے ہیں۔ چونکہ اس مقدمہ کے لکھنے کے بعد ملے، لہذا انشاء اللہ پھر کسی وقت اس پر بحث کی جائیگی۔

اب ہم کتاب زیر دیباچہ یعنی "اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام" کے مجوزہ اصلاحات سیاسی و تمدنی و فقہی زیر حکومت اسلام" پر کسی قدر تفصیلی نظر ڈالتے ہیں۔

اس کتاب کا باعث تصنیف یہ واقعہ ہوا کہ انگلستان کے ایک پادری کینن ملکم میکال نے کن ٹمپورری ریویو بابت ماہ اگست ۱۸۸۱ء میں ایک مضمون اس عنوان سے لکھا تھا کہ "کیا زیر حکومت اسلام اصلاحات کا ہونا ممکن ہے" اس مضمون میں پادری صاحب نے اس بات پر زور دیا ہے کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو زمانہ حال کے بالکل نامناسب ہے اسلامی سلطنت میں کسی اصلاح کی توقع رکھنی فضول ہے کیونکہ اسلامی سلطنت درحقیقت الٰہی سلطنت ہے جس کے تمام قواعد خواہ مذہبی ہوں یا تمدنی دیوانی یا فوجداری سب خدا کے مقرر کئے ہوئے ہیں اور اس لئے اس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل ممکن نہیں۔ لہذا جب تک مسلمان مذہب اسلام کو ترک نہ کر دیں گے اس وقت تک وہ ترقی نہیں کر سکتے۔ پادری صاحب نے اس مضمون میں (نیز اپنے دیگر مضامین میں بھی) سخت تعصب، بے تمیزی، زبان درازی اور ناانصافی سے کام لیا ہے۔ ایسے روشن زمانے میں جب کہ یورپ میں علم و ہنر سائنس نے تعصب کے جنون کو بہت کچھ دھیما کر دیا ہے ایک ایسے عالم شخص کے قلم سے ایسے مضامین کا نکلنا ایک تعجب خیز امر ہے۔ خاص کر دولت عثمانیہ کے خلاف پادری صاحب نے بہت کچھ زہر اگلا ہے اور وہ ہرگز یہ نہیں چاہتے کہ اس کا وجود یورپ میں باقی رہے اس بارے میں وہ مسٹر گلیڈسٹون آنجہانی اور مسٹر اسٹیڈ اڈیٹر ریویو آف ریویوز کے ہم خیال ہیں۔ ریورنڈ موصوف کے اس مضمون کے جواب میں مولوی چراغ علی مرحوم نے یہ کتاب لکھی، اور درحقیقت نہایت پر زور

مدلل اور جامع کتاب لکھی ہے جس میں اُن تمام بڑے اعتراضات کا جواب آگیا ہے جو عموماً اور اکثر اسلام پر ہوتے آئے ہیں اور اب بھی ہوتے ہیں اب تک کسی شخص نے ان اعتراضات کا جواب اس طرز سے اور اس جامعیت کے ساتھ نہیں دیا تھا۔

اِس کتاب کو مصنف مرحوم نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے میں پولیٹیکل (سیاسی) اصلاحات کا ذکر ہے اور دوسرے حصہ میں سوشل (تمدنی) اِصلاحات کا اور کتاب کے شروع میں مصنف نے ۸۰ صفحات کا ایک مقدمہ لکھا ہے جو ایک محققانہ اور عالمانہ تحریر ہے۔

اِس سے قبل کہ ہم اس کتاب کے مضامین پر نظر ڈالیں ہم اس دھوکے کو اُٹھا دینا ضروری سمجھتے ہیں جو ناظرین کو "اصلاحات" کے لفظ سے پیدا ہوگا۔ مولوی صاحب مرحوم کا مقصد صرف اِس قدر ہے کہ اسلام ترقی اور اصلاح کا مانع نہیں ہے، اور خلیفہ وقت بلحاظ اقتضائے زمانہ پولیٹیکل اور سوشل امور میں جدید اصلاحات کے جاری کرنے کا مجاز ہے، اور جو لوگ اس کے مخالف ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ فلاں فلاں احکام مذہب کی رو سے مسلمان اس زمانہ میں ترقی نہیں کر سکتے، اُن کی احکام الٰہی و رسول کے حوالے سے تردید کی ہے۔ اُن کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ خدا و رسول نے ہرگز اس قسم کی اصلاحات کی مخالفت نہیں کی اور اُن کا ہونا ہر زمانے میں ممکن ہے اور بس۔ اب رہی یہ بحث کہ موجودہ زمانے میں مسلمانوں کو کن اسباب سے انحطاط ہوا، اور وہ کون سے ذرائع ہیں جو ان کی ترقی

باعث ہو سکتے ہیں، اس کتاب کے موضوع اور مولوی صاحب کے مقصد سے خارج ہے۔ اس زمانہ میں یہ سر سید احمد خاں، مولوی جمال الدین افغانی اور مصطفی کمال پاشا کا حصہ تھا، اور جن لوگوں کو اس بحث سے دلچسپی ہو وہ ان تینوں بزرگوں کے حالات اور اعمال کو ملاحظہ فرمائیں۔

کتاب کے مقدمہ میں مصنف نے فقہ کے مذاہب اربعہ و اصول فقہ پر بھی بحث کی ہے اور اس امر کو ثابت کیا ہے کہ علم فقہ محض ایک ظنی علم ہے اور اس میں آب و ہوا، رسوم و عادات، انسانی خواہشات و ضروریات سیاسی و تمدنی حالات و معاملات کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ اور ایک حد تک انہیں امور کے اختلاف کی وجہ سے مذاہب فقہ میں اختلاف پیدا ہوا۔ علاوہ اس کے بانیان مذاہب فقہ نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا اور نہ کر سکتے تھے کہ ان کا اجتہاد قطعی ہے اور اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اُن کو کوئی حق نہ تھا کہ وہ آیندہ آنے والی نسلوں کو اپنے اجتہادات کا ایسا ہی پابند کر دیں جیسا کہ اپنے زمانے کے لوگوں کو۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف زمانوں میں ایک ہی مسئلہ پر مختلف فتوے دیئے گئے ہیں اور اس اختلاف کی وجہ زیادہ تر اقتضاء و ضروریات زمانہ تھیں۔ مقلدین کا یہ کہنا کہ چار ایمۂ فقہ کے بعد کسی کو حق اجتہاد کا نہیں ہے کسی طرح قابل قبول نہیں ہے اکثر یورپین مصنفوں نے جو مقلدین کے اقوال کے مطابق اِن چار ایمۂ کے اجتہادات کو قطعی اور ناقابل تبدیل خیال کر کے اسلام کے متعلق استدلال کیا ہے وہ صحیح نہیں ہے مولانا بحر العلوم نے بہت بڑی اور

سچی بات کہی ہے کہ مقلدین کا یہ خیال سراسر حماقت ہے اور یہ لوگ ان میں ہیں جن کی نسبت حدیث پیغمبر صلعم میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ بغیر علم کے فتوے دیتے ہیں، خود گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو گمراہ کرتے ہیں اور وہ یہ نہیں سمجھتے کہ ایسا کہنا گویا علم غیب کا دعویٰ کرنا ہے جو سوائے خدا کے کسی کو نہیں۔"

اب فقہ کی بنیاد صرف چار چیزوں پر ہے۔ قرآن۔ حدیث۔ اجماع اور قیاس۔ قرآن کا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ وہ کوئی پولیٹیکل (سیاسی) اور سوشل (تمدنی) قانون یا ضابطہ ہے بلکہ اس کی اصل غایت قوم عرب میں نئی روح پھونکنی، قومیت کی شان پیدا کرنی اور دنیا کو اخلاقی و مذہبی تعلیم دینی تھی۔ لیکن چونکہ اس وقت عرب اور دنیا میں بعض ایسے قبیح اور مذموم رواج جاری تھے جن کا تعلق سیاست و تمدن سے تھا لہذا ان کا استیصال کرنا یا ان کی اصلاح کرنا اس کا فرض تھا اور اس لئے اس کے متعلق چند معقول، معتدل اور منصفانہ ہدایات کی گئی ہیں۔ آیات احکام کو جو کلہم دو سو بیان کی جاتی ہیں یہ سمجھ لینا کہ وہ باضابطہ پولیٹیکل اور سول قواعد ہیں صحیح نہیں ہے اکثر یہ کیا گیا ہے کہ آیات کے واحد الفاظ ناقص جملوں اور الگ الگ فقروں کی تعبیر کرکے قانون بنا لیا گیا ہے اور قرآن کی اصل تعلیم اور منشاء کو نظر انداز کر دیا ہے۔

رہی حدیث سو ایک دریائے ناپیداکنار ہے اور رطب و یابس جھوٹ سچ کا ایک ایسا طومار ہے کہ اس میں کھرے کھوٹے کا پرکھنا محال

ہو گیا ہے۔ صحاح ستہ تیسری صدی ہجری میں لکھی گئیں۔ اِن نیک نیت بزرگوں نے احادیث کی صحت کا معیار راوی کی صداقت اور اس کے اعلیٰ اخلاق اور اِتّقا اور سلسلہ روایت کو پیغمبر صلعم یا صحابہ تک پہنچنے کو قرار دیا ہے۔ مضمون حدیث سے بحث نہیں کی۔ عقلی اصول سے پرکھنا دوسروں کا کام ہے۔ اور اس لئے تمام حدیثیں ایسی نہیں ہیں جن کا ماننا لازم ہو۔ آنحضرت نے کبھی اپنے متبعین کو احادیث کے جمع کرنے کی ہدایت نہیں فرمائی اور نہ کبھی صحابہ نے ایسا کرنے کا خیال کیا۔ اور اس سے صاف ظاہر ہے کہ اُن کا کبھی یہ منشا نہ تھا کہ وہ ملک کے پولیٹیکل و سوشل قوانین میں مداخلت کریں۔ ہاں البتہ اُن امور میں جو آپ کی روحانی اور اخلاقی تعلیم کے مخالف تھے آپ نے ضرور مداخلت کی اور اس کی اصلاح فرمائی۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ ایسا نظام جو غیر متیقن اور ناقص احادیث پر قائم ہے قطعی اور غیر متبدل نہیں ہو سکتا۔

اجماع کے متعلق بڑے بڑے فقہا کو اختلاف ہے یا بعض مجتہدین یا فقہا نے جو شرائط قائم کی ہیں اُنہیں دیکھا جائے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اجماع ایک ناقابل عمل اور ناممکن الحصول ہے۔ اِس پر مصنف نے اپنے مقدمہ میں مفصل بحث کی ہے جس کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ فقہ کا یہ اصول کہاں تک کارآمد اور قابل عمل ہو سکتا ہے۔

قیاس۔ اُس استدلال کو کہتے ہیں جو قرآن یا حدیث یا اجماع سے کیا جائے۔ علت قیاس کے لئے اُن میں سے کسی ایک کا ہونا ضرور ہے لیکن یہ تمام استدلال شبہ سے خالی نہیں۔ اور سند نہیں ہو سکتے ہیں۔ مگر

باوجود اس کے قیاس کو فقہ میں بہت بڑا دخل ہے۔ فقہا کو اجماع سے زیادہ قیاس میں اختلاف ہے اور بڑے بڑے جید فقہا اور علماء نے اس کے ماننے سے انکار کیا ہے۔

غرض یہ کہ اگرچہ اسلامی فقہ کے بعض ضابطے اپنے اپنے زمانہ کے لحاظ سے بہت مناسب اور معقول تھے۔ لیکن موجودہ ضروریات کے لئے کافی نہیں ہو سکتے۔ کوئی شئی سوائے قرآن پاک کے قطعی اور ناقابل تبدیل نہیں۔ لہٰذا اس زمانے میں بھی اجتہاد کا وہی حق حاصل ہے جو پہلے زمانہ میں تھا۔ بشرطیکہ وہ احکام قرآن سے مطابق ہوں اور مصنف کی رائے میں یہ حق اجتہاد سلطان روم کو بحیثیت خلیفہ حاصل ہے۔ بہ حیثیت خلیفہ کے سلطان روم کسی مذہب فقہ کے مقلد نہیں ہیں۔ خلفائے راشدین ان مذاہب فقہ سے پہلے گزرے ہیں اور بعد کے خلفاء کے زمانے میں مختلف ممالک اسلامیہ میں مختلف فقہی تغیر و تبدل ہوتے رہے ہیں اور اس لئے سلطان روم بحیثیت خلیفہ کے موجودہ ضروریات و حالات کے مطابق ضروری تبدیلیاں کر سکتے ہیں۔ اور غالباً اسی خیال کی بناء پر مصنف نے اپنی کتاب کو سلطان عبدالحمید خاں کے نام سے معنون کیا تھا۔

مصنف نے اپنی کتاب میں تمام سیاسی، تمدنی اور فقہی اصلاحات کی بناء قرآن پر رکھی ہے اور تمام اُن اعتراضات کو جو مخالفین کی طرف سے اسلام پر وارد کئے گئے ہیں نیز اُن غلطیوں کو جو مسلمانوں میں رائج ہو گئی ہیں قرآن سے رد کیا ہے۔ قرآن روحانی اور اخلاقی ترقی کے لئے ہے۔ وہ قانونی ضابطہ نہیں ہے اور اس سے آزادی رائے اور علمی و اخلاقی و

قانونی تغیرات کا مانع نہیں ہے۔

مصنف نے دو واقعے ایسے بیان کئے ہیں جس سے صاف ظاہر کہ آنحضرت صلعم دنیاوی معاملات میں اپنی رائے کو کبھی قطعی اور ہر حالت میں قابل پابندی نہیں سمجھتے تھے دوسرے آپ نے صاف طور سے آزادی رائے کی اجازت دی ہے۔

پہلا واقعہ امام مسلم سے مروی ہے کہ جب آنحضرت صلعم مدینہ کو آئے تھے تو آپ نے دیکھا کہ بعض لوگ کھجوروں میں نر و مادہ کا جوڑ لگا رہے ہیں آپ نے انہیں ایسا کرنے سے منع کیا۔ لوگ آپ کے ارشاد کے مطابق اس سے باز رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس سال کھجوروں کی فصل خراب رہی جب اس کی خبر آپ کو پہنچی تو آپ نے فرمایا کہ "میں محض بشر ہوں۔ جب میں مذہبی معاملہ میں کچھ ہدایت کروں تو اس پر عمل کرو۔ لیکن جب میں دوسرے معاملات میں کچھ کہوں تو مجھے محض بشر سمجھو" (مقدمہ حصہ اول صفحہ ۴۳)

یہ واقعہ بیّن ثبوت اس بات کا ہے کہ آنحضرتؐ نے سول اور پولیٹکل معاملات میں اپنی رائے کو کبھی ناقابل تبدیل اور قطعی قرار نہیں دیا بلکہ اس میں کامل آزادی عطا فرمائی ہے۔ دوسرا واقعہ ترمذی۔ ابو داؤد اور دارمی سے مروی ہے کہ آنحضرتؐ نے جب معاذ بن جبل کو یمن کا والی بنا کر بھیجا تو اس سے سوال کیا کہ تم لوگوں کے معاملات کو کیوں کر چکاؤ گے۔ اس نے جواب دیا کلام اللہ کے مطابق" پھر فرمایا "اگر تمہیں کلام اللہ میں کوئی بات نہ ملے تو" جواب دیا کہ میں پیغمبر کی نظیر سے کام لونگا" کہا کہ "اگر کوئی ایسی نظیر نہ ملے تو"

اس کے جواب میں معاذ نے کہا کہ میں اپنی رائے پر عمل کروں گا (اجتہد رائی)
آنحضرت صلعم نے معاذ کے اس معقول جواب پر خدا کا شکر ادا کیا۔ (مقدمہ
حصہ اول صفحہ ۲۵)

معاذ کے جواب پر خدا کا شکر ادا کرنا بتاتا ہے کہ آنحضرت صلعم دنیاوی
معاملات میں آزادی رائے کو کس قدر دل سے پسند فرماتے تھے۔

مصنف نے کتاب کے دو حصے کئے ہیں، ایک پولیٹیکل یعنی سیاسی اصلاحات
دوسرا سوشل یعنی تمدنی حالات۔

پہلے حصہ میں ان امور پر بحث کی گئی ہے:

۱۔ پادری میکال صاحب کے خیال میں اسلامی سلطنتیں آلہی سلطنتیں
ہیں جن کے قوانین وضوابط میں کسی قسم کی تبدیلی ممکن نہیں۔ مصنف نے اس
قول کی تردید کی ہے۔ اور اس امر کو ثابت کیا ہے کہ پہلے چار یا پانچ خلفاء اسلام
کی حکومت جمہوری قسم کی تھی اسی لئے پہلے چار یا پانچ خلفاء، خلفائے راشدین
کہلاتے ہیں اور ان کے بعد کے خلفائے جور، یا ملک عضوض، تھے چونکہ
ابتدائی زمانے میں سیاست اور حکومت کے چلانے کے لئے کوئی قانونی
ضابطہ نہ تھا۔ بنو امیہ کے زوال کے بعد خلفائے عباسیہ کے عہد میں کچھ تو
جان ومال کی حفاظت کچھ کاروبار سلطنت کے چلانے کے لئے اور کچھ بادشاہوں
اور خلیفوں کی خواہشات پورا کرنے کے لئے قرآن پاک کی آیتوں کی طرح طرح
کی تعبیریں اور تاویلیں کیں اور اپنے مطلب کے موافق استدلال کئے اور
جھوٹی سچی حدیثیں پیش کر کے دنیا پرست فرمانرواؤں کے اعمال کو جائز

قرار دیا۔

شریعت اسلام نہ تو پیغمبر اسلام نے لکھی ہے نہ آپ نے لکھوائی ہے نہ آپ کے زمانے میں لکھی گئی ہے اور نہ پہلی صدی ہجری میں مرتب ہوئی۔ اور جس قدر اصول اور رواج اور کاروبار سلطنت اور جان و مال کی حفاظت کے لیے قواعد اس میں درج ہیں وہ قرآن کے احکام پر مبنی نہیں ہیں۔ لوگوں نے عموماً اور یورپین نے خصوصاً قرآن اور شریعت کو گڈ مڈ کر دیا ہے اور اس لیے ساری خرابی اس عدم امتیاز سے پیدا ہوئی ہے۔ اگر اس فرق کو سمجھ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اسلام ایسا مذہب نہیں جو انسانی ترقی کی راہ میں حائل ہو بلکہ بحیثیت اسلام ہیں بذاتہ ایک ترقی ہے اور اس کے اصول ایسے جاندار ہیں کہ اُن میں جدید حالات اور عقل و حکمت کی مطابقت کی کامل صلاحیت موجود ہے۔

۲۔ دوسرا اعتراض پادری صاحب کا یہ ہے کہ اسلام کا حکم غیر مسلموں کے حق میں یہ ہے کہ یا تو وہ اسلام قبول کریں یا غلامی یا موت۔ اور یہی سلطان روم کی حکومت میں ہوتا ہے۔

مصنف نے اس کی تردید بڑے زور و شور سے کی کہ نہ آنحضرت صلعم کی ایسی تعلیم ہے اور نہ قرآن میں ایسا کوئی حکم ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اسلام میں غیر مسلموں سے کبھی رواداری یا مسالمت کا برتاؤ نہ کیا جاتا۔ اس کے بعد مصنف نے قرآن کی مدنی اور مکی صورتوں میں سے کوئی (۴۳) آیتیں پیش کی ہیں جن میں غیر مسلموں کو اپنے مذہب میں کامل آزادی عطا کی گئی ہے۔

علاوہ اس کے فقہ کو الٰہی کلام ہونے کا حق نہیں جو وہ ایسا حکم جاری کرے۔ یہاں تک کہ اکثر فقہا کے کتب میں بھی ایسا چنگیزی حکم نہیں پایا جاتا۔ ہدایہ اور دیگر کتب فقہ سے اپنے اس دعویٰ کو ثابت کیا ہے اور جہاں جہاں اِن فقہا نے قرآن کی آیات سے تجاوز کیا ہے اور استدلال میں غلطی کی ہے۔ اُسے صاف طور پر دکھایا ہے۔

۳۔ اِس کے بعد اس امر پر بحث کی ہے کہ آنحضرت صلعم کے زمانہ میں جس قدر جنگیں ہوئیں وہ سب اپنی حفاظت کے لیے تھیں۔ اِس بحث پر مصنف نے ایک الگ کتاب لکھی ہے جس کا ترجمہ عنقریب طبع ہونے والا ہے لہٰذا اس کی بحث زیادہ تر تفصیل کے ساتھ اُس کتاب میں آئے گی۔

۴۔ پادری میکال کا ایک اور بڑا اعتراض یہ ہے کہ "شرع اسلام نے غیر مسلموں کے حق میں مساوی حقوق عطا کرنے کی ممانعت کر دی ہے" علاوہ دیگر براہین کے مصنف نے اس کی تردید میں آنحضرت صلعم کے دو فرمان پیش کئے ہیں جو آنحضرت صلعم نے یہودیوں اور عیسائیوں کے بارے میں صادر فرمائے ہیں جن میں آنحضرت صلعم نے تمام مسلمانوں کو تاکید فرمائی ہے کہ وہ ان کی مدد کریں اور کسی قسم کی تکلیف نہ دیں۔ اگر کوئی دشمن ان پر حملہ کرے تو انہیں بچائیں اور دونو اپنے اپنے مذہب پر رہیں۔ عیسائیوں کے گرجاؤں کی حفاظت کریں۔ کسی زائر کو زیارت سے نہ روکیں۔ گرجا گرا کر مسجد یا مکان نہ بنائیں۔ اگر کوئی دشمن مسلمانوں پر حملہ کرے تو عیسائیوں کے لئے ضرور نہیں کہ وہ مسلمانوں کی حمایت میں لڑیں۔ اگر کوئی عیسائی عورت

مسلمان سے شادی کرے تو اپنے مذہب پر قائم رہ سکتی ہے اور اس اختلاف مذہب کی وجہ سے اسے تکلیف و ایذا نہ پہونچائی جائے۔ اور پھر یہ حکم دیا ہے کہ جو اس کی پابندی نہ کرے گا وہ پیغمبر اور خدا کی نظروں میں نا انصاف اور نافرمان ٹھہریگا۔ ایسی بے نظیر رعایتوں پر بھی اگر مسلمان جابر اور متعصب کھلائیں تو صریح ناانصافی اور تاریخ کا خون کرنا ہے۔

اسی ضمن میں مصنف نے دارالحرب اور دارالاسلام۔ جزیہ، حقوق ذمیان، رقیق و مملوک، شہادت غیر مسلم، تعمیر گرجا پر بڑی لطیف اور دلچسپ بحثیں کیں اور نہایت مدلل طور پر ثابت کیا ہے کہ اسلام نے مسلم و غیر مسلم دونوں کو قانونی حقوق مساوی طور پر دیئے ہیں۔ چونکہ پادری میکال کا حملہ اسلام پر عموماً اور ترکی پر تخصیص کے ساتھ تھا لہذا مصنف نے معاملات ترکی پر بحث کر کے فرمایا ہے کہ سلطنت عثمانیہ عیسائیوں کے حق میں نہایت نرمی اور رواداری کا برتاؤ کرتی ہے اور بعض حالتوں میں مسلمانوں سے زیادہ ان کے ساتھ رعایات مرعی رکھی جاتی ہیں۔ اور اس بارے میں بڑے بڑے یورپین مصنفین اور مدبرین کی رائیں پیش کی ہیں جو معاملات سلطنت عثمانیہ سے خاص واقفیت رکھتے ہیں یا جنہیں بہ حیثیت سفیر ہونے کے ایک مدت دراز تک وہاں رہنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اور اس کے ساتھ ایک فہرست ان بڑے بڑے عیسائی عہدہ داروں کی دی ہے جو ترکی سلطنت میں مامور ہیں۔ خصوصاً اس ضمن میں مصنف نے جو محاصرہ وانا کا ایک واقعہ بیان کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ترکوں سے بڑھ کر

کوئی قوم دنیا میں عیسائیوں سے ایسا شریفانہ برتاؤ نہیں کر سکتی۔ یہاں تک کہ خود عیسائی بھی اپنے ہم قوموں سے ایسی رعایت کی توقع نہیں کر سکتے۔ لکھا ہے کہ بنیاآذیس نے جو رومن کیتھولک مذہب پر تھا برین کو وچ سے جو گریک چرچ کا متبع تھا دریافت کیا کہ اگر فتح تمہاری ہوئی تو کیا کروگے۔ اس نے جواب دیا کہ میں ہر شخص کو مجبور کروںگا کہ وہ رومن کیتھولک ہو جائے۔ اس کے بعد اس نے سلطان سے یہی سوال کیا تو سلطان نے جواب دیا کہ میں ہر مسجد کے قریب گرجا بنواؤں گا اور انہیں اجازت دوںگا کہ خواہ وہ مسجد میں عبادت کریں یا صلیب کے سامنے سر جھکائیں۔ جب اہل سرویہ نے یہ جواب سُنا تو اُنھوں نے بہ نسبت ٹین چرچ کے ترکوں کی اطاعت کو بہت غنیمت سمجھا (حصہ اول صفحہ ۱۸) اسی طرح سلطان سلیم نے اول بار رہا چاہا کہ عیسائیوں کے مذہبی رسوم کو بند کر دے یا انہیں تہ تیغ کر ڈالے۔ لیکن مفتی نے ہمیشہ منع کیا کہ ایسا کرنا احکام قرآن کے خلاف ہے غرض مصنف نے مختلف تاریخی شہادتوں اور بڑے بڑے اہل الرائے کی رایوں سے اس امر کو بخوبی ثابت کر دیا ہے کہ ترکی کا برتاؤ عیسائیوں کے ساتھ ہمیشہ اچھا رہا ہے اور اب پہلے سے بھی اچھا ہے۔

اسی ضمن میں مصنف نے جزیہ کا ذکر کیا ہے جس پر پادری میکال نے بہت کچھ زہر اُگلا ہے اور لکھا ہے کہ عیسائی جزیہ دے کر ایک سال کے لئے اپنی جان بچاتا ہے اور ایک سال اور اپنی گردن پر سر قایم رکھنے کا مجاز ہوتا ہے۔ ذمیوں کے حقوق کو مصنف نے بڑی تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے

اور قرآن اور اقوال و اعمال آنحضرت صلعم سے بڑے شد و مد کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام نے جو حقوق غیر مسلم رعایا کو عطا کئے ہیں وہ کسی قوم نے اپنی غیر قوم کی رعایا کو نہیں دیئے۔ اور یہ ٹیکس جسے پادری صاحب حق زندگی" سے تعبیر کرتے ہیں درحقیقت از روئے شرع اسلام ان لوگوں کی حفاظت جان و مال کے لئے ہے جو مسلمانوں پر فرض ہے اور امام ابو حنیفہ اور امام شافعی کا بھی یہی مذہب ہے۔ شرع میں یہاں تک رعایت ہے کہ اگر دو سال کا ٹکس جمع ہو جائے تو صرف ایک سال کا لیا جائے اور گزشتہ سال کا معاف کیا جاوے۔ مسلمانوں کو ذمیوں سے زیادہ مصیبت بھگتنی پڑتی ہے۔ اس لئے کہ وہ ملک کی حفاظت کے لئے لڑائیاں لڑتے اور اپنا خون بہاتے ہیں۔ پادری صاحب نے یہ اعتراض خاص کر ترکی پر کیا ہے۔ حالانکہ وہاں کی حالت یہ ہے کہ ہر مسلمان جوان پر فرض ہے کہ وہ پانچ سال تک فوج میں کام کرے اور سات سال بحری فوج میں اور اس کے بعد سات سال ریزرو میں رہتا ہے۔ عیسائی ان تمام تکلیفوں سے بری ہے۔ ترک اگر ان شقتوں سے بچنا چاہے تو اسے دس ہزار پیاسٹر یعنی ۵۰ پونڈ ادا کرنے ہوں گے حالانکہ عیسائی صرف ۲۵ پیاسٹر یعنی چار شلنگ ۶ پنس ادا کر کے تمام تکلیفوں سے محفوظ اور تمام رعایتوں کا مستحق ہو جاتا ہے۔ مصنف نے اس پر بڑی طول طویل اور عالمانہ بحث کی ہے۔

۵۔ پادری میکال نے ایک بڑا اعتراض یہ کیا ہے کہ شرع اسلام کا یہ قانون ہے اور بے شمار علماء کا اس پر فتویٰ ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ

وعدے یا معاہدے کا توڑ دینا روا ہے۔ پادری صاحب کا یہ اعتراض جس قدر بے بنیاد اور لغو ہے وہ ظاہر ہے۔ قرآن میں معاہدے کی کامل پابندی کی سخت تاکید ہے اور پیغمبر خدا صلعم نے اس کی ہدایت کی ہے۔ چنانچہ عیسائیوں کو آپ نے بذریعہ تحریر جو حقوق دیئے اس کا ذکر ہو چکا ہے اور یہی حال خلفاء راشدین کا تھا چنانچہ حضرت ابو بکرؓ نے فوج کو نصیحت فرمائی تو اس میں یہ بھی فرمایا کہ "جب تم کسی سے معاہدہ کرو تو اس پر قائم رہو اور اسے پورا کرو" اسی طرح حضرت عمرؓ نے جو ایک ذمی کے ہاتھ سے شہید ہوئے تھے وفات کے وقت یہ وصیت کی کہ ذمیوں کے ساتھ اپنے معاہدوں اور اقراروں کی پابندی کرو۔ ان کی حمایت میں ان کے دشمنوں سے لڑو اور ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ اُن پر نہ ڈالو" اس کے علاوہ اسلامی تاریخ موجود ہے اُسے اُٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں نے غیر قوموں سے کیسے کیسے سلوک کئے کہ آج تک اس کی نظیر نہیں ملتی۔

۶۔ ایک بڑا اعتراض پادری میکال کا یہ ہے کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے۔ مصنف نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اول تو یہ قرآن کا حکم نہیں ہے دوسرے خود فقہا میں اس مسئلہ کے متعلق اختلاف ہے۔ بلکہ بخلاف اس کے قرآن میں معافی کا حکم ہے۔ البتہ ایسے مرتد کو جو بغاوت کرتا ہے اور جنگ پہ آمادہ ہے 'قتل کر دینے کا حکم ہے' یہ امر ارتداد کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ بغاوت کی وجہ سے ہے۔ جن فقہا نے قتل کا فتوے دیا ہے مصنف نے ان کے وجوہ پر بحث کی ہے اور ان کے استدلال کو ضعیف اور خلاف حکم

خدا ثابت کیا ہے اور اس کے بعد عیسائیوں کے قانون کو جو مرتد اور کافر کے متعلق ہے دکھا کر بتایا ہے کہ اسلام میں بمقابلہ مذہب عیسائی کے کس قدر نرمی اور رعایت کا برتاؤ رکھا گیا ہے۔

اسی ضمن میں مصنف نے پادری میکال اور دیگر معترضین کے اعتراضات دربارۂ غیر مساوات غیر مسلمین کو بیان کر کے سب کے جواب کمال خوبی سے ادا کئے ہیں اور کامل طور پر یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام نے نہایت منصفانہ برتاؤ کی اجازت دی ہے اور عموماً مسلم اور غیر مسلم کو یکساں حقوق دیئے ہیں اور یہ بات کسی دوسرے مذہب میں نہیں پائی جاتی۔ اور اسی کے ساتھ سلطنت ترکی پر جو متعصبانہ حملے کئے گئے ہیں ان سب کی اصل حقیقت کو دکھا کر اور بڑے بڑے مدبرین یورپ کے آراپیش کر کے معترضین کی غلط بیانیاں ثابت کی ہیں۔ ہم نے عمداً اس مقدمہ میں سلطنت ترکی سے بحث نہیں کی۔ اس لئے کہ اب ایک نئے دور کا آغاز ہوا ہے اور ہمیں دیکھنا ہے کہ یوربین دول اب ینگ ٹرکس کے ساتھ کیسا برتاؤ کرتی ہیں، اور ایک اسلامی دولت کی ترقی میں حائل ہوتی ہیں جیسا کہ اب تک ہوا یا اس میں سہولتیں پیدا کرتی ہیں۔ یورپ میں ترکی سلطنت مسیحی دول کی نظروں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے اور اگر آپس کی رقابت ان کی سد راہ نہ ہوتی تو کبھی کی اُن کا شکار ہو چکی تھی۔ اس نئے دور کا خیر مقدم اگرچہ بڑی خوشی سے کیا گیا ہے لیکن اُن کا دل جانتا ہے کہ اب اُن کا وہ زور نہیں چل سکتا جو سلطان عبد الحمید خاں کے زمانہ میں انہیں حاصل تھا کہ جو چاہا دباؤ ڈال کر لکھوا لیا اور جس طرح چاہا سلطنت کو نقصان

پہنچا کر اپنے لئے رعایتیں حاصل کرلیں۔

دوسرا حصہ اس کتاب کا سوشل یعنی تمدنی اصلاحات سے متعلق ہے اس حصہ میں مفصلہ ذیل اہم مسائل پر بحث کی گئی ہے۔

۱۔ اسلام میں عورتوں کی حالت۔

۲۔ تعدد زوجات۔

۳۔ طلاق۔

۴۔ غلامی۔

۵۔ تسری۔

اگرچہ یہ مسائل اس قسم کے ہیں کہ اُن پر سالہا سال سے بحث ہوتی چلی آرہی ہے اور مخالفین کو بار بار معقول اور مدلل جواب دیئے جا چکے ہیں، لیکن فاضل مصنف سے پہلے کسی عالم نے اِن مسائل پر عالمانہ اور محققانہ بحث نہیں کی تھی۔ مصنف کا استدلال صرف قرآن پاک سے ہوتا ہے۔ اِس چھوٹی سی کتاب کے پڑھنے والے کو اسلام کی اصل حقیقت اور اس کی خوبیوں اور نکتوں پر اس قدر عبور ہو جاتا ہے کہ سینکڑوں کتابوں کے پڑھنے سے بھی نہیں ہو سکتا۔ ساری کتاب علمی معلومات سے لبریز ہے اور ایک سطر بے کار نہیں۔ اس کتاب پر ریویو کرنا نہ صرف ناممکن ہے بلکہ مصنف کے حق میں ظلم کرنا ہے۔ غلامی پر اس سے پیشتر سرسید احمد خاں مرحوم ایک بیش بہا اور بے مثل کتاب لکھ چکے تھے، لیکن جس انداز سے مصنف نے اس مضمون پر بحث کی ہے ناظرین اُسے دیکھ کر بے اختیار مصنف کی قابلیت اور محنت

کی داد دیں گے۔ غرض کہ فاضل مصنف نے ایسا بڑا کام کیا ہے کہ اس کا جس قدر شکریہ ادا کیا جائے کم ہے۔ اس کتاب کے متعلق (جو انگریزی میں ۴۰۰ صفحہ پر ہے) یہ کہنا ہرگز مبالغہ نہیں کہ دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔

لیکن میکال نے جو اعتراضات مختلف مضامین کے ذریعہ سے اسلام اور ترکی سلطنت پر کئے ہیں اُن سے بہت کچھ بوئے تعصب آتی ہے اور اس کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ رائٹ آنریبل مسٹر جسٹس امیر علی کے ایک جوابی آرٹیکل کے جواب میں جو مضمون میکال نے انگلستان کے مشہور رسالہ "نائن ٹینتھ سنچری"[1] میں بھیجا تو اڈیٹر نے صرف اس وجہ سے اُسے نہیں چھاپا کہ پادری صاحب موصوف اپنے مضامین میں سخت بدزبانی اور بدلگامی سے کام لیتے ہیں کہ جس سے مسلمانوں کے دلوں کو صدمہ پہنچتا ہے۔ اور پادری صاحب کے جواب طلب کرنے پر اڈیٹر رسالہ مذکور نے ان کی تحریرات سے اس کا کافی ثبوت بہم پہنچایا تھا جس سے غالباً انہیں کچھ ندامت نہ ہوئی ہوگی۔

لیکن میکال اور ان کے بعض ہم نوا یورپین مصنفین کا یہ کہنا کہ اسلام اپنے پیرؤوں کو چھٹی صدی کے بدؤوں سے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دیتا اور مسلمان کبھی ترقی نہیں کر سکتے جب تک وہ مذہب اسلام کو ترک کر دیں ایک حیرت انگیز اور سخت حیرت انگیز امر ہے۔ یہ کس قدر جرات اور دلیری

---

[1] دیکھو رسالہ نائن ٹینتھ سنچری بابت ماہ ــــ سنہ ــــ مطبوعہ لندن۔

کی بات ہے گویا دنیا کی آنکھوں میں خاک جھونکنا، اور تاریخی واقعات کا خون کرنا ہے۔

کیا مسٹر میکال اور اُن کے دوست بُھول گئے ہیں کہ موجودہ ترقی اور تمدن کی بنیاد اہلِ اسلام کی ڈالی ہوئی ہے۔ مذہب عیسوی ہمیشہ عقل و آزادی کا دشمن رہا حالانکہ برخلاف اس کے اسلام نے مردہ علوم و فنون کو جگایا، آزادی کو بڑھایا، غلامی کو مٹایا، نئی تحقیقات کی بنیاد ڈالی۔ جدید اکتشافات سے خزانۂ علم کو معمور کیا، اوہام باطلہ اور بطلان پرستی کی بیخ کنی کی، مذہب و سائنس میں تطبیق دی اور یورپ کے گھپ اندھیرے میں شعل علم سے نور پھیلایا، علم حکمت و آزادی کا علم دنیا میں بلند کیا اسی کے طفیل سے رفتہ رفتہ وہ ترقی ہوئی کہ جس کے چکاچوند میں مسٹر میکال اور اُن کے دوستوں کی آنکھیں اس قدر خیرہ ہو گئیں کہ اب وہ اپنے محسنوں کو بھی نہیں دیکھ سکتے۔ مذہب عیسوی نے علوم و فنون اور آزادی اور علماء پر جیسے جیسے ہولناک ظلم و ستم کئے ہیں اُسی قدر اور اُس سے زیادہ اہلِ اسلام نے ان پر احسان کئے ہیں اور اس پر بھی اس روشنی کے زمانہ میں وہ موردِ الزام ہے۔ کیا ریورنڈ میکال اور اُن کے دوستوں کو یاد نہیں کہ عیسائی علماء ہر فلسفی اور طبعی کو "کافر" "دہریہ" اور "مرتد" کا خطاب دیتے تھے۔ اور اس کے بعد ایک اور نہایت نفرت انگیز اور سخت لفظ ان لوگوں کے لئے ایجاد کیا گیا تھا وہ لفظ "محمدن" تھا چنانچہ راجر بیکن پر جس کے احسانات سے انگلستان اور یورپ کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتا محض طبعی اور فلسفی ہونے کی وجہ سے "مسلمان" ہونے کا اتہام لگایا گیا

تھا اور مسیحی علماء نے اسے مسلمان ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ اور وہ تحریریں اب تک موجود ہیں گویا لفظ "مسلمان" طبعی اور فلسفی کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ اور آج انہیں کے سپوت ہیں جو علی الاعلان یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ مسلمان اسلام پر قائم رہ کر دنیا میں ترقی نہیں کرسکتا اور یہ کہ اسلام دشمن علم و آزادی ہے۔

بہ بیں تفاوت راہ از کجا است تا بکجا

نوٹ:۔ اس کتاب کے ترجمہ کرنے کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ مصنف نے خود بھی اس کتاب کا اردو ترجمہ کرنا شروع کیا تھا۔ لیکن انجام کو نہ پہنچا سکے صرف ابتدائی چند اوراق کا ترجمہ کرکے رہ گئے۔ اتفاق سے وہ اوراق ترجمہ ہمارے ہاتھ آگئے لہٰذا ہم نے تبرکاً اس قدر حصہ اپنے ترجمہ کا خارج کرکے مصنف کا اصل ترجمہ داخل کردیا ہے۔ چنانچہ صفحہ (۱) سے صفحہ (۱۴۶) تک خود مصنف کا ترجمہ ہے۔ مصنف مرحوم کا ترجمہ پنجاب ریویو کے ضمیمہ میں چھپا تھا (ملاحظہ ہو پادری رجب علی کا مشہور رسالہ پنجاب ریویو کا ضمیمہ جلد نہم نمبر ۴ بابت ماہ اپریل ۱۸۸۲ئ) اس اردو ترجمہ میں علامہ مصنف نے چند حاشیے بھی اضافہ کئے ہیں جو اصل انگریزی کتاب میں نہیں ہیں چنانچہ مقدمہ حصہ اول فقرہ (۱۴) صفحہ ۸ میں جو تفصیلی نوٹ فقہ حنفیہ لکھا گیا ہے وہ اصل انگریزی کتاب میں موجود نہیں ہے اس لئے ہم نے اردو ترجمہ میں نقل کردیا ہے۔

مقدمۂ تحقیق الجہاد

واشنگٹن ائرونگ امریکہ کے ایک مشہور مصنف اور ادیب نے آنحضرت صلعم کی بھی لائف لکھی ہے اس کے پہلے ہی صفحہ پر آنحضرت کی ایک تصویر دی ہے جس کے ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں تلوار ہے۔ یہ تصویر مصنف کے اصلی خیال کا فوٹو ہے جسکی پہلے سے یہ رائے ہو وہ ایک ایسے بڑے مصلح اور بنی اور بنی نوع انسان کے محسن کی لائف کیا خاک لکھے گا اور یہ کچھ ائرونگ ہی پر موقوف نہیں۔ یورپ میں یہ خیال عام طور پر پھیلا ہوا ہے اور پولٹیکل مصلحتوں نے وہی کام کیا ہے جو بھُس میں چنگاری کرتی ہے۔ بدقسمتی سے مسلمانوں اور عیسائیوں میں صدیوں سے جنگ وجدل چلی آرہی ہے اور اگرچہ یہ جنگ وجدل ملکی ہے لیکن اس نے اپنے ساتھ مذہب کو بھی مان لیا ہے۔ تلوار والے تو تلوار سے کام لیتے ہیں اور اہل قلم اپنے دل کی بھڑاس یوں نکالتے ہیں۔ غرض یہ منحوس جنگ ایسی لگی کہ ختم ہونے کو نہیں آتی کمزور کا قاعدہ ہے کہ جب ہاتھ سے کام نہیں نکلتا تو زبان سے کام لیتا ہے۔ عیسائیوں کو شکستیں کیا ہوئیں کہ انہوں نے مسلمانوں کو بدنام کرنا شروع کیا اور بدنام بھی کیسا کچھ کہ قسمہ لگانہ رکھا۔ جس زمانے میں آنحضرت

صلعم کی شہرت ہوئی تو روما کے ایک پوپ نے آنحضرت کے حالات دریافت کرنے کے لیے ایک مشن عرب کو بھیجا۔ معلوم نہیں وہ مشن پہنچا یا نہیں پہنچا مگر جو رپورٹ اس نے لکھکر بھیجی وہ کذب وافترا کی ایک پوٹ ہے۔ سچ نام کو نہیں اور ایسی ایسی باتیں اور واقعات تصنیف کئے ہیں کہ الف لیلہ بھی آگے سامنے مات ہے۔ اور افسوس کہ یہ رسم اب تک جاری ہے۔ کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ کوئی نہ کوئی کتاب یا اخبار یا رسالے میں کوئی ایسا مضمون شایع ہوتا ہو جس سے مسلمانوں کی دل آزاری نہ ہوتی ہو اگر وہ تمام کتب وتحریرات جمع کیجائیں جو عیسائیوں اور خاص کر اہل یورپ نے اسلام بانی اسلام اور اہل اسلام کے خلاف لکھی ہیں تو وہ ایک ایسا بڑا انبار کذب وافترا اور دروغ وبہتان کا ہوگا کہ روٹر اور ٹائمز اس کے ایک صفحہ کی برابری بھی نہیں کر سکتے۔ بات یہ ہے کہ مسلمانوں کو کامیابی ہوئی آناً فاناً اور کامیابی پیدا کرتی ہے حسد اور خصوصاً جب عیسائی ان کے آگے ہر جگہ ناکامیاب اور پسپا ہوتے گئے تو حسد کی آگ اور بھڑک اٹھی اور بغض وکینہ کی کوئی انتہا نہ رہی۔ یہ سارا فساد اسی کا ہے گو اس وقت یورپ کی تہذیب وشائستگی اور سائنس کا آفتاب عین نصف النہار پر ہے مگر تعصب کے جراثیم رگ رگ اور ریشے ریشے میں کچھ ایسے سرایت کر گئے ہیں اور گوشت پوست میں کچھ ایسے پیوست ہو گئے ہیں کہ تیز سے تیز شعاعیں بھی انہیں ہلاک نہیں کر سکتیں۔ آج کل اسے مذہبی تعصب نہیں کہتے بلکہ یہ تعصب ایک دوسری ہولناک اور مکروہ صورت میں ظاہر ہوا ہے جس کے کاٹے کا منتر نہیں۔ اسے پالیٹکس یا ڈپلومیسی کہتے ہیں۔ اس کے لیے

ہماری زبان میں کوئی لفظ نہیں اور ہو کہاں سے ہمارے یہاں یہ سیاسی چالبازیاں اور عیاریاں تھیں کہاں۔ جو لفظ ہوتا۔ اگرچہ صدہا انقلاب ہوگئے حالات بدل گئے اور جو آگے تھے وہ پیچھے اور جو پیچھے تھے وہ آگے ہوگئے مگر افسوس ابھی تک دلوں میں کدورت وہی چلی آتی ہے درد جاتا رہا مگر کسک باقی ہے سانپ کبھی کا نکل گیا مگر یہ کم بخت ابھی تک لکیر پیٹے جاتے ہیں اور کوئی دن ایسا نہیں گذرتا کہ کسی نہ کسی پر کچوکا نہ دیتے ہوں۔

اسلام کی ترقی اشاعت کو جو بجلی کی رو کی طرح تمام عالم میں دوڑ گئی عیسائی دیکھکر حیران و ششدر رہتے تھے اور جب وہ اپنے نبی علیہ السلام کے حالات عہد جدید میں پڑھتے تھے تو ان کی حیرت اور بھی بڑھ جاتی تھی۔ حضرت عیسیٰ وعظ کرتے کرتے اس دنیا سے اُٹھ گئے مگر اپنی قوم پر کچھ اثر ڈال نہ سکے یہاں تک کہ ان کے حواریوں کی یہ حالت تھی کہ پتا کھڑکا اور دیدہ بھڑکا، خطرے کے نام سے بھاگ کھڑے ہوتے تھے۔ اور یہاں یہ حالت تھی کہ جو لوگ اسلام لائے اُنہوں نے ہر طرح کی مصیبتیں، ذلتیں اور ظلم سہے گھربار چھوڑا بال بچے چھوڑے مگر مذہب نہ چھوڑا یہاں تک کہ اپنے مذہب کے لئے جانیں تک قربان کر دیں۔ وہ بت جو گھروں میں خدا بنے بیٹھے تھے اور جو یہودیوں کی کوشش سے نکلے نہ عیسائیوں کی سعی سے۔ انہیں وہ خود بخود پھینک پھینک کر اسلام میں داخل ہونے لگے۔

اس غیر معمولی ترقی اور اثر کو دیکھ دیکھکر عیسائی حیران ہیں کہ یہ کیا معاملہ ہے جو کوئی نبی نہ کرسکا وہ پیغمبر اسلام سے کیونکر ہوگیا۔ بس اس پر

یہ قیاس کر لیا کہ رسول اللہ صلعم نے اسلام بجبر پھیلایا اور اپنے ذہنوں میں وہ تصویر کھینچ لی جو ائرونگ واشنگٹن نے اپنی کتاب کے پہلے صفحہ پر دی ہے۔ حالانکہ یہ واقعہ ہے اور ایسا کھلا واقعہ ہے جس کے لئے مزید تحقیقات یا پرانے کھنڈروں یا قدیم کتبوں یا بھوج پتروں کی تلاش کی ضرورت نہیں ہے کہ اسلام کبھی آنحضرت کے زمانے میں یا اس کے بعد بجبر یا بزور شمشیر نہیں پھیلایا گیا بلکہ جس رواداری۔ مسالمت اور اعتدال کے ساتھ مسلمانوں نے دنیا پر حکومت کی اور جو فیاضانہ برتاؤ انہوں نے غیر اقوام کے ساتھ روا رکھا دنیا میں اسکی نظیر کہیں نہیں ملتی۔ مجھے اس کے متعلق اس مختصر مقدمہ میں کسی شہادت کے پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے اسپر دفتر کے دفتر لکھے جا سکتے ہیں اور ان واقعات سے ہماری اور غیروں کی تاریخیں بھری پڑی ہیں اور جسے مذہبی پہلو سے اس مسئلہ کو دیکھنا ہو تو اس کتاب کا مطالعہ کرے۔

معترضین کو "جہاد" کا حربہ ایسا مل گیا ہے کہ اُسے جا و بیجا ہر موقع پر پیش کر دیتے ہیں گویا اُسے مسلمانوں کی طرف سے نفرت پیدا کرنے کے لئے ایک ـــــ بیجا بنا رکھا ہے اور یہ ایک ایسا ڈراونا اور خوفناک لفظ ہو گیا ہے کہ اہل یورپ اسے سن کر اس طرح چونک اُٹھتے ہیں جیسے کبھی نپولین کے نام سے وہاں کے تاجدار سہم جایا کرتے تھے۔ لیکن کیا درحقیقت یہ لفظ ایسا خوفناک لفظ؟ جہاد کیا ہے! اپنی حفاظت کے لئے ہاتھ پیر ہلانا اور حتی المقدور کوشش کرنا، کب! جب جان و مال ننگ و ناموس اور مذہب پر آ بنے۔ کون سا قانون ہے جو اس کی اجازت نہیں دیتا اور کونسا انسان ہے جو ایسے وقت

اپنی حفاظت نہیں کرتا۔ مدافعت اور اپنی حفاظت ایک قدرتی فعل ہے اور بڑے بڑے انسان سے لیکر ادنیٰ سے ادنیٰ کیڑے مکوڑے تک وقت پڑے پر اپنی حفاظت اور مدافعت میں سعی کرتے ہیں۔ اسلام نے کہیں بجبر یا بزور شمشیر کسی کو مسلمان بنانے کی اجازت نہیں دی اور نہ آنحضرت صلعم نے کبھی ایسا کیا نہ کسی دوسرے کو ایسا کرنے کا حکم دیا۔ جن لوگوں نے آنحضرت کے حالات کا مطالعہ کیا ہے انہیں معلوم ہے کہ ابتدائی تیرہ سال آپ پر کیسے مصیبت کے گذرے ہیں۔ قریش نے ان کے ساتھ کیا کیا نہ کیا طرح طرح سے آپکی توہین وتحقیر کی۔ جسمانی مالی اور روحانی صدمے پہونچائے، ادائی نماز سے روکا، یہاں تک کہ تھوکا، کوڑا کرکٹ اور گندگی ڈالی، آپ کی گردن میں آپ ہی کے عمامے کا پھندا ڈالکر کعبہ سے باہر نکال دیا، تلقین وتعلیم سے باز رکھا اور ہر قسم کی اذیتیں اور صعوبتیں پہنچائیں۔ آپ کے پیرووں پر بڑے بڑے ظلم توڑے اور کوئی دقیقہ ان کے ستانے اور ان کی زندگی تلخ کرنے کا اٹھا نہ رکھا آپ کے اور تمام مسلمانوں کے خلاف سازشیں کیں ایک جتھا قائم کیا اور آمدورفت میل جول اور تمام تعلقات باہمی قطع کر دیئے۔ آخر انہیں مایوس ومجبور ہوکر اپنے وطن مالوفہ کو خیرباد کہنا پڑا اور آوارہ وطن ہوکر مکہ سے دور جاکر پناہ لی مگر ظالموں نے وہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا اور پہلے سے زیادہ ظلم وتعدی پر آمادہ ہوگئے اور فوجیں لے کر حملہ آور ہوئے اسپر بھی اگر آنحضرت صلعم خاموش صبر وتحمل کئے بیٹھے رہتے تو وہ اپنے فرض کے ادا کرنے میں کوتاہی کرتے۔ اسوقت آپ کا فرض عین تھا کہ اپنے تئیں اور اپنے رفقا کو ہلاکت سے بچاتے اور یہی کیا۔

اور یہی کرنا چاہیئے تھا اور ایسا کرنا بدرجہ مجبوری تھا کیونکہ سوائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا، اس لئے آنحضرت صلعم کے تمام غزوات دفاعی تھے۔

اس مسئلہ پر جس شرح وبسط اور تحقیق وتدقیق کے ساتھ مولوی چراغ علی مرحوم نے اس کتاب میں بحث کی ہے آج تک کسی نے اس پر ایسی غائر نظر نہیں ڈالی تھی۔ اس زمانہ میں جبکہ جدید خیالات اور جدید فلسفہ ہمارے ملک میں گھر کرتا جاتا ہے اور اسلام اور اہل اسلام پر نئے نئے اور دلاویز طریقوں سے حملے کئے جا رہے ہیں اور مسلمان انہیں پڑھ پڑھ کر اپنے اعتقادات وخیالات میں ڈانواں ڈول ہو رہے ہیں ایک ایسی محققانہ کتاب کی بیحد ضرورت تھی۔ نئے تعلیم یافتہ تو خیر نشانہ ملامت ہیں ہی مگر اُن پر اپنے علما کا کیا کیا جا جو اپنے کلام سے (خواہ وہ کسی نیت سے ہو) معترضین کی تائید کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک عالم محدث کو جنہوں نے علوم دینی کو اردو میں شائع کرکے اسلام کی بڑی خدمت ادا کی ہے اور خاص کر کل صحاح ستہ کا اردو میں ترجمہ فرما کر ہند کے اہل اسلام پر احسان کیا ہے جب کوئی صحیح حدیث نہ ملی تو اپنی طرف سے ایک حاشیہ اس مضمون کا جڑ دیا کہ رسول کریم کے غزوات حصول فتح اور بجبر اشاعت اسلام کی غرض سے تھے۔

میں نہیں جانتا کہ اسے کیا کہا جائے۔ بہرحال ایسی حالت میں مولوی چراغ علی مرحوم کی کتابیں پیاسے کے لئے آب حیات مریض کے لئے نوشدارو اور مارگزیدہ کے لئے تریاق کا کام دیں گی۔ مرحوم اس ضرورت کو بہت پہلے سمجھ چکے تھے اور جبکہ مقلد اور غیر مقلد سنی و شیعہ تو تو میں میں

میں مصروف تھے وہ ایک ایسی عظیم الشان خدمت اپنے دین وملت کی ادا کر رہے تھے کہ اسکی نظیر ان کے بعد پھر نظر نہ آئی۔ بعض مدعیان حمایت دین وملت کی آنکھیں اب کھلی ہیں اور دن ڈھلے پر ایک جدید علم کلام کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں اور اس کے متعلق مشورے اور کمیٹیاں ہو رہی ہیں لیکن انہیں خبر نہیں کہ مدت ہوئی اسکی بنیاد سرسیدؒ ڈال چکے اور مولوی چراغ علی مرحوم اسکی تکمیل بھی کر چکے۔ اور خبر کیوں نہیں شاید اس کا اعتراف کرتے شرماتے یا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں اعتراف کرو یا نہ کرو چلنا اسی نقش قدم پہ پڑیگا اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بناؤ مگر بنیاد وہی ہوگی۔

مولوی صاحب مرحوم کا طریقہ تحریر سب سے الگ اور نرالا ہے وہ کبھی جوش میں آکر فصاحت کے دریا نہیں بہاتے دوسروں کو الزام نہیں دیتے عبارت کی رنگینی یا لطائف ادبی کا خیال نہیں کرتے اور نہ ناظرین کے جذبات کو شتعال دیکر اپنی بات منواتے ہیں۔ وہ نفس معاملہ کو نہایت ٹھنڈے دل اور غور سے دیکھتے ہیں اس کے متعلق تمام واقعات جمع کرتے ہیں اور سوائے قرآن پاک اور افعال و اعمال آنحضرت صلعم کے کسی دوسری خبر پر اپنے استدلال کی بنیاد نہیں رکھتے۔ ان کا مطالعہ ایسا وسیع ان کی نظر ایسی غائر اور ان کی تحقیق ایسی گہری اور ان کی منطق ایسی مستحکم ہوتی ہے کہ جس مضمون پر وہ قلم اٹھاتے ہیں پھر کسی دوسرے کے لئے ایک لفظ کی گنجائش نہیں چھوڑتے انکا زور جذبات انسانی پر نہیں بلکہ استدلال عقلی پر ہے وہ جذبات کو ابھار کر جوش میں لانا نہیں چاہتے کیونکہ یہ ناپائدار ہے بلکہ از راہ تحقیق وہ مشتبہ امور کو

اس پہلو سے پیش کرتے ہیں کہ اگر پڑھنے والا غور سے پڑھے تو اسکی صداقت اس طرح ذہن نشین ہو جائے کہ پھر اس کا نقش نہ مٹ سکے۔ وہ شاعر نہیں محقق ہیں وہ فسانہ نگار نہیں منطقی ہیں وہ واقعات اور اصل حقیقت سے بحث کرتے ہیں تخیل و بلند پروازی سے کام نہیں لیتے۔ وہ اپنی تائید میں شاہان اسلام کے تاریخی واقعات اور فقہا کی رائیں پیش نہیں کرتے بلکہ آیات قرآنی افعال و اعمال رسول صلعم کو سند گردانتے ہیں۔ وہ کسی الزام یا اعتراض کا الزامی جواب دیکر لفظی ہیر پھیر سے نہیں ٹالتے بلکہ جرات کے ساتھ اس کا مقابلہ کرتے اور زور سے اسکی تردید کرتے ہیں اور یہی طریقہ ان کی تمام تصانیف میں پایا جاتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی تصانیف تعلیم و تحقیق دین اسلام کا ایک ایسا بے بہا مجموعہ ہیں کہ ان کو غور سے پڑھنے کے بعد حقیقت و حقانیت دین اسلام پر اسقدر عبور ہو جاتا ہے کہ سالہا سال کی محنت اور صدہا کتب کے مطالعہ سے حاصل نہیں ہو سکتا اس میں ذرا شبہ نہیں کہ مرحوم نے اسلام کی ایسی بڑی خدمت کی ہے کہ ہم سب کو ان کا بہت شکر گزار اور ممنون ہونا چاہیئے۔ یہ بڑی خوش قسمتی کی بات ہے کہ مولوی عبداللہ خان صاحب ان کتابوں کا ترجمہ کرا کر اور بڑی محنت سے اون کے مضامین ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر (جو اب تک طبع نہیں ہوئے تھے) ترتیب دے رہے اور شایع کر رہے ہیں۔

اب لوگوں کو معلوم ہوگا کہ جن موتیوں کی تلاش میں بڑے بڑے شناور غواصی کر رہے ہیں وہ در اصل مرحوم کی خوشہ چینی کر رہے ہیں خواہ کوئی اعتراف کرے یا نہ کرے خواہ ان کی کتابوں کا حوالہ دے یا نہ دے۔

اس کتاب میں مرحوم نے کمال تحقیق سے کام لیا ہے اور اس مضمون مختلف پہلوؤں پر ایسی خوبی سے بحث کی ہے کہ پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ یہ مضمون کس قدر وسیع ہے اور فاضل مصنف کی جانفشانی، دماغ سوزی اور انتہائی تلاش کا حال کھلتا ہے۔

اِس کا ترجمہ مولوی خواجہ غلام الحسنین صاحب (مترجم فلسفہ تعلیم ہربرٹ اسپنسر) نے کیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ بہت بامحاورہ صاف اور شگفتہ ہے۔

پبلشر نے بھی اس کتاب پر بہت محنت کی ہے جا بجا ایسے حوالوں کا اضافہ کیا ہے جو مصنف کی نظر سے رہ گئے تھے اور بجائے ایک آدھ کے کئی ایک حوالے ہوگئے ہیں جس سے مصنف کے خیال کو بہت تائید ملتی ہے بعض حوالے جو انگریزی کتاب میں غلط چھپ گئے تھے ان کی بھی تصحیح کی ہے۔ عربی اسماء و اعلام کی جیسے کچھ مٹی انگریزی کتابوں میں خراب ہوتی ہے وہ ظاہر ہے ان ناموں کی صحت میں بھی بڑی احتیاط کی گئی ہے۔ کہنے کو تو یہ معمولی سا کام معلوم ہوتا ہے لیکن دراصل اسمیں بڑی محنت اٹھانی پڑتی ہے اور بہت وقت صرف کرنا پڑتا ہے۔ یہ کام ایسا مشکل ہے کہ بعض مترجمین تو اس مشکل سے ڈر کر ترجمے ہی چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ مولوی عبداللہ خان صاحب کا ممنون ہونا چاہئیے کہ اول تو انہوں نے اس بے نظیر کتاب کا انگریزی سے اردو ترجمہ کرایا اور پھر اسکی صحت اور چھپائی میں خاص طور سے محنت کی ہیں امید ہے کہ یہ کتاب ہر لحاظ سے مقبول ہوگی۔

مقدمہ معراج العاشقین

حضرت سید محمد حسینی بندہ نواز گیسو دراز قدس سرہٗ کا فیض سرزمین دکن پر عام ہے۔ انکا مزار مرجع خلائق ہے اور ان کی تصانیف ابتک لوگ تلاش کر کر کے شوق سے پڑھتے ہیں۔ حضرت اُن بزرگان دین میں سے ہیں جن کی تصنیفات و تالیفات کثرت سے ہیں اور تقریباً سب کی سب فارسی میں ہیں لیکن تحقیق سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آپ نے بعض رسالے ہندی یعنی دکھنی اردو میں بھی تصنیف فرمائے ہیں۔

حضرت برہان الدین غریب اپنے مرشد کامل حضرت سلطان الاولیاء خواجہ نظام الدینؒ کے حکم سے چارسو بزرگوں کے ساتھ دکن کی جانب روانہ ہوئے اور یہاں پہنچ کر دولت آباد (روضہ) میں قیام فرمایا اس مبارک اولوالعزم قافلے میں بندہ نوازؒ کے والد بزرگوار سید یوسف معروف بشاہ راجو قتالؒ بھی تھے[1] والد ماجد کے ساتھ خود حضرت اور آپکی والدہ ماجدہ بھی تشریف رکھتی تھیں۔ اس وقت آپکی عمر چار پانچ سال کی تھی۔ ابتدائی تمام تعلیم و تربیت آپ کی یہیں ہوئی۔ ابھی آپ کی پندرہ سال کی

---

[1] بعض مورخین کو اس سے اختلاف ہے اور لکھتے ہے کہ سید یوسف اس کے بعد آئے ہیں ۱۲

تو تھی کہ والد نے رحلت فرمائی حضرت راجو قتال کا مرقد خلد آباد میں اب تک موجود ہے۔ والد کے انتقال کے بعد برداشتہ خاطر ہو کر والدۂ ماجدہ کے ہمراہ دہلی واپس تشریف لے گئے۔ سولہ سال کی عمر میں حضرت نصیر الدین محمود چراغ دہلوی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور شرف ارادت حاصل کیا علوم باطنی کی تحصیل حضرت شیخ سے اور علوم ظاہری کی مولانا شرف الدین کیتھلی سے کی جب حضرت شیخ نصیر الدین کا وقت قریب آیا تو آپ نے خلعت خلافت حضرت بندہ نواز کو عطا فرمایا حضرت شیخ نے ۷۵۷ھ میں رحلت فرمائی اور ان کی بجائے آپ مسند خلافت پر متمکن ہوئے اور مریدوں اور طالبوں کو تعلیم و تلقین فرمانے لگے ایک مدت اسی میں معروف رہے ۸۰۱ھ میں تیمور نے دہلی پر حملہ کیا۔ فتح کے بعد ایک قیامت برپا ہو گئی۔ سیری، جہاں پناہ اور پرانی دلی میں آگ کے شعلے بلند ہوئے اور سارے شہر میں قتل و غارت کا بازار گرم ہوا۔ اس کشت و خون اور فساد کے عالم میں حضرت مع اہل و عیال کے ترک وطن کر کے دکن کی طرف روانہ ہوئے اُس وقت حضرت کی عمر اسی سال کی تھی بسلسلہ گوالیار، چانڈی اور گجرات کے دوسرے مقامات سے ہوتے ہوئے دولت آباد (خلد آباد) پہنچے۔ دولت آباد سے بارہ وراللند تشریف لے گئے سلطان فیروز شاہ کو جب حضرت کے آنے کی اطلاع ہوئی تو اس نے اپنے امرا و اعیان سلطنت کو بھیج کر بڑے عزت و احترام سے گلبرگہ بلایا۔ اور حضرت تا دم وصال وہیں مقیم رہے۔ سنہ وفات ۸۲۵ ہجری ہے۔ وصال کے وقت حضرت حضرت کی عمر ۱۰۵ سال کا تھا حضرت کی زندگی کے یہ چند واقعات میں نے اس غرض سے بیان کیے ہیں

تاکہ معلوم ہو کہ ان کا تعلق دکن سے کہاں تک تھا۔ ان کے پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ وہ چار پانچ سال ہی کی عمر میں یہاں آ گئے تھے اور ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت بھی یہیں ہوئی۔ پندرہ سولہ برس کی عمر تک یہیں رہے۔ اور اس کے بعد دلی تشریف لے گئے۔ اسی سال کی عمر میں ۱۰۸۶ھ آپ نے پھر دکن کی طرف مراجعت فرمائی اور اپنی عمر کے آخری پچیس سال یہیں بسر کئے اور اس سر زمین کو اپنی تعلیم و تلقین کی برکت سے فیض پہنچاتے رہے یعنی زندگی کا ابتدائی اور آخری زمانہ دکن ہی میں بسر ہوا۔ صوفیائے کرام کی تعلیم کسی خاص فرقے سے مخصوص نہیں ہوتی۔ ان کا فیض عام ہوتا ہے۔ بلکہ طبقۂ عوام کے لوگ ان کی خدمت میں زیادہ حاضر ہوتے۔ اور طالب فیض ہوتے ہیں اور اس لئے ان کے سمجھانے کے لئے انہیں کی زبان میں ان سے باتیں کرنی پڑتی ہیں۔ اور انہیں کی زبان میں تعلیم و تلقین بھی کیجاتی ہے۔ حضرت کا معمول تھا کہ نماز ظہر کے بعد طلبہ اور مریدوں کو حدیث اور تصوف اور سلوک کا درس دیا کرتے تھے۔ اور گاہے گاہے درس میں کلام اور فقہ کی کتابوں کی تعلیم بھی ہوتی تھی۔ جو لوگ عربی اور فارسی سے زیادہ واقف نہ تھے۔ ان کے سمجھانے کے لئے آپ دکھنی زبان میں بھی تقریر فرماتے تھے۔ چونکہ حضرت کو تصنیف و تالیف کا خاص شوق تھا۔ اور آپ کے قلم سے ایک سو سے زائد چھوٹی بڑی کتابیں نکلی ہیں اس لئے یہ قیاس کچھ بیجا نہیں کہ عام لوگوں کے سمجھانے کے لئے آپ نے بعض رسالے دکھنی اردو میں بھی تصنیف کئے ہوں۔

میرے پاس حضرت کے متعدد رسالے اس زبان میں تصنیف کئے ہوئے

موجود ہیں لیکن مجھے ان کے شائع کرنے کی جرأت نہیں ہوئی اس لئے کہ ہمارے قدیم سے یہ دستور رہا ہے کہ لوگ اپنی تصانیف کو بعض مشاہیر اور نامور بزرگان دین سے منسوب کر دیتے ہیں۔ چنانچہ حضرت معین الدین چشتی اجمیریؒ اور غوث الاعظم حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کے نام سے فارسی دیوان شائع اور رائج ہیں۔ اسی طرح اور بزرگوں کے نام سے مختلف قسم کی کتابیں اور رسالے لکھ کر منسوب کر دئے گئے ہیں۔ اس بنا پر مجھے ہمیشہ یہ شبہ رہا کہ جو رسالے میرے پاس موجود ہیں وہ حقیقت میں حضرت بندہ نواز کی تصنیف ہیں یا نہیں کیونکہ بعض رسالے جن کی نسبت متعدد ذرائع سے اور متواتر روایتوں سے یہ معلوم ہوا تھا کہ حضرت نے دکھنی میں لکھے تھے۔ تحقیق کرنے سے ثابت ہوا کہ اصل فارسی میں موجود ہیں اور یہ ان کا ترجمہ ہیں۔ ممکن ہے کہ حضرت نے بعض رسالے فارسی اور دکھنی دونوں زبانوں میں تصنیف فرمائے ہوں لیکن جب تک کوئی قطعی شہادت اس کی تائید میں نہ ہو یہ قیاس زیادہ قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ لیکن میں اس سے مایوس نہیں ہوا۔ اور کھوج میں لگا رہا کہ جب کسی رسالہ کے متعلق یہ تحقیق ہو جائے کہ یہ حضرت ہی کی تصنیف ہے تو شائع کروں۔ اس اثنا میں مولوی غلام محمد صاحب انصاری وقائع نگار نے ایک رسالہ معراج العاشقین کا پتہ ڈاکٹر محمد قاسم صاحب کے کتب خانے سے لگایا اور جب انہوں نے مجھے یہ نسخہ دکھایا تو چند سطریں پڑھنے کے بعد ہی مجھے یہ خیال آیا کہ اس کا ایک نسخہ میرے پاس بھی موجود ہے نکال کے دیکھا تو ایک ہی کتاب کی دو علیحدہ نقلیں

البتہ کہیں کہیں الفاظ اور عبارت کا اختلاف تھا جو قلمی نسخوں میں اکثر پایا جاتا ہے ۔ مگر ڈاکٹر صاحب کے نسخے میں ایک بات کام کی نظر آئی کہ اس کے آخر میں یہ تحریر ہے کہ یہ ایک قدیم نسخے سے جس کا سنہ کتابت ۹۰۶ھ ہجری تھا نقل کیا گیا ہے اصل عبارت یہ ہے ۔

"این نسخہ شریف رافیہ حقیر سراپا تقصیر سید محمد نصیر در قلعہ نصرت آباد ساگر من مضافات دار الظفر بیجاپور بتاریخ ہفتم ماہ رمضان المبارک ۱۱۷۶ھ یک ہزار و یک صد و ہفتاد و شش ہجری از نسخۂ متبرکہ قدیم کہ مکتوبہ ۹۰۶ھ نہ صد و شش ہجری بود نقل نمود"

اس سے مجھے بہت کچھ اطمینان ہوا اور ایک حد تک اس بات کا یقین ہو گیا کہ یہ حضرت بندہ نواز ہی کی تصنیف ہے زبان بھی قدیم ہے ۔ اس کے علاوہ عشق نامہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے ۔ یہ تصوف کی ایک ضخیم کتاب ہے جو حضرت خواجہ صاحب کے مرید محمد عبد اللہ بن محمد عبد الرحمٰن چشتی نے احمد شاہ بہمنی (۸۲۸ھ ۸۶۲ھ) کے زمانے میں تصنیف کی ۔ اس میں حضرت کی تصانیف معراج العاشقین اور ہدایت نامہ کا کئی جگہ ذکر آیا ہے ۔ اس میں کثرت سے خواجہ صاحب کے ملفوظات اور آپ کے وعظ و تذکار کے حالات درج ہیں ۔

اگر بالفرض یہ تسلیم بھی نہ کیا جائے تو کم سے کم اس کے ماننے میں کوئی تامل نہیں ہو سکتا کہ یہ ۹۰۶ھ سے قبل کی تصنیف ہے ۔ حضرت بندہ نواز کا سنہ وفات ۸۲۵ ہجری ہے ۔ یعنے اس رسالہ کی کتابت حضرت کی وفات سے ۸۱ سال بعد کی ہے ۔ اس سے بھی یہ امر قرین قیاس بلکہ اغلب معلوم ہوتا ہے کہ ہو نہ ہو یہ حضرت

ہی کی تصنیف ہے ۔ اگر ان تمام قیاسات اور شہادتوں سے قطع نظر کرلی جائے تو بھی اتنا ضرور ماننا پڑے گا کہ اگر حضرت کی نہیں تو ان کے کسی ہم عصر یا اس سے قریب زمانے کی تصنیف ضرور ہے ۔ اس لحاظ سے بھی یہ قدیم اردو کا نہایت قابل قدر نمونہ ہے اور اس سے قبل کی تحریری زبان کا نمونہ ملنا دشوار ہے ۔ اگرچہ یہ کوئی ادبی کتاب نہیں ہے اور اول سے آخر تک سراسر تصوف ہے تاہم اُس زمانے کی زبان کا تھوڑا بہت پتہ ضرور لگتا ہے اور موجودہ حالت میں یہ کچھ کم نہیں بلکہ بہت غنیمت ہے ۔

جب یہ دو نسخے میرے ہاتھ آ گئے اور مصنف اور زمانے کے متعلق کافی اطمینان ہو گیا تو میں نے حضرت وفا کی فرمائش سے ایک صحیح نسخہ مرتب کرنا شروع کیا ۔ قلمی کتابیں جیسی کچھ غلط لکھی ہوتی ہیں ۔ وہ ظاہر ہے لیکن دکنی زبان کی کتابیں اسوائے خاص خاص نسخوں کے جو اسب پر سبقت لے گئی ہیں عام غلطیوں کے علاوہ جو اکثر بے سواد کاتب کر جاتے ہیں ان کا املا ایسا عجیب و غریب اور خط اس قدر خراب ہوتا ہے کہ صحیح لفظ بھی غلط نظر آتے ہیں اور ان کی صحت میں بھی ایسی ہی دشواری پیش آتی ہے جیسے غلط الفاظ کی صحت میں ۔ بات یہ ہے کہ اہل علم اور خاص لوگ عربی اور فارسی کی کتابیں پڑھتے تھے اور دکنی کی طرف مطلق توجہ نہیں کرتے تھے ۔ دکنی زبان میں کتابیں ایسے لوگوں کے لئے لکھی جاتی تھیں جو کم علم تھے یا عربی فارسی سے واقف نہ تھے ۔ یہی لوگ ان کتابوں کو شوق سے پڑھتے اور نقلیں کرتے تھے ۔ ایک نقل سے دوسری نقل میں غلطیوں کا اور اضافہ ہو جاتا تھا ۔ اور کتاب غلط در غلط ہو جاتی تھی ۔ سوء اتفاق سے یہ دونوں

نسخے بہت ہی غلط بد املا اور بد خط ہیں۔ اگرچہ پرانی دکنی کتابیں پڑھتے پڑھتے مجھے اس کام کی رکان آگئی ہے تاہم ان مسخ شدہ اور غلط نسخوں کی تصحیح میں بہت وقت پڑی بعض بعض جملوں اور لفظوں کی تصحیح میں کئی کئی گھنٹے لگ گئے۔ کہیں قیاس سے کام نکل آیا اور کہیں سیاق عبارت سے باوجود اس کے اب بھی بعض مقامات مشکوک اور قابل تصحیح رہ گئے ہیں۔ اگر اس رسالے کا کوئی اور نسخہ ہاتھ لگ گیا تو آئندہ اس کی تصحیح میں آسانی ہو جائے گی بہرحال برا بھلا جو کچھ بن پڑا وہ پیش ہے۔ آخر میں بعض اجنبی اور غیر مانوس الفاظ کی فرہنگ بھی دیدی گئی ہے۔

عبدالحق

سائنس و فلسفه

۱۔ مقدمہ معرکۂ مذہب و سائنس
۲۔ مقدمہ مبادی سائنس

مُقَدَّمَہ

کتاب معرکۂ مذہب وسائنس

۱

جن لوگوں نے فردوسی کی زندہ کتاب شاہنامہ کو پڑھا ہے انھیں جنگ سہراب و رستم کی دلکش داستان یاد ہوگی۔ شاعر نے اس رزم کو اس خوبی اور لطف اور فصاحت کے ساتھ بیان کیا ہے اور تخیل میں وہ شان پیدا کی ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ دونوں آمادہ جنگ و پیکار ہیں لیکن ایک دوسرے سے بے خبر ہیں۔ اگر وہ ایک دوسرے کو پہچان لیتے تو یہ ہولناک سانحہ اور یہ پُرالم ٹریجڈی واقع نہ ہوتی۔

اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ لطف و فصاحت کے ساتھ امریکہ کے نامور فاضل ڈاکٹر ڈریپر نے مذہب و سائنس کی رزم دکھائی ہے

مصنف کا زورِ قلم اور تبحر شاعر کے تخیل کے قریب پہنچ گیا ہے۔ اس مضمون پر بحث کرنے میں تامل نہیں مصنف نے دنیا کے تمام علوم اور مذاہب اور انسانی فطرت پر ایسی تائر اور وسیع نظر ڈالی ہے کہ گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ کتاب ختم ہو جاتی ہے لیکن جنگ ختم نہیں ہوتی۔ پڑھنے والا سوچتا ہے کہ کیا یہ جنگ یونہیں ٹھنی رہے گی؟ کیا انسان ہمیشہ اسی دھکم پیل اور گرداب میں رہے گا؟ کیا وہ یونہیں اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتا رہے گا۔ اور نور ہدایت کبھی نہ پہنچے گا؟ رستم و سہراب کے حال سے تین شخص واقف تھے۔ ایک سہراب کا ماموں ژندہ رزم جسے اس کی ماں نے اسی غرض سے اس کے ساتھ کر دیا تھا۔ دوسرا ہنجیر۔ تیسرا کیکاؤس۔ لیکن افسوس کہ تینوں ہدایت سے باز رہے۔ پہلا

٭ میں اس موقع پر اس امر کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ اس کتاب کا ترجمہ بھی ایسا ہوا ہے کہ اردو زبان میں یادگار رہے گا۔ جہاں تک میرا علم ہے اردو زبان میں یہ پہلی علمی کتاب ہے جس میں اصل کتاب کے زور اور فصاحت کو بعینہ قائم رکھا گیا ہے۔ اس کتاب کے ترجمے میں دو بڑی مشکلیں تھیں ایک تو علمی اصطلاحات و علمی مباحث۔ دوسری زبان کی خوبی و فصاحت۔ اردو کی تنگ بضاعت زبان میں ان دونوں کا قائم رکھنا بہت دشوار کام تھا مگر مولوی ظفر علی خاں صاحب بی اے جو قابل مبارکباد ہیں اس مشکل کو نہایت خوبی سے آسان کر دیا ہے۔ لیکن یہ اسی سے ہو سکتا ہے جس کے قلم میں اس قدر زور اور جسے زبان پر اس قدر قدرت ہو جیسی فاضل مترجم کو حاصل ہے

درحقیقت نیک نیت ہے اور اسی کام کے لئے آیا ہے لیکن قبل اس کے کہ کچھ کرے رستم کے ہاتھ سے مارا گیا۔ دوسرا طرح طرح کے توہمات میں مبتلا ہو گیا اور اس نے جان بوجھکر اس راز کو چھپایا۔ تیسرے نے محض نفسانیت سے کام لیا۔ اسی طرح کی تین قوتیں مذہب وعلم کی مصالحت میں بھی کھنڈت ڈالنے والی ہیں یعنی جہالت مخالفت حق اور نفسانیت۔ لیکن توہمات اور نفسانیت ایک دن مٹ کر رہے گی۔ حق کا بول بالا ہوگا۔ دونو مخالف ایک دوسرے کو جان جائیں اور یہ بیچ کا کھنچا ظلمت کا پردہ درمیان سے اٹھ جائے گا۔ دوستی دشمنی سے۔ رنج راحت سے۔ اور ٹریجڈی کامڈی سے تبدیل ہو جائے گی۔ اور انسان کی کشمکش اور الجھن کا خاتمہ ہو جائے گا۔ کیونکر ہوگا اسے ہم آگے بیان کریں گے ۞

۳

بچے کو دیکھو اس کی ساری حرکات حیوانی اور اضطراری ہیں۔ اس کا ہاتھ پاؤں مارنا۔ غوں غاں کرنا۔ ڈر سے سہم جانا۔ پیار کرنے سے ہمک کر آنا۔ ماں کی محبت۔ غیروں سے وحشت۔ غرض یہ زمانہ ہے جب کہ حیوانی قویٰ کا غلبہ ہوتا ہے اور دماغی قویٰ ادنیٰ حالت میں ہوتے ہیں۔ جب بڑا ہو کر سیانا ہو جاتا ہے تو احساس اور خواہش کا زور شروع ہوتا ہے اور اعلیٰ دماغی قویٰ کے نشوونما سے نظام حیوانی کی قوت دھیمی پڑ جاتی ہے۔ احساس کی قوت بڑھ جاتی ہے اور حسی غدود اعصابی کی ساخت اور توسیع میں ترقی ہونے لگتی ہے۔ یہ حالت جوانی

دیوانی کی ہے۔ جب شباب کامل ہو جاتا ہے تو تیز حیوانی۔ احساس اور خواہشات عقل کی تابع ہو جاتی ہیں اور دماغی قوتیں اپنا رنگ دکھاتی ہیں۔

لہذا انسان کی نشو ونما کی تین صورتیں ہوئیں۔ حیوانی۔ احساسی اور عقلی۔

قوۃ الحیوانیہ کے ذریعہ سے انسان اپنے جسم میں قوت جذب کرتا ہے۔ اور پھر اُسے اپنے افعال۔ جذبات وخیالات اور ارادے میں صرف کرتا ہے۔ مثلاً جسمانی ورزش (یعنی اعصابی حرکت) سے بھوک لگتی ہے۔ سخت رنج والم یا غصہ یا دیگر جذبات کی وجہ سے آدمی نڈھال ہو کر کام سے رہ جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ حیات قائم رکھنے کے لئے ہمیں غذا کی ایسی ہی ضرورت ہے۔ جیسے انجن کو ایندھن کی یہی ایندھن یا غذا عضلات یا اعصابی ریشہ میں بدل جاتی ہے۔ جب ہماری قوت صرف ہو جاتی ہے تو ہمارا اندرونی انجن حساب پورا کرنے کے لئے ایندھن طلب کرتا ہے اگر غذا نہ پہنچے گی تو حساب میں فرق آجائے گا اور ضعف اس قدر بڑھ جائے گا کہ رشتہ حیات ٹوٹ جائے گا۔

قوۃ الحیوانیہ قوت جمع کر لینے کے بعد اسے حیوانی۔ حسّی یا عقلی حصے میں صرف کر سکتی ہے تمام حیوانات سوائے انسان کے اس قوت کو اپنی نشو ونما اور اس کے انتقال سے اپنی نسل کے نمو میں صرف کرتے ہیں ان میں جو تھوڑی بہت عقل ہوتی ہے وہ غذا کی تلاش اور گھر کی ساخت

اور زوج کی جستجو میں کام آتی ہے۔ انسان اس قوت کو جو وہ غذا سے حاصل کرتا ہے چاہے تو اپنے جسمانی حصے کی تکمیل میں صرف کر سکتا ہے اور چاہے تو دماغی تکمیل میں ایک گنوار کو دیکھو اس کی زندگی بہت کچھ جانوروں سے ملتی جلتی ہے۔ وہ بہت بڑی مقدار قوت کی حاصل کرتا ہے اور اسے وہ عضلات، گوشت اور خون کے بنانے میں صرف کر دیتا ہے۔ اس کا صرف یہ مقصد ہے کہ اپنی زندگی کو قائم رکھے اور اپنی نسل کو بڑھائے تعلیم کا یہ اثر ہے کہ وہ اُس قوت کو دماغ کی طرف رجوع کر دیتی ہے اور خون کی لہر تمام سطح پر پہنچاتی ہے جس سے خاکستری رنگ کے عروقی مادہ میں اکساد پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ تغیر خیال کے پیدا ہونے کی علامت ہے۔ دن میں جو کمی ہو جاتی ہے رات میں نیند اس کی تلافی کر دیتی ہے اور دماغی ذرات میں اضافہ اور دماغی تلطیف[۱] گہری ہو جاتی ہے اور اکساد کے لئے زیادہ گنجائش نکل آتی ہے۔ جس طرح بہت سی چیزیں خون کو بناتی اور بڑھاتی ہیں اسی طرح وہ بعض چیزوں کو بطور فضلے کے خارج بھی کرتا رہتا ہے جو پیشاب پسینہ وغیرہ کے ذریعہ سے نکل جاتی ہیں لیکن جس قدر قوت کہ جذب کی جاتی ہے وہ سب کی سب پیشاب وغیرہ کی راہ سے خارج نہیں ہو جاتی۔ بلکہ دماغی ورزش سے خیالات پیدا ہوتے ہیں اور وہ دماغ میں رہتے ہیں اور ان خیالات کو دماغ میں قائم رکھنے کے لیے بہت سا

---

[۱] تلطیف۔ نرم نمودن۔ مہربانی کردن

۵۔ قوت کا صرف ہوتا ہے یہ قوت اس طرح مستقر رہتی ہے۔
صرف غذا کے ذریعہ سے ہی قوت دماغ میں داخل نہیں ہوتی بلکہ ہر حس کے ذریعے سے کچھ نہ کچھ قوت پہنچتی رہتی ہے۔ اور ہر عضلہ قوت کا توازن قائم رکھتا ہے۔ باصرہ۔ سامعہ۔ ذائقہ۔ حرکت کی مختلف صورتیں ہیں۔ جس طرح برف آس پاس کی اشیاء سے ایک مقدار حرارت کی جذب کر لیتی ہے۔ یہ حرارت قوت کی ایک صورت ہے اور جب برف پانی کی شکل میں مبدل ہو جاتی ہے تو یہ قوت اس میں مستقر رہتی ہے۔ پانی جب بخار کی صورت اختیار کرتا ہے تو وہ اور زیادہ قوت جذب کرتا ہے۔ اس طرح انجماد و سیلان اور تبخیر قوت کی مختلف صورتیں ہیں۔ اسی طرح روشنی ایک قسم کی قوت ہے۔ جو روشن جسم کے اجزائے صغیر کی کپکپاتی ہوئی حرکت پر مشتمل ہے۔ اس کی لہریں آنکھ کی پتلی میں پہنچتی ہیں۔ اور پیچھے کی طرف ریٹنا (تشبکہ) پر جا کر لگتی ہیں۔ اور اپنی حرکت دماغی اعصاب تک پہنچاتی ہیں جہاں وہ روشنی کے علم سے خیال کو پیدا کرتی ہیں۔
آواز بھی ہوا کی حرکت ہے۔ جب ہم اپنی انگلی سے ستار کے تار پر ضرب لگاتے ہیں تو ہوا میں حرکت پیدا ہوتی ہے۔ اور اس کی لہریں کان تک پہنچتی ہیں جو وہاں سے ذہن (جو قوت ضبط) تک تموج پیدا کرتی ہوئی اعصاب باصرہ میں جا گونجتی ہیں۔ اور وہاں وہ موسیقی کے خیال سے
۷ مبدل ہو جاتی ہیں۔
غرض یہ کہ اعصابی فعل قوت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ہم اس صدمے کی

قوت کو جو سرخی کی شعاعوں سے تشکیل پر لگ کر دماغ پر پہنچتی ہے بتا سکتے ہیں لیکن نہیں کہہ سکتے کہ یہ قوت کہاں صرف ہوتی ہے۔ لہذا وہاں پہنچ کر یہ مستتر رہتی ہے جس طرح کہ سورج کی قوت کوئلے کی تہوں میں مستتر ہوتی ہے۔ اور اس وقت صرف ہوتی ہے جب وہ جلتا ہے اسی طرح سرخ روشنی کی موجوں کے صدمے سے جو قوت پیدا ہوتی ہے وہ دماغ میں پہنچ جاتی ہے اور وہاں جا کر خیال میں مبدل ہو جاتی ہے۔ اور حالت منفعل میں رہتی ہے۔

جہاں ادراک نہیں ہوتا وہاں کوئی خیال ہی نہیں ہوتا۔ مادر زاد اندھے کے دماغ میں سرخی کا کوئی خیال پیدا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ دیکھنے کے اعصاب میں وہ قوت نہیں پہنچی جس سے سرخی کا خیال پیدا ہوتا ہے نفی سے نفی پیدا ہوتی ہے۔ اور عالم خیال اور عالم مادی دونوں میں یہ حالت یکساں ہے۔

پس جس چیز کو ہم نے دیکھا سنا سونگھا یا چکھا نہیں اس کی نسبت ہم خیال بھی قائم نہیں کر سکتے۔

عالم خیال یادداشتوں کے مجموعے یا اس کے تصرف کا نام ہے یہ یادداشتیں ادراکات کے آثار باقیہ ہیں۔ اگر خیال صرف نہ کیا جائے گا تو وہ باقی رہے گا۔ مثلاً فرض کرو حسن کا خیال ہے جب ایک مصور کوئی تصویر بنا رہا ہے۔ اور اس خیال کو کام میں لانا چاہتا ہے۔ تو مستتر قوت اس کے دماغ میں سے فوراً نکل آتی ہے۔

جانور کا فعل اضطراری ہوتا ہے۔ جسے تمیز حیوانی کہتے ہیں وہ احساس ظاہری کے تابع ہوتی ہے تعقل سے اسے کچھ علاقہ نہیں۔ انسان میں احساس کا اثر اعصاب دماغی تک جاتا ہے جہاں خیال پیدا ہوتا ہے اور وہ خیال شامل حس رہتا ہے۔ ادراک عقل کا دروازہ ہے، احساس علم ہے بیرونی اشیاء کا جو جسمانی اثر سے حاصل ہوتا ہے۔ ادراک میں یہ اعصابی اثر ایک مرحلہ اور طے کرتا ہے اور بوجہ اس توافق کے جو دماغ اور بیرونی دنیا میں ہے یہ ذہنی صورت اختیار کرتا ہے اور عقلی یا دماغی مظہر بن جاتا ہے۔ بعض اوقات آوازیں ہمارے کان تک پہنچتی ہیں مگر ان کا کچھ اثر نہیں ہوتا اس لئے کہ ہماری توجہ دوسری طرف ہے۔ یا بعض اوقات ہم آوازیں سنتے یا کتاب پڑھتے ہیں۔ مگر تھوڑی دیر تک سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں لیکن جونہیں کہ رکاوٹ رفع ہو جاتی ہے احساس دماغی اعصاب تک پہنچ جاتا ہے اکساد واقع ہوتا ہے اور ان الفاظ کے مطابق جو ہمارے کان تک پہنچے تھے خیال کی صورت قائم ہو جاتی ہے۔

وہ اعصاب دماغی جو احساس سے متاثر ہوتے ہیں مقام جذبات لطیف انسانی ہیں۔ انسان میں یہ قوت ہے کہ وہ خیال کو جذبات لطیف کی صورت میں تبدیل کر سکتا ہے مثلاً میں نے ایک شئے دیکھی۔ اس کا ادراک خطرے کی صورت میں ظاہر ہوا۔ خوف کے جذبہ کو تحریک ہوئی دل دھڑکنا اور دم گھٹنا شروع ہوا۔

انسان میں دماغ بہت بڑی چیز ہے۔ یہ عقل کا دارالخلافہ ہے اور

اسی کی وجہ سے انسان وحیوان اور شائستہ اور غیر شائستہ انسانوں میں امتیاز ہوتا ہے۔ شائستہ اور مہذب اقوام کے لوگوں میں دماغ کی مقدار زیادہ ہوتی ہے بہ نسبت حبشیوں یا اور جنگلی لوگوں کے بھیل یا گونڈ کی زندگی کا انحصار اُس کے جسم کی چستی اور چالاکی پر ہے اس لئے اُس کی قوۃ حیوانیہ بہ نسبت دماغ کے جسم پر زیادہ تر صرف ہوتی ہے۔ بخلاف اس کے ایک مہذب اور تعلیم یافتہ قوم کے افراد کا انحصار زندگی عقل پر ہے اور اس لئے اس کی قوۃ الحیوانیہ دماغ کو بڑھاتی اور جسم کو کمزور کرتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عضلات کی ورزش سے جسم میں طاقت پیدا ہوتی ہے اس کے یہ معنی ہیں کہ ہماری قوۃ حیوانیہ کی توجہ زیادہ عضلاتی ریشوں کے بنانے میں مصروف ہو جاتی ہے ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ تعلیم سے فہم تیز ہو جاتا ہے یعنی قوۃ حیوانیہ دماغی مادہ کی پرورش میں لگ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ جسقدر ہم اپنی قوت عضلاتی ورزش میں صرف کرتے ہیں اسیقدر عقلی فعل کمزور ہوجاتا ہے اور جسقدر دماغی کام پر زور دیا جاتا ہے اسی قدر عضلاتی قوت ضعیف ہو جاتی ہے۔

دماغ کی فضیلت کے تو سب قائل ہیں لیکن جذبات انسانی کچھ ایسے قابل وقعت نہیں سمجھے جاتے حالانکہ یہ بھی بڑی چیز ہیں۔ لہذا اب ہم ان کی طرف توجہ کرتے ہیں جذبات عقلی تحریک کے بہت بڑے محرک ہوتے ہیں اور ہمارے رنج و راحت کا حساب انہیں کے ہاتھ میں ہے۔ بعض چیزیں ہم ایسی دیکھتے ہیں۔ یا بعض آوازیں ہم ایسی سنتے ہیں جو ہمیں بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ ہمارے جذبات ہماری عقل کو ابھارتے ہیں

کہ ایسا ڈھنگ نکال کہ اُن خوشگوار اثرات کا پھر اعادہ ہو سکے لیکن بخلاف اس کے جب ہم بعض چیزیں ایسی دیکھتے یا بعض آوازیں ایسی سنتے ہیں کہ وہ ہمیں ناگوار گزرتی ہیں تو ہمارے جذبات عقل کو ایسے ڈھنگ نکالنے پر مجبور کرتے ہیں۔ کہ ان کا نام نہ آنے پائے۔

مطالعہ میں اگر لطف نہ آئے تو انسان کی دماغی ترقی کا خاتمہ ہو جائے بال بچوں عزیزوں اور دوستوں سے محبت نہ ہو تو کوئی خاندان ہو پُر لطف محبت ہو۔ شکل رنگ اور آواز کے تناسب سے اگر خوشی نہ ہو تو فنون لطیفہ بھی نہ ہوں۔ یہ سب جذبات کا کھیل ہے۔

جذبات درحقیقت عقلی اور دماغی حرکت کا سرچشمہ ہیں اور ان کی نشو و نما انسان کی بہبودی اور ترقی کے لئے ایسی ہی ضروری ہے جیسی قوائے عقلی کی نشو و نما۔ خیالات اور جذبات کا تعلق ایسا گہرا ہے کہ وہ عموماً ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر کام کرتے ہیں لیکن بعض اوقات ان میں اَن بَن ہو جاتی ہے۔ مثلاً خواہش کا رجحان ایک خاص طرف ہے۔ مگر عقل کہتی ہے کہ نہیں یہ ٹھیک نہیں اور یہ ہی بنائے مخاصمت ہوتی ہے۔

جذبات کا اثر جسم پر بہت بڑا ہوتا ہے۔ زیادہ غصہ کرنے سے دل کی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ مارے شرم کے تمام سطح جسم پر خون دوڑ جاتا ہے۔ شدید جذبات کے اثر سے دماغی ریشوں میں بے ترتیبی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور دماغی امراض سے عقل میں فتور آ جاتا ہے ایک حیثیت

بدباطن کے چہرے کو دیکھئے پھٹکار برستی ہے بخلاف اس کے ایک نیک نفس زندہ دل کے چہرے کو ملاحظہ کیجیے جیسے پھول کھلا ہو۔

اسی طرح جسمانی حالت کا اثر جذبات اور جذبات کے ذریعہ سے دماغ پر پڑتا ہے۔ بیمار آدمی کیسے چڑچڑے اور غصہ ور ہوجاتے ہیں۔ قوی آدمی کے جذبات بھی قوی ہوتے ہیں اور ضعیف کے ضعیف جب طبیعت نڈھال ہوتی ہے تو خواہشیں بھی کمزور ہوجاتی ہیں

غرض جذبات اور عقل دماغ کی دو حالتیں ہیں ایک زنانہ ہے اور دوسری مردانہ۔ اگر صرف عقل ہی کی نشو و نما اور ترقی زیادہ ہوگی تو جذبات محدود اور کمزور ہوجائیں گے۔ اسی طرح اگر عقل کی طرف سے غفلت کی گئی اور جذبات کی پرورش زیادہ ہوئی تو انسان ذکی الحس اور بزدل عزیزا اور کم عقل ہوجاتا ہے۔

جذبات کا کام عقل کو تحریک دینا اور عقل کا کام جذبات کو اعتدال پر لانا ہے۔ وہ ایک دوسرے کی امداد کے لئے ہیں نہ کہ زائل کرنے کے لئے۔

عقل انسان میں تشخص اور خود اعتمادی پیدا کرتی ہے اور جذبات مدنیت اور انس بحیثیت عقل کے وہ ایک اور اکیلا ہے اور بحیثیت جذبات کے وہ منجملہ اوروں کے ایک ہے۔ پرزور عقل و دماغ کا آدمی اپنے ابنائے جنس سے بھاگتا اور صحبت سے نفرت کرتا ہے

اور تنہائی میں خوش رہتا ہے۔ لیکن پرزور جذبات والے آدمی کے لئے تنہائی موت ہے۔ وہ دوسروں میں ایسا گھل مل جاتا ہے کہ اس میں رفتہ رفتہ رنگ تشخص غائب ہو جاتا ہے۔ اور خیالات کو باقاعدہ ترتیب دینے کی قوت نہیں رہتی۔ پرزور عقل و دماغ کا آدمی خود مختار اور آزاد سا ہو جاتا ہے اور سوسائٹی میں رہنے کے قابل نہیں رہتا جہاں عقل ہی عقل ہوتی ہے۔ اور جذبات نہیں ہوتے وہاں صرف اپنی حفاظت اور اپنا ہی خیال ہوتا ہے۔ جو خود غرضی تک پہنچ جاتا ہے جذبات ہمیں صرف اپنی ایک ذات تک نہیں رکھتے بلکہ دوسروں کی طرف بھی مائل کرتے ہیں۔ دوسرے انسانوں اور اشیائے قدرت سے محبت ہوتی ہے اوروں کے درد کو ہم اپنا درد سمجھنے لگتے ہیں اور رحم کے ذریعہ سے دماغی قویٰ اور علوم و فنون میں ترقی ہوتی ہے۔

عقل اور جذبات میں اتحاد پیدا کرنا۔ ظاہر اور باطن میں موافقت قائم رکھنا۔ ایک دوسرے کو حد اعتدال سے نہ بڑھنے دینا جسم کے افعال کو عقل و جذبات کے زیر حکومت رکھنا مذہب کا کام ہے۔

فلسفہ و منطق اور علوم نظری عقل کو بڑھاتے اور ترقی دیتے ہیں تمدن۔ پالٹیکس اور اتحاد مقاصد انسانی و قومی جذبات کو فروغ دیتے ہیں لیکن مذہب کا حق یہ ہے کہ وہ عقل و جذبات کو ساتھ ساتھ اور برابر بڑھائے۔ باہم اعتدال قائم رکھے۔ اور قوت حیوانی کو دماغی اور احساسی حقہ جسم کی پرورش اور نشو و نما میں یکساں صرف کرے۔

۳

حیات کے دو مقصد ہیں۔ ایک ذاتی ترقی دوسرا افزائش نسل۔ قوت کے انجذاب کے لئے ضرور ہے کہ اس کا اندفاع بھی کیا جائے اور اس غرض سے کہ وہ مادہ اور قوت کا انجذاب اور اندفاع کر سکے حیات کے لئے ضرور ہے کہ اس میں معرفت طبعی ہو۔ جہاں ساخت اعضا اونٹے درجہ کی ہے وہاں یہ کم ہوتی ہے اور جہاں ساخت پیچیدہ ہوتی ہے وہاں زیادہ ہوتی ہے۔

بقول لب منز کے حیات حجریات میں سوتی ہے۔ پھولوں میں خواب دیکھتی ہے اور انسان میں جاگتی ہے۔

اس معرفت طبعی میں ارادہ ہونا چاہئے زندہ رہنے بڑھنے اور نسل کے بڑھانے کا۔ نیز طبعی تمیز ہونی چاہیے جس کے ذریعہ سے وہ سیکھے کہ کیونکر زندہ رہنا بڑھنا اور نسل بڑھانی چاہئے۔ بغیر اس تمیز کے ترقی حیات کے لئے مناسب اور غیر مناسب اشیاء کا انتخاب کرنا ناممکن ہے اور بغیر اس ارادہ کے کہ زندہ رہنا چاہئے اس علم سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔

تمیز طبعی افزایش اور نشو ونما کا پیمانہ ہے۔ اس کا تعلق ہر وجود کی ضروریات سے اس طور پر ہے کہ حیات کے اُن دو مقاصد کے لئے کافی ہو۔ کیونکہ اگر یہ تعلق اس طرح قائم نہ ہو تو ممکن ہے کہ اس کی قوت ایسی شئے کے حاصل کرنے میں صرف ہو جائے جو حاصل نہیں ہو سکتی اور قوت کی تولید ضائع اور بیکار ہو جائے۔ پودے کو نشو ونما کے لئے روشنی کی ضرورت

ہے اگر یہ پودا کسی اندھیرے اور گرم حجرے میں لگا دیا جائے تو جو قوت اس نے زمین سے حاصل کی ہے وہ اس شے کے حصول کی کوشش میں صرف ہو جائے گی جو وہاں نہیں مل سکتی جب یہ قوت اس کوشش میں صرف ہو جائے گی تو وہ مرجھانا شروع ہو گا۔ اور مر جائیگا۔

پودے کی نشوونما کیلئے جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ پانچ چھ ہیں۔ وہ اُسے کچھ تو اس زمین سے حاصل ہو جاتی ہیں جس میں وہ لگا ہوا ہے اور کچھ ہوا اور روشنی سے ؛

حیوانی زندگی کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ ایک جگہ نہیں بلکہ دُور پھیلی ہوئی ہیں۔ اور ان کے جمع کرنے کے لئے اُسے حرکت کی ضرورت ہے۔ لہٰذا وہ اُسے دی گئی ہے۔

حیوانات کو ایک اور محرک شے عطا ہوئی ہے جو پودوں میں نہیں یعنی خوشی کا احساس یہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ ایسا فعل کرتا ہے جو اس کی کامل نشوونما کا باعث ہوتا ہے اور ایک احساس تکلیف کا ہے جو اس وقت ہوتا ہے جب کہ اس سے ایسا فعل صادر ہو جو اس کی ترقی کو روکے اگر اُسے تکلیف محسوس نہ ہو تو وہ کھانے کی بھی کوشش نہ کریگا اور اس طرح اس کی حیات کا خاتمہ ہو جائے گا۔

حواس ارادہ کو اُکساتے اور تمیز طبعی کو سبق دیتے ہیں۔ لیکن نہ وہ ایک دوسرے سے مقدم ہیں اور نہ ایک دوسرے کا پیدا کرنیوالا ہے۔ چھوٹا پرندہ انڈے کے اندر نہ صرف خیال کرتا ہے بلکہ اس نے

فعل بھی صادر ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ نکلنے کے لئے خول توڑتا ہے۔ اور باہر نکلتے ہی دانہ چگنے کے لئے چونچ کھولتا ہے۔ قید کی حس نے اس کے ارادے کو اُبھارا جس سے اس کے عضلات حرکت میں آئے اور خول ٹوٹ گیا۔ لیکن یہ تمیز طبعی کا کام تھا تجربہ سے کچھ علاقہ نہیں کیونکہ اس سے پیشتر وہ کون سے ایسے محبس توڑکر باہر نکلا تھا۔ اسی تمیز نے اس کی چونچ کھلوائی۔ یہ ننھا سا جانور زندہ ہے اور زندہ رہنے کی خواہش رکھتا ہے۔ اسے زندگی دی گئی ہے اور زندگی کے ساتھ زندگی کی محبت بھی عطا ہوئی ہے۔ چھوٹا بچہ دنیا میں ارادے تمیز طبعی اور احساسات کے ساتھ آتا ہے۔ زندہ رہنا اس کے لئے لطف ہے۔ خواہش اس کا پہلا احساس ہے۔ اس خواہش کا پورا ہونا اس کی پہلی خوشی ہے۔ خواہش کا پورا نہ ہونا اس کی پہلی تکلیف ہے اور اس کی طلب اس کی پہلی کوشش ہے۔ کس تجربہ نے اسے یہ بتایا ہے کہ منہ اور گلے کے ذریعہ سے دودھ کا پینا اس کی زندگی کے لئے ضروری ہے یہ تمیز طبعی ہے جس نے اسے اس فعل پر آمادہ کیا جس سے اس کی بھوک کا احساس رفع ہوا۔

حیوانات کو خوشی اور تکلیف کے ایسے احساسات ہوتے ہیں جو ان کے حیوانی نشوونما کا باعث ہوتے ہیں۔ ہر چیز جو حیوان کے اردگرد پائی جاتی ہے جہاں تک کہ اس کی ذاتی نشوونما یا اس کی نسل کی افزائش کا تعلق ہے یا تو اسے خوشی دیتی ہے یا تکلیف۔

نظام اعصابی ایک بڑا قوی آلہ قوت پہنچانے کا ہے۔ تمام جسم پر

جسی اعصاب پھیلے ہوئے ہیں۔ اور یہ سب اعصابی مرکز سے پھوٹتے
ہیں جس میں باریک باریک اعصابی جڑیں ہوتی ہیں اور آپس میں خوب
ملی ہوئی ہیں۔ سب سے بیرونی عصبیہ جو اثر حاصل کرتا ہے وہ اسے دماغ
تک پہنچاتی ہیں۔ اور وہاں یہ اثرات یا خیالات جمع رہتے ہیں اور ان
خیالات پر سے افعال سرزد ہوتے ہیں۔ دوسرے حیوانات خیالات
پر سے کام نہیں کرتے ہیں۔ سوائے اس حالت کے جب وہ ان دو مقاصد
کے مفید ہوں۔ یعنی ذاتی فلاح اور افزائش نسل ؎

انسان اور بھی کئی باتوں میں دوسرے حیوانات سے مختلف ہے
دوسرے حیوانات کو جو گرمی سردی محسوس کرسکتے ہیں۔ فطرت نے لباس
اور پناہ دے رکھی ہے۔ مثلاً ان کے بال یا پر یا خول ہوتے ہیں یا زمین
کے اندر کھوؤں اور غاروں میں رہتے ہیں۔ جہاں گرمی سردی کا گزر
نہیں۔ لیکن جسم انسان کی اعصابی سطح بہ نسبت دوسرے حیوانات کے
احساس کرنے میں بہت تیز ہے۔ اور تاہم وہ دنیا میں بے بال و پر کے
ننگا منگا آتا ہے لہذا اُسے مصنوعی لباس کی ضرورت ہوئی لیکن لباس
کے تیار کرنے کے لئے اُسے ایسی قوت عطا کی گئی ہے جو دیگر حیوانات کی
تمیز طبعی سے اعلیٰ ہے ؎

اسی طرح عقل انسان کی حیوانی فطرت کے لئے ضروری ہے۔ ہر حیوان
کو ایسی قوت عطا ہوئی ہے جو اُس کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے کافی ہوتی ہے
اور یہ قوت اس ضرورت کی مناسبت سے ہوتی ہے ؎

بھیڑ مادّہ اور قوت کو غذا کے ذریعہ سے اپنے میں جذب کرتی ہے اور وہ قوت اُون کی شکل میں مادّہ کو پیدا کرتی ہے۔ انسان میں بھی مادّہ اور قوت ایک دوسری صورت اختیار کرتا ہے اور دماغ پیدا کرتا ہے جو اسے مصنوعی طور سے سردی سے بچانے میں مدد دیتا ہے

اگر ہم انسان کی قوتوں پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ان کی وسعت محض شہوانی زندگی تک نہیں بلکہ اس سے پرے تک پہنچتی ہے۔ ممکن ہے کہ ایک جنگلی انسان کی خواہش اپنی حفاظت تک محدود ہو۔ مگر کثرت سے اقوام انسانی ایسی ہیں جن کی حالت اس سے مختلف ہے۔ ان کی آنکھوں اور کانوں کے ذریعہ سے دماغ میں وہ روشنی پہنچتی ہے جو ہماری زندگی کے اس حصہ کو منوّر کرتی ہے جسے حیوانی یا مادّی زندگی سے کچھ تعلق نہیں۔ ہمیں رنگوں کے تناسب حسن صورت اور آوازوں کی موزونیت میں خاص لطف آتا ہے حیوانی زندگی کو ان کی مطلق ضرورت نہیں۔ انسان محسوس کرتا ہے کہ اس میں حیوانی احساس کے علاوہ ایک اور احساس بھی ہے جسے روحانی کہنا چاہیے۔ کیونکہ اگر ہم اسے نہیں مانتے تو ایک خاص سلسلہ فطرتی تمیزوں۔ احساسات اور قوت ارادی کا محض بیکار رجاتا ہے۔ انسان ایسی اشیاء سے بجد مسرت اور لطف حاصل کرتا ہے۔ جنھیں اس کے حیوانی احساس سے کچھ تعلق نہیں۔ آسمان پر خوشنما اور خوش رنگ دھنک کو دیکھ کر کتے یا گھوڑے کو کچھ احساس نہیں ہوتا۔ حالانکہ انسان اس سے لطف اٹھا

ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ اس کے دیکھنے سے اُس کی روحانی زندگی پر اثر پڑتا ہے۔ جو اس کی نشو و نما کے لئے ضروری ہے یہاں تک کہ بچے بھی اس لطف کا اظہار کرتے ہیں۔ لوری یا گانا سننے سے انھیں بھی مزہ ملتا ہے۔ خوب صورت پھول دیکھنے سے وہ بھی اسی طرح خوش ہوتے ہیں۔

انسان کی ساخت میں حصہ اسفل میں حیوانی آلات ہیں اور حصہ اعلیٰ میں روحانی آلات۔ حصہ اسفل کو ہاضمہ اور توالد سے تعلق ہے اور حصہ اعلیٰ قوت حاصل کرنے کا آلہ ہے۔ جسے حصہ اسفل توالد و تناسل میں صرف کر دیتا ہے حصہ اعلیٰ میں دماغ یعنی مقام عقل ہے۔ قوت حیوانی ارادے کے زور سے ہر طرف پہنچ سکتی ہے۔ جذبات گویا اس طرح واقع ہیں کہ ذرا سی ٹھیس سے فطرت حیوانی یا فطرت روحانی کی طرف مائل ہو سکتے ہیں۔

وحشی اقوام میں قوت حیات شہوانی زندگی میں صرف ہوتی ہے اور دماغ بیکار رہتا ہے لیکن تعلیم یافتہ اقوام میں قوت حیات زیادہ تر دماغ کی طرف مائل ہوتی ہے اور شہوانی زندگی کمزور ہو جاتی ہے۔ کیونکہ سخت دماغی محنت سے اعصابی ریشے زیادہ بیکار ہوتے ہیں اور ان کی درستی کے لئے دوسرا اعصابی مادہ صرف ہوتا ہے۔ اور وہ ذرات جو توالد و تناسل کے لئے ضروری ہیں یعنی بند ہو جاتے ہیں۔ لہذا جس قدر دماغی محنت کی جائے گی اسی مناسبت سے وہ توالد و تناسل کے مزاحم ہو گی۔ کیونکہ دماغی محنت میں وہ تمام قوت صرف ہو جاتی ہے جو بصورت دیگر اُن

ذرات کے بنانے میں صرف ہوتی جو توالد و تناسل کا باعث ہوتے ہیں۔

جب توجہ فطرتِ حیوانی کی طرف ہوتی ہے اور جذبات و عقل کو اس کے تابع کر دیا جاتا ہے تو دماغ صرف اسی قدر کام دیتا ہے۔ جیسے دوسرے حیوانات میں تمیز طبعی اُس وقت وہ مسرت جو حصول علم۔ ورزش عقل احساس حسن وغیرہ سے ہو سکتی ہے زائل ہو جاتی ہے۔ بخلاف اس کے جب عقل پر مزید زور دیا جاتا ہے تو رنج و راحت کا وہ احساس جو اُن چیزوں سے حاصل ہوتا ہے جو حیوانی فطرت سے بہت پرے ہیں تیز ہو جاتا ہے اور فطرتِ حیوانی کمزور ہو جاتی ہے۔

رنج و راحت کا ادراک کیا ہے؟ یہ درحقیقت قوت کی تحلیل کا نام ہے چنانچہ دوسرے حیوانات کی زندگی کو دیکھو کہ انسان کو جن چیزوں سے لطف آتا یا صدمہ ہوتا ہے انہیں نہیں ہوتا۔ ایک گنوار کو عمدہ تصویر یا خوشخط کتاب دکھاؤ اسے کچھ لطف نہ آئیگا۔ کیونکہ اس کے دماغ میں کوئی شئے اُسے گرفت یا تحلیل کرنے والی نہیں ہے۔ اُس کی حالت صاف شیشے کی چادر کی سی ہے جس میں شعاعیں آئیں اور نکل گئیں۔

اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح مادی قوت سے ایک روحانی قوت بھی ہے اور روحانی توالد و تناسل کا سلسلہ عالم خیال میں جاری ہے، مگر اس طرح نہیں جیسے ہم عالم مادی میں پاتے ہیں۔

پانسو برس ہوئے ایک بڑے دانشمند نے ایک کتاب لکھی تھی جس کے خیالات ننھے ننھے بیج سے تھے جو ڈال دیئے گئے۔ میں نے اس کتاب

کو کھولا اور پڑھا۔ اُن بچوں نے میرے دماغ میں جڑ پکڑی۔ بڑے ہوئے اور پھولے پھلے۔ میں نے ان خیالات کو بات چیت یا تحریر کے ذریعہ سے دوسروں تک پہنچایا۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ وہی خیالات وہی باتیں وہی تخیل نسلاً بعد نسلٍ پیدا ہوا اور بڑھا اور زمانہ کی مناسبت سے ان میں تغیر و تبدل بھی ہوتا رہا۔ گویا یہ سب اُن اصلی خیالات کی زندہ اولاد ہیں جو اُس وقت وجود میں آئے تھے جب تاریخ کا نام و نشان بھی نہ تھا۔

قطع نظر اس قیاس کے ہم مادی دنیا میں دیکھتے ہیں کہ قوت میں کیسی کیسی بڑی بڑی تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ مثلاً قوت ہی کے تغیر و تبدل سے روشنی حرارت اور برق جیسی مختلف صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح دماغ میں بھی تغیر و تبدل سے قوت افعال ارادہ ادراک اور خیالات و جذبات کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

حیوانی زندگی میں رنج و راحت سے قوت کی تحلیل کا پتہ لگتا ہے اور ہم اُس قوت کا اندازہ جو بڑھتی اور نشو و نما پاتی ہے اُس قوت سے کر سکتے ہیں جو جذب یا داخل ہوئی تھی۔ روحانی زندگی میں رنج و راحت قوت کی تحلیل کو ظاہر کرتے ہیں۔ جو قوت کہ جذب ہوتی ہے وہ خیالات کے سلسلہ سے نشو و نما پاتی ہے۔

مقصد حیات جس کے کارکن رنج و راحت ہیں حیوان کی نشو و نما اور اس کی نسل کی افزائش ہے۔

روحانی احساس کا مقصد روحانی زندگی کی نشو و نما ہے جسم میں

قوت کا انجذاب ہوتا ہے۔ اسی مناسبت سے اندفاع ہوتا ہے۔ اب جو باقی رہی اس سے نشوونما ہوتی ہے حیات کے ذریعہ سے روحانی زندگی بڑھ سکتی اور نشوونما پا سکتی ہے۔ ہر درخت اور حیوان کی نشوونما کی ایک حد ہے۔ تو روحانی زندگی کی حد کیا ہے؟

جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہمیں ایسی مسرتوں کا احساس ہوتا ہے جنہیں مادی فلاح سے کچھ تعلق نہیں تو ہمیں یقین ہوتا ہے کہ ہم میں کوئی ایسی قوت ہے جو ہمیں کسی خاص سمت میں لئے جا رہی ہے وہ سمت کیا ہے؟

دنیا نے اس کے دو جواب دیے ہیں۔ ایک یہ کہ انسان کی غایت تمدنی اور پولیٹیکل ترقی ہے اور اسی پر اسے ساری ہمت اور قوت صرف کر دینی چاہیے۔ اس خیال کی بنا پر بنی نوع انسان کل ایک ہیں جن کا مقصد موجودہ کی تکمیل اور آئندہ کا کمال ہے۔ گزشتہ تجربے اور علم سے فائدہ اٹھا کر موجودہ زمانہ زیادہ ترقی یافتہ ہے اور آئندہ زمانہ موجودہ سے زیادہ ترقی یافتہ ہوگا۔ غرض تمام توجہ اور خیال انسان کی آئندہ ترقی پر ہونا چاہیئے۔ اور نیکی اور برائی اسی میں ہے جس سے عام بنی نوع انسان کی بہبودی یا مضرت متصور ہو۔

لیکن اس پر اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ عقلی ترقی جسمانی انحطاط کا باعث ہوتی ہے جوں جوں تہذیب ترقی کرتی جاتی ہے اس میں ایسی خرابیاں پیدا ہوتی جاتی ہیں۔ جو وحشی اقوام میں نہیں پائی جاتیں۔ ایک وحشی قوم کے بد قوارہ ضعیف اور مریض افراد بچپن ہی میں مر جاتے ہیں۔ مہذب

ممالک میں امراض اور جسمانی نقائص بڑھتے اور نشو و نما پاتے ہیں۔ کیونکہ سائنس ان خرابیوں کی حفاظت کرتا انہیں پھیلاتا اور آئندہ نسلوں تک پہنچاتا ہے۔ وحشی اقوام میں از روئے انتخاب فطری ضعیف اور مریض خود بخود مر جاتے ہیں۔ مہذب اقوام میں اس قانون پر عمل نہیں ہونے پاتا اور اس لئے قوم میں انحطاط پیدا ہو جاتا ہے۔

سب سے ادنےٰ جانداروں میں سب سے زیادہ افزائش نسل ہوتی ہے بعض چھوٹے جان دار ایسے پائے گئے ہیں کہ چند گھنٹوں میں اس قدر بچے پیدا کر دیتے ہیں کہ شمار سے باہر ہیں۔ دودھ پلانے والے جانوروں میں بلوغ تک پہنچنے کے لئے ایک زمانہ درکار ہوتا ہے اور بچے بھی کم پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح جن جانوروں میں عقل کا درجہ بڑا ہے ان میں اولاد بھی کم ہوتی ہے۔ انسان میں بھی یہی قاعدہ جاری ہے۔ غریب لوگ جنہیں جسمانی ورزش زیادہ کرنی پڑتی ہے اور عقل سے کام کم لینا پڑتا ہے۔ ان کے کثرت سے بال بچے ہوتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ جنہیں دماغی محنت زیادہ کرنی پڑتی ہے ان کے اولاد کم ہوتی ہے۔

علاوہ اس کے تمدنی ترقی تقسیم کار میں ہے۔ غیر متمدن حالت میں جو کام ایک شخص کرتا تھا وہ اب بیس شخص کرتے ہیں پہلے ایک ہی شخص لوہار۔ بڑھئی۔ درزی۔ موچی۔ معمار ہوتا تھا۔ تھوڑی ترقی کے بعد لوہار کا کام ایک کرنے لگا۔ بڑھئی کا دوسرا۔ درزی کا تیسرا۔ موچی کا چوتھا۔ معمار کا پانچواں اسی طرح اب ایک ایک پیشہ ایک ایک شخص کو مل گیا۔ اب جو اور ترقی ہوئی تو

ایک ہی پیشہ کی کئی شاخیں ہوگئیں اور ہر شاخ کا کام علیحدہ علیحدہ شخص کرنے لگے اور روز بروز کام کی تقسیم کو ترقی ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک شخص بولتا جاتا ہے۔ دوسرا لکھتا ہے۔ تیسرا صاف کرتا ہے۔ چوتھا اسے صحیح کرتا ہے۔ حالانکہ یہ ایک ہی شخص کا کام ہے۔ کیا درحقیقت یہ تقسیم کار ترقی کی علامت ہے؟

انسان یہاں کچھ ایسے بکھیڑوں اور مصیبتوں میں پھنسا ہوا ہے کہ اس کی خوشی کا دارومدار زیادہ تر اس کی ذات پر ہے۔ اسے یہہ خیال ہرگز تسلی نہیں دیسکتا کہ آئندہ دو ہزار یا تین ہزار سال کے بعد انسان کی یہ تکلیفیں رفع ہو جائیں گی۔ اس خیال سے اُس کی تکلیف یا دردمیں تخفیف نہیں ہو سکتی۔ دوسرے ایک ایسی قوم میں جو اعلیٰ درجہ کی مہذب نہیں خوشی کی مقدار بہت زیادہ ہے بہ نسبت ایک ایسی قوم کے جو بہت زیادہ ترقی یافتہ اور مہذب ہے ایک گنوار یا کھیت کے مزدور کو دیکھو کیسا خوش اور مگن ہے۔ برخلاف اس کے دنیا کے بڑے بڑے شہروں میں جاؤ۔ مثلاً لندن پیرس۔ چکاگو۔ نیویارک میں جو چشم و چراغ عالم کہلاتے ہیں۔ وہاں امرا خوشی کی جستجو میں مارے مارے پھرتے ہیں طرح طرح کی کوشش کرتے ہیں دولت صرف کرتے ہیں لیکن پھر بھی خوش نہیں رہ سکتے اور غریب ہیں کہ قعر ذلت و افلاس میں پڑے ہیں۔ لہذا محض تمدنی و پولیٹیکل ترقی اور محض یہ خیال کہ آئندہ کسی بعید زمانے میں یہ تکلیفات اور رکاوٹیں رفع ہو جائیں گی انسان کے دل کو تسلی نہیں دے سکتا۔

اب دوسرا جواب مذہبی عقیدہ میں ہے۔ مذہبی خیال میں حیوانی فطرت کو دخل نہیں۔ ذاتی یا انفرادی مقصد انسان کو زیادہ تحریک دیتا اور ابھارتا ہے بہ نسبت ایک ایسے مقصد کے جس کا تعلق عام بہبودی سے ہو۔ اور انسان میں ایک ایسی خواہش موجود ہے اس میں کچھ شبہ ہو نہیں سکتا۔ عام بہبودی یا ایثار کا خیال ذاتی بہبودی کے خیال کو روک دیگا۔ اور تمدنی اور سیاسی ترقی کی طرف لے جائے گا۔ انفرادی بہبودی کا خیال انفرادی ترقی کا باعث ہوگا۔ اُن قویٰ اور امتیازات کا وجود جو انسان کو دیگر حیوانات سے تمیز کرتے ہیں قطعی ہے۔ دوسرے حیوانات اس وقت تک نہ کوئی خیال سوچتے ہیں اور نہ کسی خیال کو اپنے خواہش کا مصداق قرار دیتے ہیں جب تک کہ وہ اُن کی ذاتی نشو و نما یا ترقی کا باعث نہ ہو۔ گھوڑا کبھی گوشت کھانے کا خیال نہیں کرتا کیونکہ وہ اس کی نشو و نما کے لئے ضروری نہیں ہے پس وہ چیزیں جن کے لئے انسان کی حیوانی فطرت خواہشمند ہے ضرور حقیقی وجود رکھتی ہیں۔ اسی طرح وہ چیزیں جن کی طرف انسان کی دماغی اور جذباتی فطرت دوڑتی ہے ان کا بھی ضرور کوئی وجود ہے۔ تمیز طبعی ایک قسم کی خواہش ہے جو ہمارے وجود کے قانون کا اتباع کرتی ہے اور ہر قانون کا مقصد مخلوق کی خوشی اور تکمیل ہے۔

انسان کی مذہبی تمیز کا سراغ لگانا اس کی بہبودی کے قانون کا سراغ لگانا ہے۔ جب مذہبی تمیز ہم میں نمودار ہوتی ہے تو وہ ہماری روحانی

فطرت کی آواز ہے۔ جو اس غذا کو طلب کرتی ہے جو اُس کی حیات و تکمیل کے لئے ضروری ہے۔ جب کبھی مذہبی تمیز ہمیں غلطی کی طرف لے جاتی ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ مذہبی تمیز غلط ہے بلکہ یہ بات ہے کہ اس نے اسی قسم کی دوسری تمیزوں کو دبا دیا ہے۔ مثلاً ہر طریقہ گورنمنٹ صحیح اصول پر قائم ہوتا ہے۔ لیکن جب وہ دوسرے صحیح اصولوں کو پائمال کر دیتا ہے تو اس طریقہ گورنمنٹ میں زوال شروع ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مذہب میں غلطی پیدا ہوتی ہے۔ یعنی جب وہ مجموعہ تو ہمات ہو جاتا ہے تو اس کے نظام میں خرابی واقع ہو جاتی ہے۔ کسی ایک صداقت میں مبالغہ کیا جاتا ہے اور اسے آسمان پر چڑھا دیا جاتا ہے اور دوسری صداقتوں سے بالکل روگردانی اختیار کر لی جاتی ہے۔ اس وقت مذہب کو زوال شروع ہوتا ہے۔

۴

انسان میں دو طبعی تمیزیں ایسی ہیں جن کا اثر انسان کی تمدنی زندگی پر بہت بڑا ہوتا ہے۔
ان میں سے ایک تو ہر واقعہ کے سبب دریافت کرنے کی جستجو ہے دوسرے منتہائے کمال کا تصور۔ اب ہم ان دونوں پر الگ الگ غور کریں گے۔
انسان کے دماغ پر دو قسم کے اثرات پڑتے ہیں۔ ایک بیرونی

اشیاء کا اثر حواس کے ذریعہ سے یعنی حس ایک ذریعہ ہے جس سے بیرونی اشیاء اور دماغ میں تعلق قائم ہوتا ہے اگر کسی میں کوئی حس نہیں تو اس حس کی وجہ سے جو خیال قائم ہوتا ہے وہ نہیں ہو سکتا۔ مثلاً ایک مادر زاد اندھے کو سرخی کا کوئی خیال نہیں ہو سکتا۔

دوسرے اندرونی اثرات جو دماغ خود اپنے تعلق سے جس سے انسان کی شخصیت قائم ہے۔ حاصل کرتا ہے۔ یہ مسرت، غصہ اور خواہش کے ادراک ہیں۔

یہ ادراکات مفرد اور غیر منقسم ہیں اور تعریف کی حدود میں نہیں آ سکتے گویا معرفت طبعی کے انتہائی سالمات ہیں۔ جن کے ملنے اور ترکیب پانے سے بے شمار مختلف صورتیں قائم ہوتی رہتی ہیں۔ انہیں ادراکات پر بعض ایسے ابتدائی عقائد کی بنیاد ہے جو بہت عام ہیں اور انسان بہت ابتدا میں انھیں حاصل کرتا ہے۔

علت و معلول کا عقیدہ بھی اسی قسم کا ہے۔ تمیز طبعی انسان کو علت و معلول کی تلاش پر ابھارتی ہے۔ کیونکہ اس کی صداقت کا اسے پورا یقین ہے۔ بغیر اس کے دنیا کی ترقی ناممکن ہے۔ اور دنیا محض اتفاقی نتائج کا مجموعہ نظر آئے گی۔ اور حکمت و سائنس اور علم اخلاق کا مطالعہ بیکار ہوگا۔

علت کے معنی کیا ہیں؟ جس کی وجہ سے کوئی شے وجود میں آتی ہے علت اولیٰ کہلاتی ہے اور بعد ازاں جو اس میں تغیر و تبدل کرتی ہے

اُسے علت ثانیہ کہتے ہیں اگر کوئی جسم جو حرکت میں ہے کسی دوسرے جسم سے جو ساکن ہے ٹکرائے اور اُسے حرکت دے تو اس کی علت ثانیہ پہلے جسم کی قوت متحرکہ ہے۔ لیکن ساتھ ہی خیال اس طرف بھی جاتا ہے کہ پہلے جسم کی حرکت کی بھی کوئی علت ہے۔ علل ثانیہ ایک سلسلہ علل کا ہے جو علت اولیٰ پر جاکر ختم ہوتا ہے اور انسان فطرتاً علل ثانیہ کے سلسلہ میں اُس مصدر حرکت کو ٹٹولتا ہے۔ جو خود بخود پیدا ہوئی اور جسے وہ علت اولیٰ کہتا ہے۔

علت کا خیال مفرد نہیں ہے۔ بلکہ اس میں ایک تو خیال وجود کا ہے اور دوسرے اُس کا تعلق جو عدم سے وجود میں آتا ہے۔ صرف وجود کا ہونا علت کے خیال کے لئے کافی نہیں۔ کیونکہ اس کے متعلق یہ تصور کرنا ممکن ہے کہ وہ سلسلہ علت و معلول سے بالکل الگ ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ایک شے ہے تو اگرچہ ہم صحیح طور پر نہیں کہہ سکتے کہ اس بیان سے کیا مطلب ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ہم اُسے پورے طور سے سمجھ لیتے ہیں۔ اب اگر ہم ان تمام اشیا کو جو ہیں میں الگ کردیں۔ نیز ہم یہ فرض کریں کہ کوئی اور ایسی شئے نہیں ہے جو ان کے پیدا کرنے والی ہو یا ان کے پیدا کرنے میں اُس نے حصہ لیا ہو۔ تو عدم سے وجود میں آنے کی حالت ہمارے لئے بالکل ناقابل تصور ہوگی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عدم سے وجود میں آنے کی حالت کا خیال بالکل ناممکن ہے۔

جو عدم کی حالت سے وجود میں آتا ہے تو اُسے اس حالت کے

کرنے کے لئے ایک ایسی شے کی ضرورت ہے جو اس سے بالکل الگ ہو۔ یہ انسان کا ابتدائی عقیدہ ہے جو کسی طرح مٹ نہیں سکتا۔ یہاں تک کہ جو فلسفی سلسلۂ علت و معلول سے انکار کرتے ہیں وہ بھی اپنی زندگی میں ہر وقت اور ہر آن اسی پر عمل کرتے ہیں۔

کیا یہ عقیدہ قابل اعتماد ہے یا محض دھوکا ہے؟

اگر یہ دھوکا ہے تو کیا وجہ ہے کہ انسان علت کا خیال اُس واقعہ سے متعلق کرتا ہے جو دوسرے واقعہ سے وقت میں مطابق یا اس سے قبل ہے چاند کی تبدیلی اور موج کی مد ایک ہی وقت میں پائی گئی۔ انسان نے چاند کی تبدیلی کو موج کی مد کا باعث قرار دیا۔ لیکن یہ کیوں نہیں خیال کیا کہ چاند کی کمی بیشی موج کی مد و جزر کی تابع ہے۔

ایک کے بعد دوسرے واقعہ کا ہونا ہمیشہ یکساں پایا گیا ہے۔ اس میں کبھی تغیر و تبدل نہیں پایا جاتا اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ یکسانی ہمیشہ قائم رہے گی۔ اور تاہم علت کا خیال ان میں سے کسی پر عائد نہیں کیا گیا دن رات کے بعد آتا ہے مگر کوئی یہ نہیں کہتا کہ رات دن کی علت یا سبب ہے۔

علت و معلول کا نتیجہ تجربہ سے اور پختہ ہو جاتا ہے۔ تجربہ یقین کا معلم ہے جس طرح احساس تمیز طبعی حیوانی کا۔ اگر تجربہ نہ ہوتا تو ہم کبھی نہ سمجھتے کہ کسی علت کا ہونا ممکن ہے۔ کیونکہ وجود کے خیال میں یہ ضرور نہیں ہے کہ قوت کا خیال بھی ہو۔ قوت کا تصور ہو سکتا ہے لیکن یہ ہم نہیں جان سکتے کہ

کوئی چیز حقیقت میں ویسی ہے اس طرح قوت کا خیال تو ہم میں ہے مگر مشاہدہ نہیں کر سکتے۔

علت و معلول کا عقیدہ نہ صرف ہماری نشو و نما بلکہ ہماری اعلیٰ ہستی کی ترقی کے لیئے بھی ضروری ہے۔ حیوان کو علت کا کوئی خیال نہیں وہ صرف علل ثانیہ کو دیکھتا ہے۔ کو تجربہ سے بندوق دیکھکر ڈرنے لگتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس نالی میں سے گولی نکلی تو مجھے چوٹ لگے گی یا مر جاؤں گا لیکن وہ کبھی یہ نہیں سوچتا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اور اس لیئے حیوان کبھی بارود کی ترکیب نہ معلوم کر سکے گا۔ اگر یہ دھوکا ہوتا تو تعجب ہے کہ کیوں لاکھوں آدمیوں کے تجربے نے اُسے غلط ثابت نہ کر دیا؟ اور پھر کیوں انسان اس کی وجہ سے وحشت و جہالت سے نکل کر تہذیب و شائستگی تک پہنچ گیا جس شوق و ذوق سے انسان اسباب کے دریافت کی تحقیق کریگا۔ اسی قدر اُسے ترقی ہوگی حیوان جو علل ثانیہ تک پہنچ کر رہ جاتا ہے۔ اسی حالت میں ہے۔

ادنیٰ سے ادنیٰ دماغ بھی یہ محسوس کرتا ہے کہ اس میں قوت ہے اور اُس قوت کا مقام ارادہ ہے اور یہیں سے انسان کے تمام افعال صادر ہوتے ہیں۔ گو انسان ارادے کی تمام حرکات پر غور نہ کرے لیکن وہ اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ ہر ہر قدم اسی پر منحصر ہے۔ جہاں ارادہ رُکا ہم چلنے سے رُک جاتے ہیں۔ انسان کا خیال ہے کہ وہ اپنے ارادے میں مختار ہے اور اس کے تمام افعال اس مختار قوت پر مبنی ہیں اُس کا یہ خیال کہ اُس کے افعال ارادی بعید اسباب کا نتیجہ ہیں وہ سخت

منطقی دلائل سے پیدا کرتا ہے اور ایک مدت کی مشق کے بعد اپنے آپ کو اس خیال کے تابع کرنے پر مجبور کرتا ہے ۔

عالم مادی میں انسان ایسی اشیاء میں تغیرات دیکھتا ہے جو عقل سے عاری ہیں۔ وہ ایسی حرکات دیکھتا ہے جس کا باعث وہ نہیں ہے اور ایسے نتائج دیکھتا ہے جن میں اس کا دخل نہیں ہے ۔ اس لئے وہ ایک ایسی قوت کے وجود کے اقرار کرنے پر مجبور ہے۔ جس پر اُسے کوئی قدرت نہیں ۔ جو اس سے پیدا نہیں ہوتی۔ اور جو اس سے زیادہ قوی ہے ۔

انسان میں قوائے دماغی مادہ پر عمل کرتے ہیں۔ جہاں مادہ بلا توسط انسان حرکت میں آتا ہے انسان اُس کے سبب دریافت کرنے کی ٹوہ میں رہتا ہے اور اُسے وہ ایک ایسی قوت میں معلوم کرنے کی توقع رکھتا ہے جو اُس سے باہر ہے اور اسی قسم کی ہے جیسی اس میں ہے۔ ایک ادنے عقل یا غیر صحیح مشاہدہ چھوٹے چھوٹے اسباب (علل) میں پھنس کے رہ جائے گا۔ لیکن جوں جوں عقل روشن اور وسیع ہوتی مشاہدہ زیادہ قوی اور تیز ہوتا ہے سمجھ قریبی اور درمیانی سلسلہ اسباب سے ہوتے ہوئے خود ذرا سرچشمہ حرکت تک پہنچ جاتی ہے ۔

باصرہ ایسی حس ہے جو قدرت نے لاکھوں کروڑوں انسانوں کو عطا کی ہے ۔ لیکن سب میں ایک سی قوت بصارت نہیں ہوتی صحیح طور سے دیکھنا آنکھ کی قوت یا خوبی پر منحصر نہیں ہے ۔ بلکہ تعلیم کا نتیجہ ہے یہی حالت چشم بصیرت کی ہے ۔ بعض معلومات کے ذریعہ سے عقل کو زیادہ تیز

اور خوبی سے دیکھتے ہیں۔ لیکن ادنیٰ اسباب یا علل کے خول سے نکل کر قوت اولیٰ کے مغز تک پہنچنا تربیت یا تعلیم یافتہ عقل کا کام ہے۔

انسان معلوم سے غیر معلوم کو دریافت کرتا ہے۔ اس لئے اس نے اس قوت کو جو نیچر میں پائی جاتی ہے اپنی قوت ارادہ کے مثل سمجھا تو اس کا ایسا سمجھنا جائز ہے جب اس نے ایسے معلومات دیکھے جن کی علل کو وہ نہیں بتا سکا تو انہیں ایک ایسی قوت مختار سے منسوب کرنا جو مادہ کے اندر اور باہر ہے بالکل جائز ہے یہی خدا کے خیال کی اصل ہے۔ اب خواہ خدا بہت سے ہوں۔ اور درختوں، دریاؤں، پہاڑوں، بادلوں اور ہواؤں میں ہوں خواہ ایک علت اعلیٰ ہو جو کائنات کا خالق اور قائم رکھنے والا ہے۔

اس مسئلہ میں بنی نوع انسان کے عام اتفاق کو گزشتہ زمانہ کے الہام کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے لیکن اصل یہ ہے کہ اکثر اقوام ایک ہی صغری کبری سے ایک ہی نتیجہ پر پہنچی ہیں۔ الہام انسان کی ذات اور اصول علت و معلول کی صداقت کے یقین میں ہے اور یہ الہام ہر ذی عقل پر ہوتا ہے۔

اب ہم انسان کی دوسری تمیز طبعی پر توجہ کرتے ہیں جو انسان کو منتہائے کمال کی طرف لے جاتی ہے۔

حجریات و نباتات سب میں قوت انتخاب پائی جاتی ہے۔ ہر شئے دوسری اشیاء میں سے اسی سے ملتی یا اسے جذب کرتی ہے جو اس کے لئے مفید ہے۔ حجریات اور معدنیات کو دیکھا جائے تو وہ اپنے اردگرد

کی اشیاء میں سے وہی چیزیں اور اسی قدر اپنے میں لیتی ہیں جو ان میں مل سکتی اور اُن کے لئے مفید ہو سکتی ہیں۔ ادویہ کی کیمیاوی ترکیب کو دیکھیے۔ ہر دوا دوسری سے گھل مل نہیں جاتی۔ اسی طرح نباتات کا حال ہے۔ پودا زمین سے ہوا اور دوسری اشیاء سے وہی اجزا اور اسی قدر حصہ جذب کرتا ہے جو اس کی نشو و نما کے لئے ضروری ہے۔ یہی حال دیگر حیوانات اور انسان کا ہے۔ لیکن انسان میں دو حصے ہیں مادی اور غیر مادی۔ کبھی تو وہ اُن چیزوں کو انتخاب کرتا ہے جو اس کی مادی خوشی اور مادی نشو و نما کے لئے مفید ہیں۔ اور کبھی وہ اشیاء جو قوائے حصہ غیر مادی کی نشو و نما اور مسرت کے لئے ضروری ہیں۔ اور چونکہ اس میں یہ دو حصے پائے جاتے ہیں اس لئے اس کی قوت انتخاب ڈانواں ڈول رہتی ہے۔ کبھی تو وہ اُن چیزوں کی طرف جاتا ہے جو مادی خوشی کو بڑھاتی ہیں اور کبھی اُن اشیا کی طرف جو اس کی غیر مادی مسرت میں اضافہ کرتی ہیں غرض انسان ان دو کششوں کے درمیان واقع ہے جدھر زیادہ زور ہوتا ہے اُدھر ہی کھنچ جاتا ہے۔ ایک طرح مچھلیاں دو کشمکش آپس میں ہے۔

انسان میں یہ تخالف عجیب و غریب ہے۔ حیوانی زندگی کا مقصد خاص اور محدود ہے۔ لہذا تمام تیزات حیوانی اس مقصد کے پورا کرنے میں کوشش کرتی ہیں لیکن اس میں جو دوسری قوت ہے وہ اُسے بعض اوقات اس دائرہ سے نکال کر ایک دوسرے عالم میں لے جاتی ہے جہاں اُس پر نئی نئی مسرتوں کا نزول ہوتا ہے۔

جس طرح تمیزات طبعی مادی زندگی کی فلاح کے لیے انتخاب کرتی ہیں اسی طرح ادراک غیر مادی حصہ کی فلاح میں بذریعہ انتخاب مدد دیتا ہے۔ اور یہ انتخاب ایک تمیز کرتی ہے جو روحانی زندگی کی فلاح کا خیال رکھتی ہے۔

یہ انتخاب اس طرح سے ہوتا ہے کہ چشم بصیرت کے سامنے بہت سی اشیا یا احساسات آتے ہیں۔ اور ان میں وہ اشیا انتخاب کی جاتی ہیں جنہیں تجربہ اور تمیز طبعی اعلیٰ خیال کرتی ہے تخیل پھر ان سب کو ملاتا ہے جو زیادہ سے زیادہ باعث مسرت ہیں۔ اور اس مجموعہ سے ایک منتہائے کمال قائم کرتا ہے جو جذبات کے سامنے پیش ہوتا ہے اور پھر انہیں اس طرف متوجہ کرکے ارادے کو اس کے حصول کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔

دیگر حیوانات میں تخیل بہت ادنے درجہ میں ہوتا ہے۔ وہ صرف ان کے سامنے حیوانی خوشی یا خطرہ کو پیش کرتا ہے اور انہیں دونوں کے حالات میں ذرا سا تغیر کر کے ان کی مختلف صورتیں ان کو دکھاتا ہے لیکن انسان کی حالت بالکل مختلف ہے۔ اگر وہ بھی شہوانی زندگی تک محدود رہتا تو اس کی بھی یہی حالت ہوتی۔ حافظہ سمجھ کے سامنے حقیقی واقعات کو پیش کرتا ہے لیکن تخیل اس سے کہیں آگے نکل جاتا اور نتائج تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی قوت ہے جو ایک حد تک خود اس کی قائم مقام ہو سکتی ہے اور چاہے سامعہ اور باصرہ کا کام دے سکتی ہے اور اس کی مدد سے غیر مادی حصہ

اپنی سماعت اور اجازت کو بلاقید مکان و زمان ان غیر مادی صورتوں تک پہنچا سکتا ہے جنہیں یہ خیالی وجود میں ظاہر کرتا ہے اس پر زور قوت کو نہ کوئی محدود کر سکتا ہے۔ نہ کوئی روک سکتا ہے۔ یہ حقیقت اور واقعیت کے سامنے اڑتی ہوئی جاتی ہے اور ہاتھ میں اس کے مشعل ہوتی ہے جس سے رستہ پر روشنی پڑتی جاتی ہے اور ارادہ اس کے پیچھے پیچھے ہوتا ہے تخیل امید پیدا کرتا ہے لیکن اُسے سیر نہیں کرتا۔ یہ تحقیق پر ابھارتا اور قیاس کو تیز کرتا ہے۔ لیکن اپنی پرواز سے نیچے نہیں گرتا۔ اور دوسرے حیوانات میں بھی یہ قوت ہوتی تو وہ کچھ کے کچھ ہو جاتے لیکن چونکہ وہ کسی منتہا کا خیال نہیں کر سکتے لہٰذا اپنی حالت پر قائم ہیں۔

انسان میں یہ عجیب بات ہے کہ کسی خواہش کے پورا ہونے پر وہ چپکا نہیں بیٹھتا بلکہ اور آگے اور آگے بڑھتا ہے۔ واہمہ اس کے سامنے منتہائے کمال کی ایک تصویر کھینچ دیتا ہے اور وہ اس کے حصول کے لئے کوشش کرتا چلا جاتا ہے۔

ممکن ہے کہ ایک انسان یا ایک قوم کا منتہا وہی نہ ہو جو دوسرے انسان یا دوسری قوم کا ہے لیکن یہ ضرور نہیں کہ وہ متضاد ہوں۔ صرف فرق یہ ہے کہ یہ جزوی ہوتے ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ میلان ایک ایسے کمال کی طرف ہے جو ان سب کو ایک کر سکتا ہے۔ مثلاً ایک شخص سرخ رنگ کو بہت پسند کرتا ہے۔ دوسرا نیلے کو تیسرا زرد کو۔ ہر ایک ایک جزو کی طرف مائل ہے۔ اور اس کمال کا ایک جزو دیکھتا ہے جو ان

تینوں کو ملا کر ایک ایسی خوبصورت شے پیدا کر سکتا ہے جو قوس قزح کے حسن سے کم نہ ہو۔

منتہائے کمال خواہ وہ عقل کا ہو یا عدل کا ہمیشہ انسان کی دسترس سے باہر ہوتا ہے۔ اس کے خیالِ علت و معلول نے اس کی سمجھ یا عقل کو علت انتہائی کی راہ سجھائی ہے جسے وہ خدا کہتا ہے۔ اور اس علتِ انتہائی میں وہ اپنے تمام ادراکات کمال کو جمع کرتا ہے اور اس طرح خدا کو قوی و قادر علیم و بصیر اور کمال عدل و خیر و حسن سمجھتا ہے۔

کیا تخیل دھوکا ہی دھوکا ہے؟ کیا عدل و حسن و خیر کی حس جو ہم میں پائی جاتی ہے وہ کچھ بھی نہیں؟

اگر ایسا ہوتا تو انسان کی قسمت بہت بڑی ہوتی۔ اُسے اس کا پختہ یقین ہے کہ جس طرح اس کا جسم بڑھتا اور نشو و نما پاتا ہے اسی طرح اس میں ایک روح ہے جو نشو و نما پاتی اور ترقی کرتی ہے اور تجربے سے اسے اس بات کا یقین حاصل ہوا ہے کہ ترقی کے ہر مرحلہ پر اس پر نئی نئی مسرتوں کا نزول ہوا ہے۔ اگر انسان کے سامنے کوئی منتہائے کمال نہ ہوتا تو نہ یہ شاعر ہوتے نہ مصوّر ہوتے نہ مغنی۔

انسان کو فطرتاً دو ضرورتیں ہوتی ہیں۔ ایک علم کی دوسری محبت کی۔ علم کا تعلق عقل سے ہے اور محبت کا جذبات سے عقل چاہتی ہے کہ سب میرے تابع ہوں اور میرے اشارے پر چلیں۔ جذبات کہتے ہیں کہ ہم سب کو دبا کر رکھیں اور من مانے حکومت کریں۔ مذہب کا تعلق ان دونوں

سے ہے۔ وہ عقل سے جذبات کی روک تھام کا کام لیتا ہے اور جذبات سے عقل کے ہوش درست کرتا ہے۔

مذہب کیا ہے؟ مذہب درحقیقت ایک خیال کا اظہار ہے انسان ایک علتِ اعلیٰ کا خیال کرتا ہے۔ جذبات کی ہدایت اور قوتِ انتخاب کی مدد سے وہ ایک منتہائے خیال کا تصور کرتا ہے۔ اور یہ منتہائے خیال اس کی محبت و پرستش کا مرکز بن جاتا ہے۔

جہاں عقل اور جذبات میں اتحاد و اعتدال نہیں رکھا گیا وہ مذہب نہیں بلکہ ایک قسم کا فلسفہ یا کچھ اور ہے۔

جو مذہب محض استدلالی اور قیاسی ہے وہ کوئی مذہب نہیں۔ وہ فلسفہ ہے اور جس میں صرف جذبات ہی جذبات ہیں وہ اکثر توہمات میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔ مذہبی جذبات کو جب حد سے بڑھا دیا جاتا ہے تو یا تو وہ پیچیدہ اسرار ہوتے ہیں یا ایک ناواجب خوف کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ دونوں مضر ہیں ایک کو بڑھا کر دوسرے کو گھٹانا ٹھیک نہیں۔ دلی جذبات کی عقل سے روک تھام کی جانی چاہئے اور عقلی پرواز کی اصلاح جذبات سے۔ علت العلل کی تلاش میں دو صورتیں پیدا ہوتی ہیں ایک وحدانیت یعنی ایک خدا کی پرستش۔ دوسرے کئی خداؤں کی پرستش۔ سامی قوموں نے ایک قوت کو مانا جو تمام معلومات کی علتِ ہے۔ اور آریہ اقوام نے ان قوتوں کو الوہیت کا درجہ دیا۔ جن کا ظہور نیچر میں ہوتا ہے بعض نے اس جھگڑے کو ہار کے چھوڑ دیا اور دنیاوی بکھیڑوں میں

پڑ گئے ۔

۵

مذہب انسان کی گھٹی میں بلکہ اس کی فطرت میں ہے جس طرح وہ اپنے آپ سے باہر نہیں نکل سکتا اور اپنی حدود اور قیود کو نہیں توڑ سکتا۔ اسی طرح وہ مذہب کو جو ابتدائے آفرینش سے اس میں جاگزیں ہے چھوڑ نہیں سکتا۔ شکوک و شبہات پیدا ہوں گے۔ نئی نئی تحقیقاتیں ہوتی رہیں گی۔ جدوجہد قائم رہے گی اس کے محدود حالات اس میں نئے نئے خیالات پیدا کریں گے لیکن آخر فتح مذہب کی ہوگی۔ یہ یقین ہے کہ علم بدلتا رہیگا ایک قیاس ترک اور دوسرا اختیار کیا جائے گا۔ تحقیق میں تغیر و تبدل ہوتا رہے گا۔ لیکن قدیم مذہب کسی نہ کسی صورت میں اس کے اندر ضرور رہے گا۔ ممکن ہے سائنس نیچر کے متعلق نئے خیالات پیدا کرے اور خدا کے متعلق پرانے خیال کو بدل دے لیکن وہ عقیدہ جو امٹ ہے خدا کے متعلق نیا خیال پیدا کریگا کیونکہ سائنس کا قابو یہاں نہیں چل سکتا۔ وہ اسے نہیں جانتا۔ یہ اس کی حدود سے باہر ہے۔ مذہب کی حالت ققنس کی سی ہے۔ پیر فرتوت ہو کر وہ اپنے گھونسلے میں آگ لگاتا ہے۔ مگر انہیں شعلوں میں سے پھر زندگی پاتا ہے جس طرح انسان کی گزشتہ نسلوں نے نئی نئی تبدیلیاں پیدا کیں اور بہت سے رنگ بدلے مگر اپنا پرانا مذہب خواہ وہ کیسی ہی بے ڈھنگی صورت میں تھا آئی نسلوں کے سپرد

کیا جو پھر نئے رنگ میں ظاہر ہوا۔ اسی طرح ہمارا زمانہ اس میں اور صفائی پیدا کریگا اسے اور اعلیٰ کرے گا اور آئندہ نسلوں کے حوالہ کر جائے گا۔ قرن ورقرن اور صدی درصدی یہ کام یونہیں جاری رہے گا۔ حتیٰ کہ کسی بعید زمانے میں وہ وقت آئے گا کہ سائنس اور مذہب کا تخالف جاتا رہے گا اور نیچر اور انسانی فطرت کا علم خدا کی معرفت پر منتہی ہو جائے گا۔

اب ہم انسان کی تاریخ پر ابتدا سے نظر ڈالتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ آیا مذہب ابتدائے آفرینش سے اس میں ودیعت ہے یا نہیں

ایک انگریز لڑکے ایک جاہل مسلمان ایک معمولی ہندو یا آفریقہ کے کسی وحشی یا کسی مذہب کے عالم یا فقیہ سے پوچھئے کہ مذہب کیا ہے اور پھر ان کے وجوہات کو غور سے دیکھئے تو سب کی تہ میں ایک ہی بات نظر آئے گی یعنی کسی ایک ذات کی پرستش خواہ وہ کسی صورت اور کسی ڈھنگ سے ہو۔ مسٹر میکڈانلڈ جو مدت تک افریقہ کے وحشی اقوام میں رہے ہیں اپنی کتاب "افریکینا" میں لکھتے ہیں کہ ان سب کا اس پر اتفاق ہے کہ کوئی شئے ایسی ضرور ہے جو اس جسم سے الگ ہے اور جسے وہ روح کہتے ہیں اور موت کے بعد وہ روح اس جسم کو چھوڑ دیتی ہے" اس میں کچھ شک نہیں (جیسا کہ ہربرٹ اسپنسر اور دیگر فلسفیوں اور محققوں نے ثابت کیا ہے)

سا کہ انسان بھوت پریت یا سایہ سے خدا تک پہنچا ہے اگرچہ اس کا ابتدائی خیال خوف کی وجہ سے اُسے اپنے بابا یا دوستوں اور بزرگوں کی موت

یا خواب دیکھنے سے ہوا ہے اور زندگی کے درمیانی مرحلوں میں اس نے پتھروں۔ درختوں جانوروں اور دیگر مظاہر قدرت کے سامنے سر جھکایا ہے لیکن وہ کیا چیز تھی جس نے اس سے بادل کی گرج اور بجلی کی چمک کے سامنے سجدہ کرایا؟ وہ کیا تھا جس نے اس کا سر پُرزور بہتے دریاؤں یا سربفلک پہاڑوں کے سامنے جھکایا؟ کہا جاتا ہے کہ اس کی وجہ ڈر ہے۔ ڈر تھا تو بھاگ جاتے چھپ جاتے لیکن بجائے اس کے انہوں نے ایک ایسی قوت کو مانا جو سب سے قوی اور ابدی اور ازلی ہے۔ موت سے ڈر تھا تو مرنے سے ڈرتے رہتے۔ لیکن کیوں انہیں روح کا خیال پیدا ہوا؟ اور اس سے بڑھ کر وہ اور آگے پہنچے۔ یہ خیال اُن بچوں تک میں پایا گیا ہے جو الگ رکھے گئے جنہیں کبھی اس قسم کی کوئی بات نہیں بتائی گئی اور نہ صرف بچوں میں بلکہ بہرے گونگوں نے بھی بلا امداد غیرے صرف اپنے خیال اور اپنے تجربہ سے یہاں تک رسائی کی ہے اور اُن کو خدا کا خیال اور روح وجسم کا امتیاز پایا گیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ بات انسان میں فطرتاً موجود ہے اور ابتدائے آفرینش سے چلی آرہی ہے۔

یہ کہنا کہ انسان کو خوف سے یہ خیال پیدا ہوا اور خدا کا خیال سایہ بھوت پریت سے شروع ہوا اور رفتہ رفتہ دیگر مظاہر قدرت کی پرستش سے ایک خدا تک پہنچا لہذا خدا کا خیال بے بنیاد ہے

صحیح نہیں ہے کیونکہ مختلف مرحلے طے کرکے کسی شئے تک پہنچنے کے یہ معنی نہیں کہ وہ شئے بے اصل ہے۔ دنیا کے تمام اعلیٰ خیال فلسفہ اور سائنس کے تمام اصول تمام ایجادات و اختراعات کو اگر بنظر غور دیکھا جائے اور ان کی تحقیق کی جائے تو ان کی اصل انہیں وحشیوں تک پہنچے گی جہاں سے ہم نے خدا کے خیال کا سراغ لگایا ہے۔ یہ چیزیں انسان کو ورثتاً ملی ہیں۔ اور اسی طرح ایک دوسرے کو پہنچتی رہیں گی۔

۶

علمائے طبیعیات و بعض دیگر فلاسفۂ حال و قدیم کا دعوے ہے کہ صرف استقرائی علم کی مستحکم بنیاد ہے۔ مگر استقرا کیا ہے؟ تجربہ کے ذریعہ سے نتائج تک پہنچنا۔ لیکن ہمیں کیا حق اس امر کے ماننے کا ہے کہ چونکہ ایک ہی سے حالات میں پانچ ہزار یا دس ہزار سال سے برابر ایک ہی چیز واقع ہوتی آئی ہے تو آئندہ بھی انہیں حالات میں وہی واقع ہوگا مانا کہ لاکھوں کروڑوں پدموں آدمی مرتے آئے ہیں لیکن یہ کیا ضرور ہے کہ ہم بھی مر جائیں گے۔ اس کا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ نیچر میں اصول یکسانی عالمگیر طور پر پایا جاتا ہے۔ اس کے اصول ہمیشہ یکساں رہتے ہیں ان میں خلل نہیں آتا۔ یہ ہمیں کیونکر معلوم ہوا؟ تجربہ سے۔ تو گویا یہ استدلال یوں قائم ہوگا۔

ہم کیوں کسی عام یا خاص اصول یا صداقت کو مانتے ہیں؟

بوجہ تجربہ کے!
تجربہ پر ہمارا یقین کیوں ہے؟
اس لئے کہ نیچر ہمیشہ ایک ہی نقش قدم پر چلتی ہے اور اس کے اصول میں یکسانی پائی جاتی ہے!
یہ ہم کس طرح مانتے ہیں کہ اصول نیچر میں یکسانی پائی جاتی ہے؟
بوجہ تجربہ کے!
تجربہ پر ہمیں کیوں یقین ہے
اس لئے کہ نیچر میں اصول یکسانی پایا جاتا ہے!

اسی طرح استدلال کرتے جایئے اور پھر پھر کے وہی وجوہ آتی جائیں گی تو اس سے معلوم ہوا کہ کوئی اور شئے بھی ہے کہ جس پر انتہائی حالت میں تمام انسانی علوم کا دارومدار ہے۔ وہ شئے سب سے نیچی تہ میں ہے اور وہ تمیز فطری ہے۔ ہیوم کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ اس شئے کی مشابہت جو ہمارے تجربہ میں آچکی ہے اس شئے سے جو تجربہ میں نہیں آئی ہماری نیچر (طبیعت) کے قانون پر مبنی ہے۔ اور وہ قانون اس خیال کے زور سے حاصل ہوا جبکہ تجربہ نے ابھی اسے ثابت نہیں کیا تھا۔

لہذا جس طرح مذہب کا خیال طبعی ہے سائنس بھی اس سے نہیں بچ سکتا۔ کیونکہ آخری بنیاد اس کی بھی تمیز فطری پر ہے جو تجربہ سے مقدم ہے۔

صرف ایک قوت ہے جو بلاواسطہ مجھے دی گئی ہے اور جس کا مجھے علم ہے وہ قوتِ ارادی ہے۔ باقی جتنی قوتیں ہیں وہ بالواسطہ ہیں اور منطقی استدلال سے دریافت ہوتی ہیں۔

میری قوت ارادی دوسری قوتوں کے دریافت کرنے والی ہے ہر ایک استدلال کسی ایسی قوت یا قوتوں کے متعلق کیا جاتا ہے جو کائنات میں عمل کر رہی ہیں۔ اصل مسئلہ جس سے دوسرے مسائل پیدا ہوتے ہیں اور جس پر ان کے یقینی ہونے کا دارومدار ہے وہ یہ ہے کہ عمل کرنے کا ارادہ کرتا ہوں اور میں جانتا ہوں کہ میں ارادہ کرتا ہوں۔

مجھے اپنی ہستی کے متعلق کسی منطقی ثبوت کی ضرورت نہیں۔ یہ ایسی معرفت طبعی ہے جو تمام یقینوں سے بالا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میں ہوں۔ میں جانتا ہوں میں وہی ہوں جو مختلف حالات اور مختلف اوقات میں سے گزر چکا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ میں خیال کر رہا ہوں اور میں جانتا ہوں کہ میں ارادہ کرتا ہوں اور کر رہا ہوں۔ یہ تمام امور معرفت طبعی سے متعلق ہیں۔ میں اپنی ہستی کا ثبوت اپنے خیالات یا ارادے سے پیدا نہیں کرتا۔ ڈیکارٹ کا یہ کہنا کہ "میں خیال کرتا ہوں لہذا میں ہوں" اس منطق سے باہر ہے۔ کیوں کہ جب میں خیال نہیں کرتا اس وقت بھی تو میں ہوں اور میرے ہونے کا علم مجھے اس وقت بھی ہے۔ میں ہوں اس لئے کہ میں ہوں یہ شبہ کرنا کہ آیا میں خیال کر رہا ہوں یا نہیں یا ارادہ کر رہا ہوں یا نہیں کوئی عقلی دلیل نہیں بلکہ بے عقلی کی بات ہے۔ یہ فلسفہ

نہیں بلکہ حق ہے۔ میری ہستی کا کوئی ثبوت میری معرفت طبعی سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ معرفت میری عقلی اور اخلاقی فطرت کے لیے کافی نہیں تو دنیا کا کوئی منطقی استدلال کوئی دلیل کافی نہیں ہو سکتی اس قسم کے شکوک کرنے سے عقل کو بے دست و پا کرنا ہے اور یہی شکوک ہیں جو روح کے متعلق کئے جاتے ہیں اور یہ کہا جاتا ہے کہ ہم میں کوئی شئے غیر مادی نہیں ہمارا اولین اور یقینی علم وہ ہے جو حواس کی رپورٹ سے قبل ہے اور حواس کے تابع نہیں لیکن جب حواس کی رپورٹ وصول ہوتی ہے تو عقل اس کی خبر دیتی ہے۔ حواس اور عقل ملکر ایک ہی وقت میں کام کرتے ہیں۔

ممکن ہے کہ مادئین کہیں کہ یہ عقل مادہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کیونکر معلوم ہوا جبکہ یہی نہیں معلوم کہ مادہ کیا ہے ؟

یہ یقینی امر ہے کہ میں ہوں اور جب میں اپنی ہستی کا خود باعث نہیں تو پھر میں کیسے یہاں آیا ؟ یہ کہنا کافی نہیں کہ میرے پہلے اور اسباب تھے اور ان سے پہلے اور اور ان سے پہلے اور اگر وہ سبب ان کے بعد آیا جو میرا سبب نہیں تو میں بے سبب ہوں۔ گر تمام نوع انسان ایسی ہی ہے۔ تمام ہستی تمام کائنات ایسی ہی ہے۔ یعنی یا تو تمام ہستی اور کائنات ایسے ناسبق اسباب کے بعد ظہور میں آئی جن میں قوت تخلیق نہیں یا خود اپنا سبب آپ ہے میں اپنی ہستی کے متعلق اس سے زیادہ خیال نہیں کر سکتا کہ میں ہوں، میں خیال کرتا ہوں۔ میں ارادہ کرتا ہوں

پیدا کئے گئے اور دور ہیں بھی انھیں تین چیزوں کو پاتا ہوں لیکن ان میں سے کوئی یا سب مل کر بھی میرے یہاں ہونے کا سبب نہیں ہو سکتیں میں یقیناً غیر فانی ہوں۔ میں بے سبب نہیں ہوں نہ اپنا آپ سبب ہوں۔ لہذا میرا سبب کوئی اور ہے۔ جو ان سب سے بالا ہے۔ سوائے اس کے کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔

ہم چونکہ کارگاہ عالم میں مختلف قوتیں دیکھتے ہیں اور جن کا ہمیں اس قدر یقین ہے کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ کیا ہیں۔ ہم عقل اور خیال سے نہیں سمجھ سکتے۔ ہم حواس سے ان کا یقین نہیں کر سکتے آخر ان کا اصلی علم ہمیں کیونکر ہو سکتا ہے؟ صرف ایک طریقہ ہے۔ اپنی قوت ارادی ہم اپنے میں ایک قوت دیکھتے ہیں اور اس سے ان قوتوں کو سمجھتے اندازہ کرتے اور یقین کرتے ہیں اور یہ تمام قوتیں ظہور ہیں اس قوت ارادی کا جو خدا میں ہے جس سے ہماری ہستی ہمارا ارادہ اور ہماری زندگی ہے۔

۷

عالم میں ہر آن تغیر ہے۔ ہر شئے بدلتی ہے اور بدلنے پر مجبور ہے۔ اسی قانون سے عالم کو رونق اور ترقی ہے۔ انسان بھی اس کا تابع ہے۔ اس میں بھی ہر لحظہ اور ہر آن تغیر ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ سات سال بعد وہ سر سے لے کر پاؤں تک بالکل نیا ہو جاتا ہے

اور ایک ذرہ بھی پہلے کا نہیں رہتا۔ لیکن باوجود اس کے وہ پھر وہی ہے اور سمجھتا ہے۔ کہ میں وہی ہوں اور باوجود اس کے وہ غور کرتا اور خیال کرتا ہے۔ ہر عضو کے فعل سے اس عضو میں تحلیل واقع ہوتی ہے اور اس تحلیل کے ساتھ ترکیب بھی ویسی ہی ہو جاتی ہے۔ مادہ کے کون سے سالمہ (جزو دیمقراطیسی) میں مسلسل غور و فکر ہے۔ اس میں جو ہمارے جسم سے خارج ہوتا ہے یا اس میں جو آتا ہے؟ کیا آکسیجن یا ہیڈروجن کا سالمہ (جزو دیمقراطیسی معرفت طبعی) کا شخص حاصل کرتے ہی چل دیتا ہے اور کیا آنیوالا جزو دیمقراطیسی آتے ہی معرفت طبعی حاصل کر لیتا ہے۔ ضرور کوئی شے مستقل ہونی چاہئے جسے معرفت ہے اور جو غور و فکر کرتی ہے اور جس کا ان سالمات کی مسلسل آمد و رفت پر عمل ہے اور اور اک جسم کا آلہ ہے۔ اور جو غیر مادی ہے اور جو روح کہلاتی ہے۔ تمام حیات اس معرفت کے حاصل کرنے سے قبل صرف حرکت اور تبدیل ہیئت ہے لیکن ہم اس معرفت کو دماغ کے ذرات میں تقسیم نہیں کر سکتے۔ ہم اعصاب اور دیگر مادی ریشوں سے خاص خاص احساسات منسوب کر سکتے ہیں مگر ان اعصاب اور ریشوں سے معرفت طبعی پیدا نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک مستقل شئے ہے اور یہی ہے جو ہمیں اپنی ہستی کی خبر دیتی ہے اور غیر فانی ہے علاوہ اس کے دماغ کے مختلف حصوں کے مختلف کام ہیں جس طرح مختلف اعصاب کے کام مختلف ہیں۔ لہذا اس معرفت طبعی کا یکساں حالت پر رہنا اسی وقت ہو سکتا ہے۔ جبکہ اعصاب اور دماغی اعضا اور اس کے تابع اور کارکن ہوں جو سب کا صدر نشین ہے

ورسٹی حادی ہے۔ علم فزیالوجی (علم کا مسئلہ) جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ مادیت اور دہریت کی طرف مائل کرتا ہے۔ اس پہلو سے اگر اس پہلو سے نظر ڈالی جائے تو وہ ہماری اعانت کرے گا۔

مشہور سائنس دان مسٹر پارکر اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ ایک شخص جو تھوڑی دیر کے لئے بوجہ ضرب کے بیہوش ہو جاتا ہے اور اس میں معرفت طبعی نہیں رہتی تو وہ ہوش میں آکر یہ سوال کرتا ہے کہ وہ غور کرنے والی شے وہ روح کہاں تھی؟ اور یہ خیال خواہ مخواہ اس کے دل میں آتا ہے کہ میں تھوڑی دیر کے لئے مرگیا تھا۔ تھوڑی سی ضرب سے ایک آدمی بیہوش ہو جاتا ہے۔ اگر زیادہ زور سے لگے تو وہ مر جاتا ہے۔ کیا اس وقت بھی اس میں معرفت طبعی نہیں رہتی؟ اگر ایسا ہے تو کب اور کس طرح وہ معرفت طبعی (کانشس) حاصل کرتا ہے تھوڑی سی ضرب سے وہ بیہوش ہو کر پھر ہوش میں آجاتا ہے زیادہ ضرب لگنے سے تمام دماغی نظام بگڑ جاتا ہے اور حرکت ختم ہو جاتی ہے۔ پھر کیا ہوتا ہے؟ سائنس اس کا جواب نہیں دے سکتا کیونکہ فی الحال یہ اس کی دسترس سے باہر ہے۔ اس سے بڑھ کر میں ایک ایسے شخص کی شہادت پیش کرتا ہوں جسے سرتاج علمائے سائنس کہنا چاہیے اور جو عین اسی زمانہ میں جبکہ ڈارون اپنی مشہور آفاق کتاب (اوریجن آف سپی شیز) لکھ رہا تھا۔ اپنی ذاتی تحقیقات سے انہیں نتائج پر پہنچا جو ڈارون نے قائم کئے تھے اور جب اس نے اپنا رسالہ

ڈارون کے پاس رایل سوسائٹی میں پڑھنے کے لیے بھیجا تو ڈارون ل
ڈنگ رہ گیا۔ وہ اپنی ایک کتاب میں روحانی قوت اور علم پر بحث
کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ "ہمیں کبھی واقعات سے صرف اپنی ذاتی رائے
کی وجہ سے انکار نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ انسانی علم کی ترقی کی تمام تاریخ
اور خصوصاً وہ علم جسے ہم روحانی کہتے ہیں یہ یقین دلاتا ہے کہ جب کبھی
اہل سائنس یا کسی زمانہ کے عام معلمین نے ایسے واقعات سے جو اوسط
درجہ کے ایماندار اور ذہین محققین نے خود دیکھے اور بیان کئے ہیں
محض اس وجہ سے انکار کر دیا ہے کہ یہ ممکن نہیں یا وہ قانون قدرت
کے خلاف ہیں تو یہ منکرین ہمیشہ غلطی پر ثابت ہوئے ہیں۔ چنانچہ اس
فاضل عصر نے خود اس بارے میں بڑی بڑی تحقیقاتیں کیں اور بعد کامل
غور اور چھان بین کے وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ بے شک روحانی قوت موجود ہے،
اور جو مظاہر روحانی طرح طرح سے ظہور میں آتے ہیں بالکل صحیح ہیں۔
اور نہ صرف اس نے بلکہ مشہور و معروف ڈاکٹر نوبل پنسر جان غوریس
اور ڈاکٹر کاربنٹر اور دیگر علما نے بعد تحقیق کے اس کی اصلیت کو تسلیم کیا
فاضل موصوف کا خیال ہے کہ وہ بڑے لوگ جنہوں نے اس کا انکار
کیا غلطی پر تھے اور اگرچہ اکثر علمائے سائنس ان شہادتوں کی پرواہ
نہیں کرتے اور ہنسی اڑاتے ہیں لیکن اس امر کا پورا پورا یقین ہے کہ
اسی صدی میں تمام منصف مزاج تعلیم یافتہ لوگوں کو ان باتوں کو صحیح
ماننا پڑے گا۔ اسی فاضل نے اس کمیشن کا بھی مفصل حال لکھا ہے جو اس

کی تحقیق کے لیئے بیٹھا تھا اور جسے بالآخر تسلیم کرنا پڑا تھا کہ روحانی قوت بے شک ایک ایسی قوت ہے جو مادہ سے الگ اور بالا ہے۔ اس کمیشن کے ممبر تمام مشہور سائنس داں تھے۔

۸

انسان جو اپنے تئیں اشرف المخلوقات سمجھتا ہے۔ جو یہ سمجھتا ہے کہ یہ سارا عالم یہ ساری کائنات میرے ہی لیئے ہے جس نے اپنی بساط سے زیادہ قدم بڑھایا ہے اور اسرار عالم کے دریافت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا وہ اگر اپنے آس پاس کی اشیاء پر غور سے نظر ڈالے گا تو ہر چیز اس کو پر اسرار معلوم ہوگی اور ایک ذرے تک کی حقیقت سے وہ اپنے آپ کو ویسا ہی بےخبر پائے گا جیسے اس کائنات کی حقیقت سے۔ جب ہم اس کرہ پر نظر ڈالتے ہیں جس پر ہم آباد ہیں تو بے شک یہ بہت وسیع نظر آتا ہے اور اس قدر وسیع کہ باوجود اس ترقی اور تحقیقات کے ابھی تک ہم اس کے علم پر حاوی نہیں ہوئے۔ لیکن نظام شمسی کے مقابلہ میں یہ بہت ہی چھوٹا ہے اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ اسی قسم کے الکو نظام موجود ہیں اور یہ عالم سیارگان کے مقابلہ میں ایک نقطہ کے برابر ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ تمام کائنات کے سامنے اس کی کچھ حقیقت نہیں۔ اسی طرح وقت پر نظر ڈالی جائے تو اس میں کچھ شک نہیں کہ زمین کی نشوونما میں جو وقت صرف ہوا وہ بے انتہا زیادہ ہے اس وقت سے جو ایک درخت کے بڑھنے اور پھلنے

میں صرف ہوا لیکن اگر اس وقت کا مقابلہ نظام شمسی کے زمانہ نشو نما سے کیا جائے
تو بہت ہی کم ہے اور بمقابلہ عالم سیارگان ایک لحظہ کے برابر ہے اور ابدالآباد
کے مقابلہ میں ہیچ۔ زمین کی ساخت کو دیکھکر بہت سے ایسے ثبوت ملتے ہیں
جن سے اُس کی گزشتہ حالت پر ایک گونہ صحیح رائے قائم ہو سکتی ہے۔ یہ
ظاہر ہے کہ ایک زمانہ میں یہ بے انتہا گرم تھی۔ اور مختلف زمینوں کے سرد
ہونے کے متعلق جو تجربے اور تحقیقات کی گئی ہے اُس سے اندازہ ہو سکتا ہے
کہ اس آتشیں مزاج کرہ کے ٹھنڈا کرنے میں لاکھوں اور کروڑوں برس لگے ہونگے
جب نظام شمسی کے ایک بہت چھوٹے سے کرہ کی حالت درست ہونے میں
اس قدر عرصہ دراز لگا تو خیال کرنا چاہیئے کہ اُن کروں کے لیئے جو اس سے
سینکڑوں درجے بڑے ہیں کس قدر عرصہ درکار ہوا ہوگا۔ جب انسان یہ سوچتا
ہے کہ سورج سے بھی بڑے بڑے سیارے موجود ہیں اور نظام شمسی جیسے دوسرے
نظام بھی ہیں اور اس سے پرے اور نظام ہیں اور اس کے آگے اَور
اور ان کے بعد اَور اور یہ سلسلہ نامتناہی یوں ہی چلا جاتا ہے تو خلاے بسیط کا
خیال حد وہم سے گزر جاتا ہے۔ اسی طرح جب زمانہ کا خیال کرتا ہے
کہ ایک ادنیٰ اور حقیر کرہ کے درست ہونے میں لاکھوں کروڑوں برس
لگ گئے ہیں تو اس کل نظام اور دیگر نظامات میں کتنا وقت صرف ہوا ہوگا
تو انسان مارے حیرت کے حواس باختہ ہو جاتا ہے اور پھر جب وہ یہ دیکھتا

ہے کہ یہ عجیب و غریب حیرت انگیز کارخانہ کس ترتیب و قاعدہ سے برابر چل رہا ہے اور تمام نظامات ایک ہی اصول پر حرکت کر رہے ہیں اور کیا مجال کہ اپنی حد سے تجاوز کریں تو اُس حکیم مطلق کی حکمت و قوت کی عظمت عقل و وہم میں نہیں سما سکتی جو اس کارخانہ کا چلانے والا ہے۔

ممکن ہے کہ ایک سائنس دان یہ کہے کہ یہہ سب وہم ہے کائنات میں سوائے مادہ اور سالمات کی حرکت اور کشمکش کے کچھ نہیں ہے۔ تمام عالم اور آسمانی خلا میں مادہ ہی مادہ منتشر ہے جن کی ابتدائی حالت ٹھوس ذرات کی ہے جو مختلف جسامت کے ہیں جن کی آپس کی رگڑ سے حرارت پیدا ہوتی ہے اور اس میں سے گاس نکلتی ہے جو "سپیولا" (ضبابہ) کی شکل پکڑ لیتی ہے۔ یہہ ضبابہ نظام شمسی کے احاطۂ کشش کے اندر اگر سورج کی مدور راہ میں داخل ہو جاتے ہیں اگر بعض ان میں سے ہمارے کرہ کے پاس سے گزرتے اور اس میں آ داخل ہوتے ہیں تو رگڑ سے بھڑک اٹھتے ہیں۔ اور ان سے شہاب پیدا ہوتے ہیں جو اکثر زمین پر گرتے ہیں یہی اجسام بے انتہا چھلنی سیارے اور ٹھوس ہیں۔ ان کی ترکیب انہیں عناصر سے ہوتی ہے جو منجمد ہو کر بڑے بڑے ثوابت کو بناتے ہیں۔ ان شہابوں سے جو بعض اوقات ہماری زمین پر گرتے ہیں ہمیں اس مادہ کا نمونہ ملتا ہے جو تمام خلائے عالم آسمانی گان میں منتشر ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ

یہہ بے انتہا اور کثیر شہابی مادہ جس کی وسعت خیال سے باہر ہے کہاں سے آیا؟ اس کی حالت ماسبق کیا تھی؟ یہہ مادہ جو ابتدا میں بالکل سادہ اور اجزائے لایتجزے کی حالت میں تھا۔ اس صورت میں کب سے آگیا جسے ہم عناصر سے تعبیر کرتے ہیں؟ اگر ہماری رسائی ابتدائی اجزا کے عالم تک ہو بھی جائے تو بھی یہ مشکل حل نہیں ہوتی۔ کیونکہ پھر ہمیں اُن قوتوں کی اصلیت پر غور کرنا ہوگا جن کے زور سے یہ اجزائے لایتجزے مادے اور عوالم کی صورت میں ہویدا ہوئے اس سادہ سے سادہ قوت میں کہاں سے اتصال پیدا ہوا یہ کیمیائی قوتیں کدھر سے آئیں؟ اور سب سے بڑھ کر یہ اسرار قوت ثقل کہاں سے آئی جو غیر محدود غیر متبدل اور تمام عالم کی رونق کی اصل ہے؟ ان مسائل سے بھی بڑھ کر اہم اور لاینحل مسائل ایتھر ہیں۔ ایتھر کیا ہے اور مادہ سے اس کے کیا تعلقات ہیں؟ وہ قوتیں کہاں سے آئیں جو ایتھر سے کپکپاہٹ پیدا کرتی ہیں اور جو حرارت۔ روشنی الکٹرسٹی کی مختلف صورتوں میں تمام تبدیل ہئیت۔ حرکات سالمات اور مادہ کی اُن بے انتہا تبدیلیوں کا باعث ہوتی ہیں جو حیات کی نشوونما کا اصل باعث ہیں؟ ان تمام سوالات کا کوئی قطعی جواب نہیں اور غالباً کبھی نہ ہو۔

قدیم سے قدیم نظریہ مادہ سے لیکر جدید سے جدید نظریہ پر غور کرو۔ ہر ایک میں ایسے ہی لاینحل سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ اور کوئی

اس کائنات کی علت العلل کو قریب نہیں پہنچا تا۔ اور زیادہ سے زیادہ بقول ہربرٹ سپنسر "تمام مظاہر میں ایک نا معلوم اور ناقابل دریافت قوت کے ظہور کا ادراک ہوتا ہے یا جیسا کہ اسی علامہ دہر نے اپنی موت سے کچھ عرصہ قبل لکھا تھا۔ "ہستی کی یہ خالی صورت جسے خیال نے ہر طرف اپنی بساط کے موافق تحقیق کیا ہے اور پھر اس سے پرے جہاں وہم وخیال کے پر جلتے ہیں۔ جب اس معلوم کا اس نامعلوم اور غیر محقق وسعت سے مقابلہ کیا جاتا ہے تو خیال کی یہ ساری تحقیق ہیچ و بے حقیقت ہو جاتی ہے یہ خیال اور پھر اس خلائے بسیط کا خیال جس کے مقابلہ میں ہمارے بے انتہا نظامات کی کچھ حقیقت نہیں۔ ایسا ہے کہ اس کے ذکر کرنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ کچھ عرصہ سے یہ طبعی ادراک کہ یہ غیر محدود خلا بغیر کسی اصل اور سبب کے موجود ہے اور موجود رہے گا۔ میرے دل میں ایک ایسا خیال پیدا کرتا ہے کہ اس کے سامنے میں سہما جاتا ہوں"۔

۹

مادیین کا یہ خیال ہے کہ مادہ ہی سب کچھ ہے اور مظاہر عالم کی گتھی سلجھانے کے لئے کافی ہے۔ روحانی یا الٰہی اثر سب خانہ کعبے دیماقریطس سے لے کر اس وقت تک اس کے ماننے والے موجود ہیں اور سائنس کی حیرت انگیز ترقی نے اس مذہب کو اور بھی قوی کر دیا ہے

ہر زمانہ میں تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ فلاسفہ اور علمائے علوم طبعیات کو اس کا شوق رہا ہے کہ کوئی نظریہ ایسا قایم کریں کہ جس سے تمام اشیا اور مظاہر کی کنہ دریافت ہو جائے اور اس خیال نے لوگوں کو مادیت کی طرف مائل کیا ہے۔ کیمیاوی تحلیل نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ مادہ خواہ کسی صورت میں ہو اور کیسی ہی تبدیلی اس میں کیوں نہ واقع ہو جائے نہ وہ فنا ہو سکتا ہے اور نہ پیدا ہو سکتا ہے۔ اسی طرح علم طبعیات کی رو سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قوت خواہ کسی شکل و صورت میں ہو اور کیسے ہی مختلف حالات اختیار کر لے وہ نہ تو فنا ہو سکتی ہے اور نہ پیدا ہو سکتی ہے پھر علم کیمیا کی رو سے ایسے مرکبات ترتیب دئے گئے جو اب تک بغیر قوت حیوانیہ کے دشوار سمجھے جاتے تھے اور آخر بڑھتے بڑھتے اول مادہ کے متعلق نظریہ اجزائے دیمقراطیسی قایم ہوا اور سب سے آخر نظریہ اجزائے لاتتجزیٰ۔ ان سب تحقیقوں اور نظریوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسان دہریت اور مادیت کی طرف ڈھلتا ہوا چلا گیا۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا صرف مادہ ہی ان تمام مظاہر عالم کا باعث ہے۔ اور کیا اسکے ساتھ کوئی اور شئے ایسی نہیں ہے جو اس سے مختلف ہے۔ اب ہمیں تحقیق یہ کرنا ہے کہ جب ہم کسی مظہر کو دیکھتے ہیں تو مادہ کا اسمیں کہاں تک دخل ہوتا ہے۔ اور انکا باہمی کیا تعلق ہے؟ دوسرے اگر کوئی مظہر ایسا ہے جو مادے سے بالکل آزاد ہے تو اس سے یہ نتیجہ نکلیگا کہ مادہ اسکا باعث نہیں ہے لیکن اسکے ساتھ ہی امر بھی تحقیق

طلب ہے کہ اگر ہم کسی منظر کو بغیر مادے کے نہیں پاتے تو کیا صرف مادہ ہی اس کا کافی اور وافی باعث ہے؟ فرض کرو کوئی منظر معلوم ہے۔ اس کے چند اسباب قرار دیتے ہیں۔ لیکن یہ یقین نہیں کہ آیا یہ اس کے کافی باعث ہیں یا نہیں۔ تو ہم ان اسباب کے نتائج پر غور کریں گے۔ اگر یہ نتائج پورے اترے تو ہم سمجھیں گے کہ وہ اسباب کافی ہیں اور اگر نہیں تو ہم اس شئے کو تلاش کریں گے جو ان نتائج کا تکملہ کرتی ہے اور جو اب تک بکلی نامعلوم تھا۔ مثلاً جب سیارہ یورینس دریافت ہوا تو بعض مہندسوں نے یہ دیکھا کہ جس طور پر وہ سورج کے گرد گردش کرتا ہے اور جو دائرہ وہ بناتا ہے اس کے لئے صرف سورج کی اور بعض چھوٹے سیاروں کی کشش جو یورینس سے چھوٹے ہیں اور اس کے اور سورج کے درمیان واقع ہیں اس گردش اور دائرہ کی کافی باعث نہیں۔ اگر صرف یہی کشش ہوتی تو وہ ایسا دائرہ نہ بناتا بلکہ اس کی صورت اور ہوتی۔ ان مہندسوں نے محض ریاضی اور ہندسہ کے زور سے یہ قیاس قائم کیا کہ ہو نہ ہو فلاں مقام پر کوئی اور ستارہ یورینس سے پرے واقع ہے جس کی کشش کا اثر اس پر پڑتا ہے چنانچہ بعد میں اس مقام پر دوربین کے ذریعہ سے وہ سیارہ دریافت ہوا جسے اب نیپچون کہتے ہیں۔ اسی طور پر ہم اس عالم کو لیتے ہیں اور مادہ کو جہاں تک اس کا دخل اور صفات و اثرات ہیں پوری پوری آزمائش دیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ آیا وہ

اس کا کافی باعث ہے یا کوئی اور سے بھی ہے جو اس کا تکملہ کرتی ہے اور مادہ سے خارج ہے؟ پس اگر کوئی شئے ہے تو یہہ نتیجہ نکالیں گے کہ مادہ اس عالم کا کافی باعث نہیں ہے اور اس کے بعد ہم مادہ کی حقیقت پر غور کریں گے اور دیکھیں گے کہ آیا وہ بذات خود قائم اور کافی ہے۔

مظاہر کائنات جن پر ہم بحث کریں گے اِن کی تقسیم سر سری طور سے یہہ ہوگی۔

۱۔ قوت۔ جو حرکت اتصال اجزائے لایتجزائے اور کشش کیمیاوی سے ظاہر ہوتی ہے۔

۲۔ حیات۔ حیوانی یا نباتی۔

۳۔ قوت۔ مدرکہ۔

۴۔ ادراک طبعی (کانشس)

۵۔ جذبات اخلاقی مثلاً محبت رحم وغیرہ۔

ہماری سب سے اول تحقیق یہہ ہے کہ کیا ہم کسی ایسے مظہر یا مظاہر کو بھی دیکھتے ہیں جو مادہ سے اس قدر الگ ہوں کہ مادہ اِن کا باعث نہو یا باعث جزوی ہو؟ قوت اور حیات کے متعلق ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہم انھیں سوائے مادہ کے تعلق کے کسی اور طرح نہیں جانتے۔ اب رہی قوت مدرکہ اس کے متعلق مختلف خیال ہیں۔ بعض کا یہ مذہب ہے کہ وہ مادہ سے آزاد ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ دماغ کا نتیجہ ہے اور بعض کا مذہب یہ ہے کہ نظام اعصابی قوت مدرکہ کا آلہ ہے اور وہ اس طور پر

کہ تمام افعال ادراکی کا تعلق اس نظام کی ساخت اجزائے لاتیجزے کی حرکت سے ہے اور یہی قرین قیاس معلوم ہوتا ہے لیکن یہ بات رہ جاتی ہے کہ آیا وہ اس کا باعث کافی ہے۔ بہرحال اس میں شبہ نہیں کہ قوت بلا شرکت مادہ ہمیں کہیں نظر نہیں آتی۔

مگر اس میں شک نہیں کہ ادراک طبیعی دکانشس نس، یعنے خالص قوت مدرکہ کا قوت مدرکہ پر غور کرنے کا فعل مادہ سے بالکل بے تعلق ہے۔ اور بلاشبہ وہ جذبات جن میں غرض کا مطلق لگاؤ نہیں ہوتا مثلاً محبت یا رحم بھی مادی تعلقات سے بری معلوم ہوتے ہیں اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمیں ایسے مقام پر لے جاتے ہیں جہاں مادہ سے کچھ واسطہ نہیں لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ادراک طبیعی دکانشس نس، کو اُن دیگر ادراکی افعال سے الگ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں جن کا تعلق دماغ کے تغیرات اجزائے لاتیجزے سے ہے اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے جذبات سے ہمارے جسم اور دماغ پر کس قدر اثر پڑتا ہے مثلاً دفعتاً سر میں درد ہونا۔ چہرہ کا سرخ ہو جانا۔ نبض اور سانس کا تیز ہو چلنا۔ تو ہمیں اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ہم مادہ کی شرکت سے بری نہیں ہو سکتے اور اسی اعتراف سے مادئین کی بن آتی ہے۔ کیونکہ بظاہر عالم کہیں بلا تعلق مادہ نہیں پائے جاتے اس کا لگاؤ کہیں نہ کہیں اور کبھی نہ کسی طرح ضرور رہتا ہے لیکن اس سے

یہ ضرور نہیں کہ صرف مادہ ہی ان تمام مظاہر کا باعث کافی و وافی ہے۔
اب دیکھنا یہ ہے کہ اگر ایسا نہیں ہے تو کون سی شئے ہے جو اسکا تکملہ کرتی ہے۔
شاید یہ بات عجیب معلوم ہو لیکن بہرحال یہ باور کرنا چاہیئے کہ مادہ کے وجود کی شہادت سوائے قوت مدرکہ کی اطلاع کے اور کوئی نہیں ہے۔ یعنی مادہ کا وجود خود قوت مدرکہ کا نتیجہ ہے جو وہ بعض واقعات سے اخذ کرتی ہے جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں صرف حواس کا یقین کرنا چاہیئے اور قوت مدرکہ کے نتایج کا اعتبار نہ کرنا چاہیئے انھیں یاد رکھنا چاہیئے کہ مادہ حس سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ اسکا تعلق قوت مدرکہ سے ہے جو حواس کے واقعات سے نتیجہ نکالتی ہے۔ اس امر کو مشہور فلسفی بشپ بارکلی نے نہایت خوبی کیساتھ ثابت کیا ہے۔ میں یہاں اسکے فلسفہ کو بالتفصیل بیان نہیں کرنا چاہتا بلکہ اسی قدر اشارہ پر کفایت کرتا ہوں۔
مادہ کی تین حالتیں ہیں جو قدیم سے ابتک تسلیم کیگئی ہیں۔ ٹھوس جیسے برف۔ سیال جیسے پانی اور روخانی جیسے آکسیجن یا ہیڈروجن۔ بعض اہل سائنس نے ایک او حالت بھی اضافہ کی ہے جو گیس سے بھی زیادہ لطیف ہے اور وہ شعاعی کہلاتی ہے۔
مادہ کی نسبت یہ خیال کیا گیا ہے کہ وہ اجزائے لاتیجزے سے بنا ہے۔ یہ وہ چھوٹے چھوٹے اجسام ہیں جنمیں مادہ کے تمام خواص موجود ہیں اور انکے باہمی تعلق کو قوت اجزائے لاتیجزے کہتے ہیں۔ اور ہر جزو دیمقراطیسی کسی کیمیاوی عنصر کے ایک یا ایک سے زاید اجزائے لاتیجزے

سے بنا ہے اور ان مختلف عناصر کے اجزائے دیمقراطیسی میں جو تناسب پایا جاتا ہے وہ کیمیاوی اتصال کے قوانین کی رو سے عمل میں آتا ہے۔

یہ اجزائے لایتجزٰی اور اجزائے دیمقراطیسی کیا ہیں؟ انسان کی آنکھ نے ان میں سے کسی کو نہیں دیکھا اور ان کے وجود کا علم ہمیں اسی طرح استدلال اور قیاس سے حاصل ہوا ہے۔ جیسے روح کا ہے۔ جزو لایتجزٰی میں چند خواص و صفات مانی گئی ہیں۔

اول قوت اتصال یا کشش اجزائے لایتجزٰی۔ یہ وہ قوت ہے جو ہر شے کو جو جزو لایتجزٰی سے بڑی ہے، مجتمع رکھتی ہے۔ یہ قوت ٹھوس حالت میں زیادہ۔ حالت سیّال میں کم اور حالت دخانی میں بالکل نہیں ہوتی۔

دوم۔ یہ خیال کیا گیا ہے کہ ہر جزو لایتجزٰی ایک انتعاشی حرکت سے بےچین رہتا ہے اور اس حرکت کے مختلف نتائج سے مادہ کی ٹھوس، سیال، دخانی اور شعاعی حالتوں میں فرق پیدا ہوتے ہیں۔

سوم۔ ہر جزو لایتجزٰی میں نہ صرف بیرونی حرکت ہوتی ہے بلکہ ایک حرکت اندرونی بھی ہوتی ہے۔ بیرونی حرکت کل جسم یا نظام کی ہے اور اندرونی حرکت ایک حصہ جزو لایتجزٰی کی دوسرے حصہ پر۔ مگر اس حرکت سے اس کی اجتماعی حالت زائل نہیں ہوتی ہے یعنی یہ نہیں ہے کہ اس کا ہر حصہ الگ ہو جائے بلکہ حرکت میں کپکپاہٹ یا ہیجانی

چہارم ہر شئے کے اجزای لایتجزی ایک ہی جسامت کے خیال کئے گئے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ایک شے کا ہر حصہ ایک سا ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ایک گیس کی دو قسمیں پیدا کرنا جو مختلف جسامت کے اجزائے لایتجزائے سے بنی ہوں ناممکن ہے۔

اس سے مفصلہ ذیل نتائج نکلتے ہیں :-

۱۔ ایک شئے کے اجزائے لایتجزئی بالکل ایک ہی سے ہوتے ہیں مگر دوسری اشیا کے اجزا سے مختلف ہوتے ہیں۔

۲۔ مختلف اشیاء کے اجزائے لایتجزی جسامت میں مختلف ہوتے ہیں اور اُن میں کامل تدریجی ترقی نہیں ہوتی۔

۳۔ ایک شئے کے اجزائے لایتجزائے اپنی اندرونی حرکت میں توافق رکھتے ہیں اور اسی لئے اس روشنی میں بھی جو اُن سے نکلتی ہے۔

۴۔ کسی جزو لایتجزائے میں کسی عمل سے کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوسکتی

مادہ کی صحیح تعریف کرنا نہایت مشکل ہے اور نہ طبعیات کی کسی کتاب سے ... تعریف کا پتہ لگتا ہے۔ لیکن نظریہ اجزائے لایتجزائے کا جو مادہ کے متعلق جدید نظریہ ہے) صحیح بیان مختصر طور پر کر دیا گیا ہے اب ہم ایک قدم اور آگے بڑھتے ہیں اور ان میں سے ایک جزو لایتجزائے لیتے ہیں۔ یہ ایک چھوٹے سے چھوٹا جزو مادہ کا ہے جس میں تمام صفات و خواص مادہ کے موجود ہیں۔ یا تو یہہ سادہ یعنی مفرد ہے۔ جیسے آکسیجن کا جزو لایتجزائے یا مرکب جیسے پانی کا جس میں دو اجزائے دیمقراطیسی

ہائیڈروجن کے ہیں اور ایک آکسیجن کا۔ اس صورت میں جزو دیمقراطیسی ایک مرکب شئے ہے کیونکہ از روئے علم کیمیا اس زمین پر تخمیناً ستر اشیا ایسی ہیں جو مفرد یا سادہ حالت میں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک میں دوسرے سے ترکیب پانے کی دشرطیکہ وہ ترکیب پا سکے، مختلف مقدار کا لحاظ ہوتا ہے۔ وہ بعض کو بعض شرائط پر اپنے ساتھ ملاتی ہے اور بعض کو رد کر دیتی ہے۔ غرض ہر ایک دوسرے سے بوجہ کیمیاوی کشش یا اندفاع الگ اور مختلف ہے۔ ہم نے اجزائے لاتیجزے اور اجزائے دیمقراطیسی دونوں کو دیکھ لیا۔ ان میں کائنات کی ساخت کا اصل مسالا نہیں پایا جاتا بلکہ ساٹھ ستر اشیا ایسی ہیں جو اپنی صفات کے لحاظ سے الگ الگ ہیں اور جن کی ترکیب سے بیشمار ایسا مواد تیار ہو سکتا ہے جو اجزائے لاتیجزے کے گدام کے لائق ہے۔ جزو لاتیجزے کیمیاوی ساخت کے لحاظ سے اکثر مرکب ہوتا ہے۔ لیکن وہ طبعیات کی رو سے بھی مرکب ہے ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس میں ایک اندرونی حرکت بھی ہوتی ہے یعنے اسکے ایک حصہ کی حرکت دوسرے حصہ پر جس سے کہ آس پاس کے ایتھر میں روشنی پیدا ہوتی ہے اور یہ حرکت مختلف قسم کے اجزائے لاتیجزے میں مختلف ہوتی ہے۔ لہذا اجزائے لاتیجزے اصل مسالا نہیں ہیں بلکہ بذات خود ایک کامل اور عجیب شئے بنائی گئی ہے۔ جسے آنکھ نے نہیں دیکھا بلکہ قیاس نے سوچ کر نکالا ہے۔

اب ایک طرف تو ہم اجزائے لاتیجزے دیکھتے ہیں اور دوسری طرف سادہ اور مفرد عناصر جن سے اجزائے لاتیجزے بنے ہیں۔ لیکن کہیں اصل مسالا جو تمام اشیاء کی اصل ہے نہیں ملا۔ مگر باوجود اسکے ہر طرف ہم انتظام و ترتیب میں عقل و حکمت کی بین شہادتیں دیکھتے ہیں بلکہ ہر ہر قدم پر وہ اور قوی ہوتی جاتی ہیں یہ ہے وہ مادہ جسے عالم علوم طبعیات و کیمیا تمام مظاہر کا باعث بتاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک طبیعی اجزائے لاتیجزے سے وہ صفات منسوب کرتا ہے جن کا موجود ہونا تو وہ پاتا ہے لیکن اجزائے لاتیجزے میں نہیں کیونکہ اس نے اُسے کبھی نہیں دیکھا بلکہ بڑے بڑے مادی مجموعوں میں پایا ہے اور اس لیے اُس کا خیال ہے کہ یہ صفات اجزائے لاتیجزے ہی سے پیدا ہوئی ہیں۔ اسی طرح ایک عالم علم کیمیا اجزائے دمیقراطیسی سے وہ صفات منسوب کرتا ہے جن کا ہونا تو اُسے معلوم ہے لیکن اجزائے دمیقراطیسی میں نہیں۔ کیونکہ اس نے کبھی ایک جزو دمیقراطیسی کا تجربہ نہیں کیا بلکہ انھیں بڑے بڑے مادی مجموعوں میں پایا۔ وہ ہائیڈروجن کے جزو دمیقراطیسی میں آکسیجن سے دو اور ایک کی نسبت سے ملنے کی قوت لکھتا ہے جسے وہ درحقیقت ہائیڈروجن کے بڑے بڑے مجموعوں میں پاتا ہے۔ طبعیات و کیمیا کے واقعات اجزائے لاتیجزے اور اجزائے دمیقراطیسی میں ادا ہوتے ہیں۔ اور اجزائے لاتیجزے اور اجزائے دمیقراطیسی از روئے تعریف کافی سبب ہیں اُن نتائج کے جن سے کہ درحقیقت یہ اسباب استخراج کیے گئے تھے۔

ان کے علاوہ دوسرے علوم بھی ہیں جو واقعات سے بحث کرتے ہیں لیکن وہ اصطلاحات اجزائے لایتجزیٰ اور اجزائے دیمقراطیسی میں ادا ہونے کے قابل نہیں ہیں۔ اور اس لئے وہ اس نظریہ پر کچھ اثر نہیں ڈال سکتے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ یہ نظریہ بھی اُن واقعات پر جن سے وہ بحث کرتا ہے کچھ روشنی ڈالتا ہے یا نہیں۔

کیا نظریہ اجزائے لایتجزیٰ اس اہم اور عظیم واقعہ یعنی حیات پر کچھ روشنی ڈال سکتا ہے؟ جدید تحقیق کی رو سے یہ ثابت ہوا ہے کہ حیات کو خواہ نباتی ہو یا حیوانی کتلۂ الاولے (پروٹوپلیزم) سے ایسا گہرا تعلق ہے کہ بغیر اس کے وہ کہیں نہیں پائی جاتی۔ اور اگرچہ کتلۂ الاولے کے کیمیاوی اجزاء بخوبی معلوم ہیں اور انسان انہیں اپنے ہاتھ سے ایک جگہ جمع کر سکتا ہے لیکن نہ تو کتلۂ الاولے پیدا کر سکتا ہے اور نہ حیات جب تک کہ پہلے سے حیات موجود نہ ہو۔ اگر ہم اُن صفات کو لیں جو از روے جدید سائنس اجزائے لایتجزے میں پائی جاتی ہیں اور اُن کو ہزار طرح ہزار الٹ پلٹ کریں کبھی حیات تک رسائی نہیں ہو سکتی۔ کشش اجزائے لایتجزیٰ کی حرکت دامی، اور اُن اجزا کی کیمیاتی ہوئی حرکت، یہ سب مل کر بھی اس نتیجہ تک نہیں پہنچ سکتے جسے حیات کہتے ہیں اور جو خیال کی اصل بنا اور ساخت کائنات کی جزو اعظم ہے۔ سائنس نے جہاں تک تجربہ کیا ہے یہ امر بالتحقیق ثابت ہوا ہے کہ محض مردہ مادہ سے کوئی زندہ شے نہیں پیدا ہو سکتی۔

جب حیات صرف اجزائ لایتجزیٰ یا مردہ مادہ سے پیدا نہیں ہوسکتی تو پھر قوت مدرکہ تو کہاں ہوسکتی ہے۔ اگرچہ اکثر اہل سائنس کا یہ قیاس ہے کہ قوت مدرکہ مادہ کا نتیجہ ہے لیکن اب تک کسی نے یہ ثابت نہیں کیا کہ یہ کیونکر ممکن ہے جب قوت مدرکہ کا یہ حال ہے تو کانشس معرفت طبعی تو اس سے بھی کہیں پرے ہے کیونکہ معرفت طبعی کے معنے میں قوت مدرکہ کا اپنے باطن پر غور کرنا اور یہ اجزائے وبمیقراطیسی کے ترتیب وینے ملانے اور الٹ پلٹ کرنے سے پیدا نہیں ہوتی۔ اور اس سے بھی بڑھ کر ایثار و محبت و ہمدردی کے جذبات ہیں۔

ممکن ہے کہ مادیین میں سے کوئی یہ کہے کہ یہ سب کچھ سہی لیکن سائنس ترقی پذیر ہے۔ اور جوں جوں اسے ترقی ہوگی مادہ کی تعریف میں وسعت ہوتی جائے گی۔ یہاں تک کہ کسی روز وہ ان تمام مظاہر کو بیان کر سکے گا جو اس وقت مافوق فطرت معلوم ہوتے ہیں۔ اس کا جواب یہی ہوسکتا ہے کہ اگر مادہ کی تعریف میں وسعت ہوجائے گی تو اس کے ساتھ ہی یہ دلیل بھی کہ خود مادہ اس امر کی شہادت ہے کہ قوت مدرکہ اس سے قبل موجود تھی اور زیادہ قوی ہوجائے گی۔ جس قدر اجزائی لایتجزے کی تحقیق میں زیادہ تہ کے اندر جاؤ گے اسی قدر اجزائے لایتجزے کے پیدا کرنے کے لئے قوت مدرکہ کی زیادہ ضرورت معلوم ہوگی۔ اگر نباتات اجزائے لایتجزے کا نتیجہ ہیں تو اجزائے لایتجزے کے وجود کے لئے بے شک قوت مدرکہ کی ضرورت ہوئی ہوگی۔ غرض اس مشکل کو جس طرح

چاہو حل کرنیکی کوشش کرو ایک چیز ایسی ماننی پڑیگی جو مادہ نہیں ہے۔ اور اسمیں شک نہیں کہ ہم اس چیز کو مادہ سے الگ نہیں پاتے۔ کیونکہ جس عالم کا ہمیں تجربہ ہے اس میں یہ سنگت ضروری ہے۔ لیکن یہ تجربہ محض کیطرفہ ہے۔ کائنات میں اور خود ہم میں اس امر کے اشارات اور شہادتیں موجود ہیں کہ یہ شئے جو مادہ نہیں ہے عقل اور قوّت مدرکہ سے تعلق رکھتی ہے اور اُسے اپنے ساتھی مادہ پر فضیلت ہے۔ یہ کچھ تعجب کی بات نہیں ہے کہ روح جسم کی قید سے الگ ہوکر بھی قائم رہ سکتی ہے۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ مادہ کا نظریہ اجزائے لایتجزے اور اجزائے دیمقراطیسی کے ذریعہ سے ظاہر کیا گیا ہے وہ خود ایک ایسی خالق اور منتظم قوت مدرکہ کی شہادت دیتا ہے جسکی ہستی اس سے قبل ہے اور اس سے افضل ہے۔

۱۰

نظام کائنات پر نظر ڈالنے اور اپنے باطن پر غور کرنے سے ہم یہاں تک پہنچے کہ کوئی ایسی شے ضرور ہے کہ مادہ سے بالا ہے جسے ہم روح کہتے ہیں اور کوئی ایسی قوت بھی اور ہے جو اس سے بھی بالا اور افضل ہے اور ساری کائنات پر حاوی اور ساری ہے۔ مذہب کی اصل یہیں پیدا ہوتی ہے جس سے سائنس بےخبر ہے اور اس بےخبری میں اس پر حملے کرتا اور مضحکہ اڑاتا ہے۔ پچھلی صدی میں

جبکہ سائنس کی ترقی معراج کمال پر نظر آتی تھی۔ اکثر مذہب پر حملے کرنا۔ اس کی ہنسی اڑانا اور اس سے نفرت اور حقارت ظاہر کرنا اہل سائنس و فلاسفہ وحکما اور اکثر بڑے بڑے مصنفین کا عام دستور ہو گیا تھا اور یہ دستور رفتہ رفتہ فیشن ہو گیا اور یہ سمجھا جاتا تھا ور اب بھی اکثر سمجھا جاتا ہے کہ مذہب بوڑھیوں کی کہانی اور بچوں کا کھیل ہے۔ یا ایک بیچا ہے جس کا ڈرامہ زمانہ طفلی سے بیٹھا ہوا ہے۔ یا بھوت پریت کا سایہ ہے جو اب تک اس کے سر پر منڈلا رہا ہے۔ سائنس کے پر زور اور بیجا حملوں اور اس کی حیرت انگیز ترقی سے یہ یقین ہو چلا تھا کہ مذہب کوئی دن کا مہمان ہے۔ دنیا پر اب حکومت سائنس کی ہوگی وہ اُن پیچیدہ مسائل اور گتھیوں کو سلجھائے گا جو اب تک لاینحل سمجھی جاتی تھیں۔ لیکن خود اس کے زور نے اسے کمزور کر دیا۔ اور وہ نشہ جس سے اہل سائنس مخمور تھے اترنے لگا اور باوجود حیرت انگیز ترقی اور عروج کے معلوم ہوا کہ وہ بے بس ہے اور اپنی حد سے آگے نہیں چل سکتا انگرسال اور بریڈلا جیسے اعدائے مذہب بے وقعت ہوتے جاتے ہیں اور ان کی ہفوات پر کچھ توجہ نہیں کی جاتی۔ فرقہ ایک ناسٹک دلا اور یہ اکے بانی پروفیسر ہکسلے کے پُرزور دلائل میں اب وہ قوت نہیں رہی اور ان کے پیرو بھی اب دبیسے پڑ چکے ہیں۔ وہ نظام جو ابتداء سے انسان کے ساتھ ہے جوں جوں انسان بڑھا وہ بھی اس کے ساتھ بڑھتا رہا۔ اس لیے دنیا میں بڑے بڑے تغیرات اور عظیم الشان

انقلابات پیدا کئے اور اس کی ترقی میں پیش پیش رہا۔ اور یہ اب بھی انسان کی معاشرت اور تمدن کے ہر پہلو اور ہر روش میں نظر آتا ہے اس کی حکومت انسان کے دل پر اب بھی ویسی ہی ہے جیسی پہلے تھی اور آئندہ بھی ایسی ہی رہے گی۔ تعجب اور سخت تعجب ہے کہ اہل سائنس نے اس کی طرف سے نہ صرف بے توجہی کی بلکہ حقارت کا اظہار کیا۔ بجائے اس کے کہ وہ اس مہتم بالشان اور عجیب و غریب نظام پر جس کی قوت ابتدا سے اب تک برابر چلی آرہی ہے اور جس کی حکومت سے باوجود انکار کے بھی انسان نہیں بچ سکتا غور کرتے اور دوسرے پہلو سے نظر ڈالتے انہوں نے سائنس کے بھروسے میں اس سے مُنہ موڑ لیا۔ صرف ایک پہلو دیکھکر سمجھ لیا کہ دوسری طرف کچھ نہیں حالانکہ اگر مذہب کے پہلو سے انسانی ترقی پر نظر ڈالی جائے تو منظر زیادہ وسیع اور کامل ہو جاتا۔ لیکن یہ اہل سائنس کی کوتاہ نظری ہے کہ انہوں نے انسانی ترقی اور تہذیب و تمدن کا انحصار محض سائنس پر رکھا۔ حیات کی ہر حرکت اور روش کے کچھ نہ کچھ معنی ضرور ہیں۔ جب کوئی چیز دنیا میں اتفاق سے نہیں آتی۔ تو کیا مذہب جنہیں انسان کی تاریخ و معاشرت میں اس قدر دخل و تصرف اور قوت ہے مہمل اور لغو ہیں؟ کیا انہیں انسانی ترقی و تہذیب و تمدن میں کچھ بھی دخل نہیں؟ یہ ایک بڑا اہم مسئلہ ہے جس پر اہل سائنس اور فلاسفہ کو غور کرنا چاہیے تھا مگر افسوس ہے کہ ان کی تنگ نظری اور ہٹ نے انہیں کبھی اس طرف

متوجہ نہ کیا۔ سائنس کی نظر ہمیشہ مذہب کی طرف سے پھری رہی اور ابتدا سے جو اس نے مذہب کی مخالفت میں کمر باندھی تو اب تک وہی مخالفت چلی آتی ہے۔ لیکن کبھی اس نے یہ غور نہ کیا کہ آخر مخالفت کیوں ہے بلکہ بجائے تحقیق کے جو اس کا شیوہ ہے اس نے اس جلتی آگ میں اور تیل ڈالا۔

ہم دنیا کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ انسان ابتدا سے برابر ترقی کرتا چلا آتا ہے اور ایک زینہ سے دوسرے زینہ پر چڑھتا چلا جاتا ہے۔ اور جب ہم اس ترقی پر بہ حیثیت مجموعی نظر ڈالتے ہیں تو یہ ایک ایسی عجیب وغریب اور عظیم الشان حقیقت نظر آتی ہے کہ خود انسانی خیال بھی اس کے سامنے جھجک کے رہ جاتا ہے۔ سب سے اول اسے حیوانات اور وحشی جانوروں سے سابقہ پڑا۔ اور ان پر غالب آکر وہ آگے بڑھا اور رفتہ رفتہ برابر ترقی کرتا رہا۔ مگر اس رستہ میں اسے بڑی بڑی مصیبتیں اور آفتیں جھیلنی پڑیں۔ بڑی بڑی ناکامیوں کا سامنا ہوا۔ اور اب تک ترقی کے میدان میں اُسے وہی ہفتخوان طے کرنے پڑتے ہیں اور اسے اپنے بنی نوع کے ساتھ ہر دفعہ اور ہر لحظہ وہی لڑائی لڑنی پڑتی ہے جو وہ اب تک لڑتا آیا ہے یہی لڑائی مقابلہ مناقشہ اور جد وجہد ترقی اور تہذیب و تمدن کی جان ہے ہر شے جس میں حیات ہے اور تمام امور اور خیالات میں جن کا حیات سے تعلق ہے یہی جد وجہد پائی جاتی ہے۔ تمام افعال وحرکات میں تمام

ارادوں اور نیتوں میں۔ اندرونی اور بیرونی زندگی میں ہماری زندگی کے اعلیٰ اور نازک موقعوں میں ہمارا بڑا منشا یہہ ہوتاہے کہ کامیابی حاصل کریں اور ناکامی سے بچیں۔ ہماری ساری طاقت اور دانشمندی اسی میں صرف ہوتی ہے۔

انسان اور دیگر تمام حیوانات میں ایک خاص فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان میں دو ایسی خصوصیتیں جمع ہیں جو کسی دوسرے حیوان میں نہیں۔ اور اس لئے اس کا ارتقاء دوسرے حیوانات کے ارتقا سے مختلف ہے۔ ایک تو عقل ہے اور اس ترقی میں اس کا بڑا حصہ ہے لیکن عقل انسان کو دو باتیں سکھاتی ہے ایک تو یہہ کہ اس کا ذاتی فائدہ سب سے ضروری اور سب سے مقدم ہے دوسرے موجودہ وقت بڑی چیز ہے۔ ہمارا سارا فائدہ اسی سے وابستہ ہے اور اسی میں ہونا چاہیے دوسری خصوصیت انسان میں مدنیت کی ہے یعنی وہ قابلیت جس کے اثر سے وہ اپنے بنی نوع سے مل جلکر جماعتوں میں رہ کر کام کرتا ہے۔ یہہ دو خصوصیتیں ایک دوسرے کی مخالف ہیں اور آپس میں ان کی مصالحت ممکن نہیں معلوم ہوتی۔ عقل کا کام تفرقہ۔ انفعال۔ اور فنا ہے۔ تمدن کی ترقی کے لئے ایثار اور سوسائٹی کے فائدہ کو اپنے فوائد پر مقدم سمجھنا اپنے اغراض و فوائد کو دوسروں کے لئے اور خصوصاً ان نسلوں کے لئے جو اب تک وجود میں نہیں آئیں۔ قربانی کرنا ہے۔ یہہ ایثار اور قربانی سائنس اور عقل نہیں سکھا سکتی اس کی ہدایت عقل اور سائنس سے

بالا ہے اور یہہ ہدایت مذہب سے حاصل ہوتی ہے اور اس لئے انسانی تمدن و ترقی مذہب پر مبنی ہے۔ ارتقار کا مقصد جد و جہد اور قربانی سے حاصل ہوتا ہے اور یہہ صرف مذہب میں پایا جاتا ہے جس کی ہدایت عقل سے بالا ہے۔ عقل اس کی مخالف ہے اور اس لئے ضرور ہے کہ عقل مذہب کے تابع رہ کر جد و جہد کرے۔ ورنہ اگر وہ غالب آ جائیگی تو شیرازہ نظام تمدن بکھر جائے گا۔ ارتقائے عالم میں افراد سوسائٹی کے لئے قربانی کر دیے جاتے ہیں۔ عقل افراد کو اپنے فوائد کے لئے سعی کرنا سکھاتی ہے اور انسانی ترقی کی راہ میں حائل ہوتی ہے۔ مذہب ہمیں ذاتی اور شخصی قربانی اور ایثار سکھاتا ہے۔ نہ صرف ان لوگوں کی خاطر جو ہمارے آس پاس زندہ موجود ہیں بلکہ اُن لوگوں کے لئے بھی جو آئندہ زمانہ میں آئیں گے اور ابھی وجود میں نہیں آئے۔ حالانکہ یہ امر ذاتی فوائد کے خلاف ہے۔ غرض انسانی تمدن میں دو مخالف رجحانات کی نشو و نما ہوتی ہے۔ ایک وہ جس میں افراد کو سوسائٹی کے تابع ہونا پڑتا ہے اور دوسرا رجحان عقلی ہے جسے اس اتباع میں جس میں اس کا مطلق فائدہ نہیں بلکہ زیادہ تر ایسے لوگوں کا فائدہ ہے جو ابھی وجود میں نہیں آئے تامل او رعذر ہے۔ لیکن ترقی وہی قوم کر سکتی ہے جس میں دوسرا رجحان پہلے رُجحان کے تابع ہے مگر اس اتباع کے لئے عقل یا سائنس کی کتاب میں کوئی فتویٰ نہیں ملتا۔ اگر ہم اپنی زندگی پر غور کریں کہ وہ کس قدر تاپائدار اور کس قدر بے بنیاد ہے تو عقل صرف

ایک غرض پر زیادہ زور دیتی ہے جس کے سامنے باقی تمام خیالات ہیچ ہیں۔ اس کی ہدایت یہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو عمر کے ان چند لمحوں کو کام میں لایا جائے اور حتی الوسع ان سے فائدہ اٹھایا جائے انسان تکلیف سے بچے۔ راحت حاصل کرے اور یہ چند دم جو ہمیں مستعار ملے ہیں آرام سے بسر ہو جائیں۔ اور اسی خیال سے انسان دولت کماتا ہے اور شہرت اور قوت حاصل کرتا ہے اور طرح طرح کے ایسے کام کرتا ہے جن سے عیش و راحت او لطف نصیب ہو۔ اگر یہ رجحان بے روک ٹوک ترقی کرتا رہے تو انسانی ترقی رک جائے اس لئے اسے ایک دوسرے رجحان کے تابع ہونا پڑتا ہے جس کا ذکر ہم ابھی کر چکے ہیں۔ دنیا میں جہاں کہیں اصل ترقی ہوئی وہاں اخلاقی اور مذہبی رجحان غالب رہا اور عقل اس کے تابع رہی۔ عقل بے شک ہماری رہبر و رہنما ہے لیکن اس کا احاطہ محدود ہے اور اس کی نظر تنگ ہے۔ اور اس لئے ضرورت ہے ایک ایسی ہدایت کی جو اس سے آگے ہمیں لے جائے اور یہ کمی مذہب سے پوری ہوتی ہے۔ اکثر کہا جاتا ہے کہ جو لوگ مذہبی اور اخلاقی نظام کے بالکل قائل نہیں وہ باوجود اس کے نیک نیت اور بخیر اور نیک چلن ہوتے ہیں لیکن یہ امر ماننے یا نہ ماننے پر منحصر نہیں ہے۔ انسانی تمدن یا انسانی ترقی چند اشخاص یا ایک آدھ نسل کا کام نہیں ہے قرنوں اور نسلوں کی جد و جہد کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ جو شخص کسی اصول اخلاق و مذہب کا قائل

نہیں ہے وہ بھی اسی سلسلہ تمدن کی پیداوار ہے۔ اس کی نشست و برخاست بات چیت۔ طرزِ خیال۔ غرض کل حرکات و افعال اُسی سانچے میں ڈھلے ہیں اور اُسی سوسائٹی سے ارثاً تعلیماً صحبتہً ملے وہ ہزار زبان سے انکار کیا کرے مگر جو روش و رجحان طبیعت اس میں پیدا ہو گیا ہے وہ اسے زائل نہیں کر سکتا یعنی وہ اپنے آپ سے باہر نہیں نکل سکتا۔ وہ مجبور ہے۔ اور بات بات میں اسی نظام اخلاق و مذہب کا تابع ہے جس سے وہ انکار کرتا اور جس کی وہ تضحیک کرتا ہے۔

یونان کی عقلی ترقی دنیا کی تاریخ میں بے نظیر ہے اور بڑے بڑے اہل الرا کی رائے ہے کہ باوجود زمانہ موجودہ کی حیرت انگیز ترقی کے ہم ابھی تک اس درجہ کو نہیں پہنچے اور ہم اب بھی سقراط افلاطون و ارسطو و فیدس جیسے لوگ پیدا نہیں کر سکے۔ لیکن باوجود اس زبردست عقلی ترقی کے وہ ایسا نیست و نابود ہوا کہ گویا کبھی پتا ہی نہ تھا۔ یہ اس لئے کہ اس ترقی میں عقل غالب آگئی تھی اور اخلاقی و مذہبی اصول تابع عقل کر دیئے گئے تھے اسی بداخلاقی و بدمذہبی نے روما کو تباہ و برباد کیا۔ لیکن یہودی اور ہندو باوجودیکہ وہ صدیوں سے محکوم اور غلام ہیں اب تک باقی ہیں اور ان میں ترقی کی صلاحیت موجود ہے۔ روما و یونان کے زوال کی تاریخیں پڑھنے سے حیرت و عبرت ہوتی ہے اور یہ بہت بڑا سبق ہے اُن اقوام کے لئے جو دنیا میں بڑھنا اور ترقی کرنا چاہتی ہیں۔

انسان کی طبیعت ایسی واقع ہوئی ہے کہ وہ ایک حالت پر قائم نہیں

رہنا ایک چیز کے حاصل ہونے پر دوسری اور دوسری سے تیسری کی طرف لپکتا ہے۔ جب بھوک لگی تو کھانے کی تلاش ہوئی رفتہ رفتہ جب روٹی پیٹ بھر ملنے لگی تو بھوک تو ایک طرف رہ گئی کھانے کا مدار ذائقہ پر آ ٹھیرا۔ اور اس چاٹ میں اس نے وہ ترکیبیں اور نزاکتیں پیدا کیں کہ کچھ انتہا نہیں۔ کپڑا بدن کی حفاظت اور راحت کے لئے تھا اُسے اس نے وجہ زیبائش اور آرائش بنا لیا۔ وہ حقیر جھونپڑا جو سر چھپانے کے لئے بنایا تھا ایک شاندار محل بن گیا ہے۔ جس میں تمام سامان آرائش و حسن جمع ہیں۔ اسی طرح اس نے دولت، حکومت قوت حاصل کرنے کی کوشش کی اور جوں جوں اس کے دل کا مدعا حاصل ہوتا گیا اس کی ہوس اور بڑھتی گئی اور اس کے خیال کی جولانی میں اور وسعت ہوتی گئی۔ اور ہر شئے میں نئی نئی نزاکتیں اور لطافتیں پیدا ہوتی گئیں اور وہ ان میں ایسا محو ہوا کہ بالآخر یہی اس کے زوال کا باعث ہوئیں۔ اصل یہہ ہے کہ انسانی ترقی باطن سے شروع ہوتی ہے اور انسانی تنزل بھی باطن ہی کی طرف ہوتا ہے جو لوگ جسمانی آرام اور مادی راحتوں میں مبتلا رہتے ہیں وہ اسی کو اصل ترقی سمجھتے ہیں۔ وہ ہمیشہ درجۂ اسفل میں رہتے ہیں اور کبھی درجۂ اعلیٰ کو نہیں پہنچتے جو ہمیشہ باطن کی ترقی سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ جسم عارضی اور فانی ہے اور اس کے ساتھ اس کی ساری خواہشیں اور راحتیں اس کی ساری حکومت اور قوت بھی فنا ہونے والی ہے جسم کے چھوڑنے کے بعد روح رہ جاوے گی اور وہ ہمیشہ رہے گی جس نے اپنی نفسانیت اور خودغرضی کو دبا کر ایثار کو ترجیح

نہیں دی جس نے اس ہدایت کے نور سے جو مذہب کے ذریعہ سے ہوتی ہے اپنے آپ کو منور نہیں کیا اور اپنے باطن اور روح کی صفائی کی طرف توجہ نہیں کی تو اس کی روح عالم ارواح میں بھی ادنےٰ حالت میں رہے گی۔ ڈاروِن کا اصول ارتقا صرف جسم اور اس کے علائق تک ہے۔ جب جسم کا خاتمہ ہوگیا۔ اُس کے اصول ماننے والوں کو اور ذرا دوسری طرف بھی توجہ کرنی چاہئے جو اصل ترقی ہے اور جس کا سلسلہ ابدالآباد تک رہنے والا ہے۔ جسم کے چھوڑنے کے بعد روح جس حالت میں یہاں تھی اُسی حالت میں عالم ارواح میں پہنچی ہے۔ اگر وہ یہاں ادنےٰ حالت میں تھی تو وہ وہاں ادنےٰ حالت میں رہ کر پھر ترقی کرے گی اور یہاں کی جسمانی خواہشات غالباً اس کی تکلیف کا باعث ہوں گی۔ اگر اس نے یہاں ترقی کی ہے تو ترقی یافتہ حالت میں پہنچے گی اور وہاں سے ترقی کر کے اپنے سے اعلیٰ دوسرے عالم ارواح میں جائے گی اور اسی طرح ترقی کر کر کے اس سے بھی اعلیٰ عوالم میں پہنچے گی اور یہ سلسلہ ہمیشہ ہمیشہ جاری رہے گا۔ کیونکہ جس طرح سیاروں کے نظام لاتعداد ولاتحصے ہیں اسی طرح نظامات روح بھی بیحد و بیشمار ہیں۔ یہ ہے اصل اور صحیح اصول ارتقا جس کا سلسلہ نامتناہی ہے اور لازوال ہے۔ اس لئے انسان کا فرض ہے کہ وہ ادنےٰ خیالات کو چھوڑ کر درجہ اسفل سے اعلیٰ کی طرف ترقی کرے۔ جس کی ہدایت ہمیں مذہب کرتا ہے۔

۱۱

غرض سائنس انسان کا کل تعلق کائنات سے اس طور پر ظاہر نہیں کر سکتا جیسا کہ مذہب کرتا ہے۔ کیونکہ سائنس کا دائرہ محدود ہے۔ اس کی رسائی صرف مادی اشیاء تک ہے۔ لیکن مذہب کی حکومت بہت وسیع ہے۔ اور وہ مادی اور غیر مادی دونوں ملکتوں پر حاوی ہے اور اس کے اصول دور دور تک پہنچتے ہیں۔ جہاں سائنس کے پر جلتے ہیں۔ مذہب نہ صرف اُن فرائض کو ادا کرتا ہے جو متعلق انسان کے نفس سے ہیں یا جو دوسروں سے متعلق ہیں۔ بلکہ وہ اُن فرائض کا بھی خیال رکھتا ہے جو اُن لوگوں سے متعلق ہیں جو ابھی وجود میں نہیں آئے نہ صرف یہی بلکہ وہ اس عالم سے بھی متعلق ہے جہاں ہمیں اس دنیا سے کوچ کرنے کے بعد جانا ہے۔ سائنس انسان کی روح اور روحانی عالم اور عقبے کا انکار کرے کیونکہ وہ کوتہ نظر ہے۔ لیکن اس کے انکار سے کسی شئے کی ہستی زائل نہیں ہو سکتی۔ اہل سائنس اپنے بھورسے برابر علم پر اس قدر نازاں اور مغرور ہیں کہ جو بات ان کے علم میں نہیں اس سے وہ جھٹ انکار کر بیٹھتے ہیں۔ اور چند قانون قدرت جو انہیں معلوم ہوتے ہیں ان پر اس قدر بھروسہ ہے کہ جو بات ذرا ان کے خلاف نظر آئے فوراً کہہ بیٹھتے ہیں کہ یہ نا ممکن ہے یہ خلاف قانون قدرت ہے۔ گویا یہ کائنات کے تمام قوانین قدرت پر حاوی

ہیں جو ذرا ہوشیار ہیں۔ انہوں نے ایک دوسری ترکیب نکالی ہے
ان کا جواب یہ ہوتا ہے کہ ہم نہیں جانتے یا ہمیں اس کا علم نہیں
لیکن یہ جواب خود ان "سائنٹفک" ہے۔ سائنس جستجو تلاش اور
تحقیق سکھاتا ہے۔ تحقیق سے اعراض کرنا مسائل کی ذات کے خلاف ہے
لیکن اہل سائنس کی یہی ہمیشہ کی عادت رہی ہے جو امور ان کی
تحقیق اور ان کی حدود سے باہر ہیں ان کے تو منکر ہی ہیں لیکن
سائنٹفک تحقیقات کو بھی انہوں نے ہمیشہ اسی نظر سے دیکھا ہے۔
ڈاکٹر ڈریپر نے اپنی کتاب میں اہل مذاہب پر توجا بجا طعن و
تشنیع کی ہے کہ انہوں نے سائنس کی مخالفت کی لیکن انہیں یہ بھی
ضرور معلوم ہوگا کہ خود اہل سائنس نے تمام سائنٹفک تحقیقات کی ابتدا
ابتدا میں کس قدر مخالفت کی ہے۔ اور جب کبھی اور جہاں کہیں سائنس
میں کوئی نئی دریافت یا تحقیقات ہوئی تو سب سے اول اس کی مخالفت
میں اہل سائنس آستینیں چڑھا کر آئے۔ کوپرنیکس۔ گلیلیو اور ہاروے
کے نام سے کون واقف نہیں۔ انہوں نے سائنس میں ایسے ایسے
انکشافات کئے ہیں جو تا قیامت یادگار رہیں گے۔ لیکن ان کی
مخالفت سب سے اول نہایت شدومد کے ساتھ ان کے ہم عصر اہل
سائنس نے کی۔ جب بنجمن فرینکلن نے رائل سوسائٹی کے سامنے برق
کی بحث کی تو تمام اہل سائنس نے اسے بے وقعت بنایا اور رسالہ
"فلاسوفیکل ٹرینزایکشن" نے اس مضمون کو درج کرنے سے انکار کیا

حالانکہ وہی چیز آجکل کس قدر مفید اور کارآمد ثابت ہوئی اور اس کا استعمال عام ہوگیا ہے۔ جب ینگ نے روشنی کے نظریہ انتعاشیہ کے عجیب وغریب ثبوت پیش کئے تو سائنس دانوں نے اس کی خوب ہنسی اڑائی۔ سر ہمفری ڈیوی نے جب یہہ خیال ظاہر کیا کہ لندن میں گیس کی روشنی ہوسکتی ہے تو اہل سائنس نے اس کا مضحکہ اڑایا۔ اسٹیفن نے جب یہہ تجویز کی کہ لورپول اور مانچسٹر کے ریلوے روڈ پر انجن گاڑی چلائی جائے تو اس وقت کے بڑے بڑے اہل سائنس نے شہادت میں بیان کیا کہ یہ ناممکن ہے کہ اس کی رفتار بارہ میل فی گھنٹہ بھی ہوسکے۔ جب نامور اور مشہور منجم ارسے گو نے برقی ٹیلیگراف کے متعلق بحث کرنی چاہی تو فرنچ اکاڈیمی آف سائنس نے اس کی خوب ہنسی اڑائی اور اسے بحث نہ کرنے دی۔ یہ چند عام اور معمولی نظریں پیش کی گئی ہیں ورنہ سائنس کی ہر شاخ کے متعلق سیکڑوں مثالیں موجود ہیں کہ جب کسی نے کوئی نئی تحقیقات کی تو سب سے اول اہل سائنس نے اس کی مخالفت کی۔ جب سائنس کے متعلق اہل سائنس کا یہ حال ہے تو روحانیت کے متعلق وہ جس قدر رشد و مد کے ساتھ مخالفت کریں کم ہے۔ لیکن وہ امور جن کی وہ مخالفت کرتے ہیں اور جن کے ماننے سے وہ انکار کرتے ہیں ایک روز مسلم ہوجائیں گے اور انہیں اپنی مخالفت پر خود افسوس کرنا پڑے گا کیونکہ انہوں نے دیدہ ودانستہ اپنے ہاتھوں اپنے علم کو محدود رکھا۔ اہل سائنس اہل مذاہب کو تعصب کا الزام

دیتے ہیں. لیکن ان کی ضد اور ان کا تعصب ان سے کچھ کم نہیں
ان کے ذرا سے علم نے انہیں اندھا کر دیا ہے۔ تحقیق و تجسس جس پر
انہیں ناز ہے وہ صرف ایک نہایت تنگ دائرہ تک محدود رکھتے ہیں
اس کے آگے دیکھنے سے وہ صاف انکار کرتے ہیں اور محض تعصب
کی وجہ سے اپنی تحقیق کا دائرہ وسیع کرنا نہیں چاہتے لیکن وہ وقت
آتا ہے جب انہیں مجبوراً اس خول کو توڑ کر باہر نکلنا پڑے گا۔

غرض اگر ہم روح کی ہستی اور اس کی قوت سے جس کے متعلق بے
انتہا واقعات اور بہت قوی دلائل موجود ہیں انکار کر دیں اور مذہب
کو جس کے اصول کی زیادہ تر بنیاد اسی پر ہے انسانی تمدن سے خارج
کر دیں تو انسان کی زندگی محض بے سود و بیکار اور بے برگ و ثمر رہ جاتی
ہے اگر انسان صرف اسی مادی دنیا کو اور اس چند روزہ زندگی کو اپنا
منتہا سمجھ لے تو کیا اُن انسانی تمناؤں کے لئے جو اس کے دل میں موجیں
مار رہی ہیں یہ دنیا کافی ہو سکتی ہے؟ کیا انسانی حیات کا مقصد صرف
اتنا ہی ہے کہ وہ یہاں آئے اور چند روز بری بھلی کسی طرح کاٹ
کر چل دے؟ کیا علوم طبیعیات سچے اخلاق اور سچے ایثار کی ہدایت
دے سکتے ہیں؟ اگر صرف مادہ ہی اصل حقیقت ہے اور طبیعیات
و ریاضیات کے قانون اس کے فرمانروا ہیں تو انسان محض ایک چلتی
پھرتی کل ہے۔ اور اس کے بعد دنیا میں کوئی قوت ہے تو ایک وحشیانہ
قوت ہے جو سب پر غالب آجائے گی نہ خیر و شر یا برائی بھلائی صرف

یہ نہیں ہے کہ وہ ہمارے ذاتی یا تمدنی ذلیل وحقیر اغراض کے مطابق یا غیر مطابق ہے۔ بلکہ اس کا تطابق یا غیر تطابق اس قانون سے ضروری اور لازمی ہے جو ہم سے بالا اور الٰہی قانون ہے۔ انسان کے دل سے اس قانون کے خیال کو مٹا دو۔ اور خدا۔ حیات جاوید۔ انصاف وعصمت اور عذاب وثواب کے خیالات نکال دو تو انسان کیا رہ جاتا ہے۔ صرف ایک وحشی جانور بلکہ اس سے بھی بد تر۔ اس میں سے ترقی کا مادہ سب زائل ہو جائے گا۔ اور مادیت کے زہر سے سچے اور پاکیزہ اخلاق مرجھا جائیں گے۔ افسوس اُن بیچاروں پر جو ہوش سنبھالتے ہی محنت ومشقت میں جت جاتے جفائیں سہتے اور مصیبتیں برداشت کرتے ہیں کس لیے؟ اس لیے کہ چند غافل ناکسوں کی عیش وعشرت کا سامان بہم پہنچائیں۔ افسوس ان پر جن کی ساری عمر اس فکر و تردد میں کٹ گئی کہ کسی طرح دولت ملے جو اصل مسرت ہے دولت ملی۔ اس وقت جبکہ آفتیں سہتے سہتے اور بلائیں جھیلتے جھیلتے کمر جھک گئی۔ آنکھوں کی روشنی مدہم پڑ گئی۔ نہ پہلی سی سکت رہی نہ پہلا سا جوش قوٰی میں اضمحلال اور عناصر میں اختلال آ گیا۔ اب معلوم ہوا کہ صرف دولت مسرت کا باعث نہیں، یا اس وقت بے مانگے بلا محنت مشقت کے ملی جبکہ جوانی کا بھوت سر پر سوار تھا۔ اور بجائے مسرت کے زحمت اور آفت کا باعث ہوئی۔ کاش ضبط نفس ہوتا۔ تھوڑی سی قناعت اور اعتدال پر نظر ہوتی۔ دولت اور دولت سے جسمانی عیش انتہائے مسرت کا

ذریعہ خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن حصول دولت و عیش کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دھوکا تھا۔ خود اس میں اس قدر بلائیں اور آفتیں بھری ہیں کہ خوشی مفقود ہو جاتی ہے۔ اصل خوشی اعتدال قناعت اور ضبط نفس میں ہے۔ بشرطیکہ انسان کسی مقصد اعلیٰ کے حصول میں مشغول ہو۔ اور یہ اسی وقت حاصل ہوتا ہے۔ جبکہ باطن کی روشنی کی جھلک سے بیرونی حالات پر اثر پڑے۔ بیرونی حالات کے موافق کر لینے اور سامان مادی کے حصول سے جو لوگ دل کو مطمئن اور باسرت بنانا چاہتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ دل کی خواہشات کی نہ کوئی انتہا ہے اور نہ اس کی گہرائی کی کوئی تھاہ ہے۔ بلکہ کام دوسری طرف سے شروع کرنا چاہیئے۔ اپنے ارادے میں قوت نفس پر جبر اور ضبط حاصل کرنا اور خواہشات نفسانی کو اس کے تابع بنانا چاہیئے تاکہ قلب کا اثر مادی حالات و خواہشات پر پڑے اور وہ اس کے لطف و مسرت کا باعث ہوں۔ اسی وقت اعتدال و قناعت نصیب ہوگی اور کام میں سہولت و استقلال پیدا ہوگا۔ لیکن اس سے بھی اعلیٰ مسرت انسان کو اس وقت حاصل ہوتی ہے جب وہ بے نفسی اور بے غرضی سے کام لیتا ہے۔ حیات انسانی کی تہ میں رنج و الم ہے۔ انسان ہر طرف سے خطرے اور بے اطمینانی سے گھرا ہوا ہے اور زیادہ تر وہ جو کھیل اور تفریح اور دیگر اشغال میں اپنے آپ کو مصروف رکھتا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ جہاں تک ہو سکے وہ اپنے آپ کو بہلائے رکھے اور دل کی کاوشوں کی طرف اس کا خیال نہ جائے۔

انسانی فطرت کا ایک یہہ بھی اصول ہے کہ انسان خوشی کی تلاش اور حصول سے نہیں بلکہ اپنی مصروفیت سے آلام زندگی کا مقابلہ کرتا ہے۔ لیکن یہہ عام مصروفیت ادنےٰ درجہ کی ہے اعلےٰ درجہ اس کا اس وقت حاصل ہوتا ہے جبکہ وہ بے غرض اور بے نفس ہوتا ہے اور دوسروں کو مسرت اور خوشی پہنچانے کے لئے اپنے تئیں بھلا دیتا ہے۔ مذہب کی زبان میں اسے ثواب کا کام کہتے ہیں۔ وہ ایک تنگ دائرہ سے نکل کر انسانی ہمدردی اور اخلاق کے اعلےٰ طبقہ میں جا پہنچتا ہے اور دوسروں کو راحت پہنچانے کے خیال میں وہ اپنے آپ کو قربان کر دیتا ہے سچے مذہب کی تعلیم یہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ایک سچے مذہبی آدمی کی خوشی زیادہ پائدار اور مستقل اور بے غل وغش ہوتی ہے اور اسے اپنے کام پر زیادہ اطمینان ہوتا ہے وہ گزشتہ کا شکر اور حال پر قناعت کرتا اور آئندہ کی توقع رکھتا ہے بخلاف اُس بوالہوس دولت کے بندے کے جو گزشتہ پر پچھتاتا اور حال میں مذبذب اور بے اطمینان رہتا ہے اور آئندہ زمانہ اسے تاریک نظر آتا ہے۔

۱۲

ہم نے جو گزشتہ اوراق میں انسان کی مذہبی اور روحانی قوت پر بہت زیادہ زور دیا ہے تو اس کے یہ معنی نہ سمجھے جائیں کہ عقل یا سائنس و فلسفہ بیکار یا گمراہ کرنے والے ہیں بلکہ اس رخ پر زیادہ زور

اس لیئے دیا گیا ہے کہ آجکل سائنس کی چکا چوند سے لوگوں کی نگاہ اس قدر خیرہ ہوگئی ہے کہ وہ دوسرے رُخ پر نظر نہیں ڈالتے۔ ورنہ سائنس و فلسفہ کے کارآمد ہونے سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ اور مادی ترقی سے اس نے انسانی تمدن کو جو مدد دی ہے وہ ظاہر ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ محض سائنس کی ترقی انسانی ترقی نہیں ہو سکتی۔ اور نہ اُسے اُس رُتبہ پر پہنچا سکتی ہے جو اس کا اصل منشاء و منتہا ہے۔

پھر سائنس اور مذہب میں اختلاف و مخالفت کیوں ہے؟

غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ اس اختلاف و مخالفت کی کوئی وجہ نہیں یہ محض غلط فہمی پر مبنی ہے۔

مذہب کی بنیاد مافوق العادۃ پر ہے اور سائنس کی بنیاد عقل پر۔ اہل مذہب سائنس سے اس لیئے ڈرتے ہیں۔ کہ سائنس کے اصول اور اُس کے انکشافات مذہب کو کمزور اور زائل کر دیں گے۔ حالانکہ یہ خیال محض باطل ہے۔ سائنس صدہا سال سے برابر ترقی کرتا چلا آتا ہے۔ لیکن وہ مذہب کی بنیاد نہ ہلا سکا۔ مذہب کی قوت ابھی تک ویسی ہی قائم ہے اور قائم رہے گی اس لیئے کہ جس شئے پر مذہب کی بنیاد ہے وہ سائنس کی دسترس سے باہر ہے۔ خیال مافوق العادۃ عقل سے باہر ہے اس لیئے کہ اس کا تعلق دل سے ہے دماغ سے نہیں۔ اور یہ ایک ایسا وجدان قلب ہے جس میں غیر محدود کے محسوس کرنے کی قوت ہے حالانکہ عقل بذاتہا محدود ہے۔ غیر محدود یعنی خدا کا

دیکھنے اور پہچاننے والا دل ہے عقلی استدلال سے اس کی معرفت حاصل نہیں ہو سکتی، ادلہ و براہین اسی کے لیے مفید ثابت ہو سکتی ہیں جس میں پہلے سے یہ وجدان ہے اور خدا کو مانتا ہے۔ جو نہیں مانتا اس کے لیے تمام دلائل بیکار ہیں۔ لہٰذا اہل مذہب کو سائنس سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں اگر زمین گردش کرتی ہے تو اور آسمان پھرتا ہے تو مذہب کو اس سے کیا تعلق؟ اگر کوئی ستارہ دریافت ہو تو مذہب پر اس کا کیا اثر؟ اگر زمین کے اندر سے نئے نئے آثار شجرہ نکلیں اور ان سے انسان کی قدامت پر روشنی پڑے تو مذہب کو اس سے ڈرنے کی وجہ؟ اگر کشش ثقل نے سائنس میں انقلاب پیدا کیا اور بہت سے مسائل عالم کو حل کیا تو بہت مبارک۔ مذہب اس سے کیوں خائف ہو؟ اور نظریہ ارتقا انسان کی ترقی کے اصول کو بتاتا ہے تو بتائے مذہب کیوں اس سے گھبرائے۔

جب مذہب کی حالت ایسی مستحکم اور قومی ہے تو پھر اہل مذہب کیوں اہل سائنس سے لڑتے اور جھگڑتے اور ان پر ارتداد و کفر کے فتوے لگاتے ہیں؟ اس کی وجہ صرف ایک معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ چونکہ مذہب انسان کے ساتھ اس وقت سے ہے جب سے اس نے ہوش سنبھالا اور جبکہ سائنس کا نام و نشان بھی نہ تھا اس لیے مذہب کو علاوہ روحانیات و معاشریات کے وہ کام بھی کرنا پڑا جو سائنس سے مخصوص تھا۔ غرض ابتدا میں مذہب روحانی اخلاقی

معاشرتی، سیاسی اور سائنٹفک تمام انسانی شعبوں پر حکومت کرتا رہا اور مذہب کا ہادی معلم بھی تھا فلاسفر بھی تھا اور حاکم بھی تھا۔ لیکن مذہب و اخلاق کو چھوڑ کر باقی امور ضمنی تھے اور وہ مجبوراً مذہب میں داخل کر لیے گئے تھے۔ انسان نے جب ترقی کی اور اس کا تجربہ اور تمدن وسیع ہوا تو ہر ہر شعبہ الگ ہونا شروع ہوا اور ان میں نئی نئی باتیں اور نئے نئے انکشافات شروع ہوئے۔ اہل مذاہب نے جب یہ دیکھا تو یہ امر ناگوار گزرا اور وہ یہ سمجھے کہ ان کی یہ ترقی ہماری مخالفت میں ہے جو امور ابدان و حفظان صحت کے متعلق تھے وہ علم طب نے سنبھال لئے جو ملکی تھے وہ علم سیاست نے لے لئے اور جو نجوم و شموس و اقمار کے متعلق تھے وہ فلکیات کے تحت میں آ گئے۔ مگر اہل مذاہب ایک مدت تک انہیں باتوں پر جمے رہے جو ابتداء میں ضمناً ان علوم کے متعلق مذہب کی ذیل میں آ گئی تھیں اور علمی ترقی سے انکار کرتے رہے اور اس کی ترقی کو مذہب کی مخالفت اور استیصال کا باعث سمجھتے رہے لیکن درحقیقت ان امور کو نہ پہلے مذہب سے تعلق تھا اور نہ اب ہے اور نہ ان کی ترقیاں مذہب کے رستے میں حائل ہو سکتی ہیں۔ اور نہ اُسے کچھ نقصان پہنچا سکتی ہیں کیونکہ سائنس مذہب پر کسی طرح نہ حملہ کر سکتا اور نہ اُسے نقصان پہنچا سکتا ہے اس لئے جس پر مذہب کی بنیاد ہے وہ سائنس کی دسترس اور رسائی سے باہر ہے۔

اب یہی سائنس کی مخالفت مذہب سے سو یہ بالکل بیجا اور

محض ہٹ دھرمی اور جہالت پر مبنی ہے۔ کیونکہ سائنس مذہب
کے سمجھنے سے قاصر ہے۔ سائنس استدلال عقلی پر مبنی ہے اور سب
چیزوں کو اسی سے پرکھتا ہے۔ جو چیزیں اس کے اصول پر پوری
نہیں اترتیں ان کے ماننے سے انکار کر دیتا ہے۔ لیکن وہ یہ
بھول جاتا ہے کہ صرف عقل ہی ایک خصوصیت انسان کی نہیں
بلکہ اس میں دوسری قوتیں بھی ہیں اور احقاق حق میں صرف عقل ہی
پر دار و مدار نہیں ہوتا بلکہ اور قوتیں بھی کام میں آتی ہیں۔ انسان
کی اخلاقی روحانی قوتیں کچھ کم اہم نہیں ہیں۔ مثلاً حسن کی دریافت
کے لئے ذوق ایسا ہی ضروری ہے جیسے عقل۔ احقاق حق میں عقل
وہیں تک کام دیتی ہے جہاں تک سلسلہ علت و معلول کا تعلق ہے
لیکن جہاں اس کے سوائے کچھ اور بھی ہے تو وہاں روحانی عمل
شروع ہو جاتا ہے۔ جب معمولی باتوں کی تحقیق میں عقل حالات
و عادات و اغراض سے بھٹک جاتی ہے تو ان معاملات میں اس
کی کیا پیش جا سکتی ہے جن کا زیادہ تر تعلق تمیز وجدانی پر ہے
چونکہ مذہب کی بنیاد فوق العادة پر ہے جو عقل سے بالا ہے اس
لئے سائنس وہاں نہیں پہنچ سکتا اور اپنی نادانی اور نافہمی سے اس
پر حملہ کرتا اور اس کے ماننے سے انکار کرتا ہے۔ ایک بات اسے اور
ہاتھ لگ گئی ہے۔ جب اس کی سمجھ میں یہ باتیں نہیں آتیں تو وہ صاف
کہہ اٹھتا ہے کہ یہ خلاف قانون فطرت ہیں۔ گویا تمام قوانین فطرت

اسس کے دیکھے بھالے ہیں۔ اور وہ ان سب پر حاوی ہو چکا ہے۔ اول تو اس کرہ کی جس پر ہم آباد ہیں بساط ہی کیا ہے دوسرے جو چند قانون فطرت ہمیں معلوم ہیں بالکل محدود ہیں اور وہ صرف مادی حالات سے متعلق ہیں۔ عقل خود محدود ہے اور سائنس جس کی بنا اس پر ہے اور بھی محدود ہے۔ اُسے غیر محدود کا علم یا معرفت کیسی ہو سکتی ہے۔ وہ مادی حالت سے آگے نہیں بڑھ سکتا ہے اگرچہ اسس کے متعلق بھی اس کا علم بہت محدود ہے۔ پھر اسس محدود علم اور یکطرفہ علم پر اس کے یہ دعوے ہیچ ہیں اور بغیر اس کوچہ میں قدم رکھے جو مادہ سے بالا ہے اور بغیر اس تحقیق و معرفت کے جو اس دائرہ میں داخل ہوئے بغیر نہیں ہو سکتی اس کا انکار نا قابل سماعت ہے۔ ایسی صورت میں سائنس کا مذہب کا منکر یا مخالف ہونا سراسر نادانی و نافہمی ہے اہل سائنس کو زیادہ عالی ظرفی زیادہ وسیع النظری زیادہ حوصلہ و تحمل اور زیادہ تحقیق و تجسس سے کام لینا چاہیئے۔ اپنی آنکھوں پہ پٹی باندھ کر یہ کہدینا کہ آفتاب کا وجود ہی نہیں اور جب دوسرے اس کے ہونے کی شہادت دیں تو انھیں جھٹلانا سائنس اور فلسفہ کے اصول کے خلاف ہے۔ مگر باوجود کثرت واقعات و دلائل وہ اپنے انکار پر مُصر ہیں اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تعصب اور ان کی ہٹ دھرمی مذہبی تعصب اور ضد سے کہیں بڑھی ہوئی ہے۔ جس طرح علمائے طبیعات و مریدان ارتقا کو اس بات کی

ضرورت ہے کہ وہ چادر دیکھ کر پاؤں پھیلائیں اور اپنی حدود سے آگے نہ بڑھیں۔ اسی طرح اہل مذاہب کو بھی چاہیئے کہ وہ احتیاط سے کام لیں اور اپنی حد سے تجاوز نہ کریں۔ ایک حد ہے جہاں مذہب کو رک جانا چاہیئے۔ اور ایک حد ہے جہاں سائنس کو ٹھہر جانا چاہیئے اور یہاں پہنچ کر سائنس اور مذہب نہ صرف اپنے پرانے قصے قضیئے اور عداوتوں کو بھلا دیں۔ بلکہ دو روٹھے ہوئے بھائیوں کی طرح مل جائیں۔ عالم طبیعات کو ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے قبل اس کے کہ وہ کائنات کا مسئلہ کو حل کرے۔ اور اسی طرح اہل مذاہب کو بھی۔ ان کا منشا ایک ہے یعنی انسان کی ترقی اور بہبودی لیکن ایک کا مقصد مادی اور ظاہری ترقی ہے اور دوسرے کا مقصود باطنی اور روحانی ترقی۔ ایک استدلال عقلی اور استقرا کے رستہ اپنی منزل مقصود کو پہنچتا ہے اور دوسرا جذبات اور تخیل کی راہ سے لیکن کسی کو حق نہیں کہ وہ دوسرے کو خارج کر دے۔ کائنات کی انتہائی صداقت کا معلوم کرنا کوئی بری بات نہیں اور جو کوئی اس میں کوشش کرتا اور مدد دیتا ہے بہت اچھا کرتا ہے۔ اگر خدا کا خیال ہمارے دل و دماغ میں جاگزیں ہے تو پھر اسے نکال نہیں سکتی۔ روح اسے ضرور نہیں پائے گی۔ اور جو شخص اس کوشش میں ہے کہ اس خیال کو نکال دے اور خدا کو کائنات سے خارج کر دے وہ بڑا ظلم کرتا ہے۔

جھگڑے تنازع اور جد و جہد سے ڈرنا نہیں چاہیئے۔ صداقت اختلاف کے بعد بھی قائم رہتی ہے۔ اہل مذاہب کا ضعف اس میں ہے کہ وہ سائنس سے ڈرتے ہیں۔ حالانکہ وہ ڈرنے کی چیز نہیں بلکہ اس سے مدد لینا اور اُسے معاون بنا کے رکھنا چاہیئے اگر اس کے نہیں دشمن ہیں تو ان سے مقابلہ کرنا چاہیئے۔ بھاگنے سے شکست بہتر ہے کیونکہ ممکن ہے کہ شکست سے فتح ہو جائے۔ مگر بھاگنے سے گمنامی کا احتمال ہے۔ گمنامی سے موت کا ڈر ہے۔ اور یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر مذہب میں ہم زیادہ ترقی اور روشن خیالی کو دخل دیں گے اور اسے توہمات باطلہ اور تمام غیر ضروری کثافتوں سے پاک کر دیں گے تو اس کی فتح ہی فتح ہے۔ اسی طرح سائنس کا ضعف اس میں ہے کہ اپنے محدود علم پر تکیہ کر کے بے سوچے سمجھے اور بغیر تحقیق کے اصول مذہب پر حملہ کرتا اور اس کے خیالات سے انکار کرتا ہے۔ حالانکہ اگر وہ انسان کے اس پہلو پر بھی نظر ڈالے جس سے مذہب بحث کرتا ہے تو اس کی نظر اور وسیع ہوگی اور وہ زیادہ مفید ثابت ہوگا۔ لیکن اگر وہ اپنی آنکھیں بند کرے گا اور اپنے دل و دماغ میں روشنی نہیں پہنچنے دے گا تو بلاشبہ اس کی قسمت میں ہار ہے۔ یہ وقت ہے اس کی ہمت آزمائی کا۔ تحقیق و تجسس اس کے اصل اصول ہیں۔ اُسے چاہیئے کہ وہ انہیں اپنے محدود دائرے سے اور آگے بڑھائے اور قدرت حق کا تماشہ دیکھے۔ اُسے اب صداقت کے ماننے کے لئے

تیار ہونا چاہئے۔ اور زیادہ اعلیٰ ظرفی اور روشن خیالی سے کام لینا چاہئے اور ضد اور نفسانیت سے دست بردار ہونا چاہئے۔

بقول پروفیسر ٹیٹ و بالفور اسٹیوارٹ جو اس زمانے میں سائنس کے بہت بڑے عالم ہیں۔ اس کائنات میں ایک قانون توال یا عدم انقطاع موجود ہے۔ اگر اس سے قطع نظر کرلی جائے تو تمام عالم درہم برہم ہوجائے گا۔ اور یہ ہستی محض بیکار اور مہمل ہوجائے گی۔ یہ مادی عالم صرف مادہ ہی سے نہیں بنا۔ بلکہ اس میں ایک اور شے بھی ہے جس پر اس کا دارومدار ہے۔ اور وہ قوت ہے۔ لیکن ہمارے لئے یہہ قوت اسی وقت کارآمد ہے جبکہ یہ تبدیل ہیئت کرتی ہے۔ لیکن تجربہ سے یہ ثابت ہے کہ قوت کی تبدیلی اُسے کمزور کر دیتی ہے۔ یہ بیشک ممکن ہے کہ قوت کو ہم حرارت میں تبدیل کرلیں اور اس سے کام لیں۔ لیکن ہر ایسی تبدیلی قوت حرارت کو کمزور کردیگی اور رفتہ رفتہ اسکا خاتمہ ہوجائیگا۔ سورج ہمارے نظام کا منبع حرارت علیٰ ہی اور وہ قوت جس پر ہماری حیات کا دارومدار ہے وہ اس حرارت سے اخذ کیجاتی ہے جو سورج سے نکلتی ہے۔ جبکہ سورج ہمارے لئے قوت مہیا کرتا رہتا ہے تو خود وہ سرد ہوتا جاتا ہے۔ اور آخرکار اس طرح خلائے بسیط میں حرارت نکالتے نکالتے اس میں سے وہ حیات قائم رکھنے والی قوت زائل ہوجائے گی۔ جو اس وقت اس میں موجود ہے۔ علاوہ سورج کے سرد ہونے کے ہمیں یہ بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ اینتھری رگڑ کی وجہ سے ہماری زمین اور ہمارے نظام کے دوسرے کرّے بالتصاف سورج کے

قریب ہوتے چلے جائیں گے پھر ایسی حالت میں تصادم سے حرارت پیدا ہوگی۔ اور عارضی طور پر سورج کی بجھی ہوئی قوت پھر بحال ہو جائے گی۔ اور آخر ایک روز یہ سلسلہ بھی ختم ہو جائے گا۔ اور وہ بجھ بجھا کے رہ جائے گا۔ یہاں تک کہ ازمنۂ بیشمار کے بعد اس کے پھر کسی پڑوسی کرے سے مٹ بھیڑ ہو۔ اور اس کی جان میں جان آئے اس سے ظاہر ہے کہ حرارت کا یہ ازالہ ایک روز ہمارے نظام کا خاتمہ کر دے گا۔ تو پھر کیا اس سے وہ قانون عالم جسے قانون توال یا عدم انقطاع سے تعبیر کیا گیا ہے نہیں ٹوٹ جائے گا؟ ایسی حالت میں وہ تسلسل جو برابر جاری رہنا چاہیے کہاں رہا؟ لیکن اگر صرف یہ عالم ظاہری سب کچھ ہوتا تو بیشک یہی صورت واقع ہوتی۔ لیکن اب سائنس نے اپنے کھردرے ہاتھوں سے ٹٹول ٹٹول کے اور اپنی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے ایک ایسے عالم کو بھی محسوس کیا ہے جو نظروں سے اوجھل ہے اور اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ اُن قوانین کی تکمیل کے لئے جو اس نے دریافت کئے ہیں ایک غیر مرئی روحانی دنیا کا ہونا ضروری ہے۔ اسی قانون توال سے یہ حقیقت بھی معلوم ہوتی ہے کہ یہ غیر مرئی عالم سے قبل ہوگا کیونکہ مرئی عالم کی کوئی ابتدا ہونی چاہیے۔ اب یہاں مذہب اور الہام اور سائنس کی سرگوشیاں شروع ہوتی ہیں۔ مذہب کہتا ہے کہ عالم ایک وقت میں خلق کیا گیا تھا۔ سائنس کہتا ہے کہ جس طرح یہ عالم اس وقت ہے ہمیشہ سے یہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ مذہب کہتا ہے کہ دنیا اور

اس کی کائنات سب مل کے خاک ہو جائے گی۔ سائنس اُن قوانین کی روسے جنکی حکومت اس دنیا پر ہے یہ استدلال کرتا ہے کہ موجودہ نظام کا انجام یہی ہونے والا ہے۔ مذہب کہتا ہے کہ ایک روحانی دنیا بھی ہے جس کا اس دنیا سے گہرا تعلق ہے اور ہماری حالت پر اس کا اثر پڑتا ہے۔ سائنس بھی اب دبی زبان سے کہنے لگا ہے کہ اگر ایسا نہ ہو تو یہ انسانی قانون ملیا میٹ ہو جائیں گے۔ اور اپنے ہاتھوں آپ اپنی قبر بنائیں گے کیونکہ قانون توال یا عدم انقطاع کا مقتضی یہہ ہے کہ اگر یہ موجودہ کائنات برباد و تباہ ہو گی تو اس غرض سے کہ وہ دوسری جگہ ایک جدا سلسلۂ قوانین کے تحت میں اپنی ہستی حاصل کرے اور نئے قانون نشو و نما میں پھولے پھلے اور یہی اصول افراد پر بھی صادق آتا ہے اور اس سے بلا کسی مذہبی خیال کے روح کے غیر فانی ہونے کا ثبوت ملتا ہے کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ اگر یہ اصول صحیح ہے تو موت انسانی ترقی کی حائل اور مانع نہیں ہو سکتی اور یہی آخرت یا عقبیٰ ہے۔

یہاں سائنس وہ مذہب کا وہ عناد و مخالفت جس کا اس قدر شور و غلغلہ مچا ہوا ہے اور جس پر ڈاکٹر ڈریپر نے فصاحت کے دریا بہا دیئے ہیں۔ کافور ہو جاتی ہے۔ سائنس اب تک ایک گنبد بے در میں چکر لگا رہا تھا۔ اب اُدھر کی تھوڑی سی جھلک پہنچنی شروع ہوئی ہے۔ وہ آنکھیں مل مل کے دیکھ رہا ہے کہ یہ نئی شئے کیا ہے۔ وہ زمانہ قریب ہے کہ اس کی بصارت روشن اور اس کی بصیرت منور

ہو جائے اور مذہب سے آکر بیعت کرے۔

غور سے اگر دیکھا جائے تو سائنس اور مذہب کی مخالفت محض غلطی اور غلط فہمی پر ہے اور طرفین نے اس میں اس قدر مبالغہ کیا ہے کہ بجائے سلجھانے کے اور الجھن پیدا کر دی ہے۔ سائنس کے جدید اور عجیب انکشافات اور انوکھے قیاسات اور نظریات سے جن پر اہل سائنس کو بڑا فخر ہے۔ اہل مذاہب گھبرا گئے کہ سائنس ہمارا جانی دشمن ہے۔ کیونکہ وجہ یہ ہے کہ سائنس کے ہر جدید انکشاف کا یہ تاگزیر نتیجہ ہوا کہ دونوں آپس میں ٹکرا گئے۔ اور ان جدید انکشافات سے اس حالت میں تنزلزل پیدا ہو گیا جس پر پہلے سے ایمان لائے بیٹھے تھے۔ ممکن ہے کہ اس حالت کو مذہب سے تعلق نہ ہو۔ لیکن چونکہ اُسے قطعی اور یقینی سمجھ چکے تھے۔ لہذا مذہب اور الہام کو بھی اسی پر ڈھال لیا تھا اور جب اسے ٹھیس لگی تو شور و غل مچانا شروع کیا۔ اور مخالفت کی ایک نئی بنیاد قائم ہو گئی اور یہہ سمجھ لیا کہ یہ مذہب کی عین مخالفت ہے۔ حالانکہ اسے مذہب سے کچھ بھی تعلق نہ تھا۔ اہل مذہب کی بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ اپنے اجتہاد اور الہام ربانی کو ہمیشہ گڈمڈ کر دیتے ہیں۔ اور جہاں ان کی رائے پر بھی حملہ ہوا تو اُسے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ مذہب پر حملہ ہے۔

لیکن صرف اہل مذاہب ہی غلطی پر نہیں ہیں بلکہ اہل سائنس بھی اسی غلطی میں پھنسے ہوئے ہیں اہل سائنس اہل مذاہب کے اجتہادات

اور رایوں کو الہام ربانی سمجھتے ہیں۔ اور اس لئے ان رایوں کی غلطی ثابت کر دینے سے وہ سمجھتے ہیں کہ الہام ربانی کو غلط ثابت کر دیا۔ زیادہ تر خطرہ "نیم حکیم" اہل سائنس سے ہے جنہوں نے کبھی آنکھ اٹھاکر دوسری طرف نہیں دیکھا۔ اور جو سائنس کے قیاسات کو بھی یقینیات سمجھتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ مذہب سائنس کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا۔ اور ان میں ہمیشہ مخالفت رہے گی۔ اگرچہ بعض اہل سائنس جنہیں خدا نے اعلےٰ دماغ عطا کیا ہے یہ سمجھتے جاتے ہیں کہ مذہب و سائنس میں کوئی مخالفت نہیں اور وہ اس مادی عالم کے پرے ایک اور عالم کے بھی قائل ہوتے جاتے ہیں۔ جس کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے۔

ڈاکٹر ڈریپر کی یہ کتاب "کان فلکٹ بٹوین سائنس اینڈ ریلجن" (معرکہ مذہب و سائنس) درحقیقت سائنس کی پرزور حمایت ہے۔ لیکن فاضل ڈاکٹر نے ایک بڑی غلطی کھائی ہے۔ وہ یہ کہ جسے وہ مذہب کہتے ہیں وہ درحقیقت مذہب نہیں بلکہ رومن ازم ہے اور جتنے حملے انھوں نے مذہب پہ کئے ہیں وہ بلاشبہ رومن ازم پر ہیں۔ مذہب پر نہیں ہیں۔ بلکہ میں یہاں تک کہتا ہوں کہ عام مذہب تو کیا خود مسیح کے مذہب پر بھی ان حملوں کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ جب یہ بنیاد ہی غلط ہے تو وہ شاندار عمارت جو انہوں نے اس بنیاد پر قائم کی متزلزل ہو کر دھڑام سے گر پڑتی ہے۔

۱۴۵

سائنس و مذہب کا یہ اختلاف اور ان کی باہمی بدظنی و بدگمانی ابھی مدت تک رہے گی۔ اور اسے رہنا چاہیئے۔ لیکن ساتھ ہی اسے رفع کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ کیونکہ اس کی بنیاد غلط فہمی اور ہٹ دھرمی پر ہے اہل مذاہب کو سائنس کی صداقت پر اور اہل سائنس کو مذہب کی صداقت پر ایمان لانا چاہیئے۔ اور ایک روز آنے والا ہے کہ یہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے اپنی ناوافی پر پچھتائیں گے اور اپنی حرکات سے شرما کر مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھائیں گے۔ پھر سائنس کو مذہب سے اور مذہب کو سائنس سے کچھ عناد نہ ہوگا۔ اور یہ توام بھائی ایک جان دو قالب ہو جائیں گے۔

۱۳

لیکن ایک مشکل اور ہے۔ سائنس کے اصول میں تو کیا فروع میں بھی بہت کم اختلاف ہے سوائے اُن امور کے جو قیاسی ہیں۔ کیونکہ وہ مشاہدے تجربے اور استقرا پر مبنی ہیں۔ حالانکہ مذاہب کا یہ حال ہے کہ ہر ایک نے ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنا رکھی ہے۔ ان بعید اور بیشمار اختلافات میں یہ مشکل آپڑی کہ سچا کسے سمجھا جائے۔ اور صداقت کا پتہ کہاں سے ملے۔

پروفیسر میکس مولر نے ایک جگہ دنیا کی زبانوں کے متعلق بڑی اچھی بات کہی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ زبان ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ لیکن

تاہم انسان کی تاریخ میں کوئی زبان اب تک نئی نہیں بنی۔ قدیم سے جو الفاظ چلے آتے ہیں وہی اب تک چلے آتے ہیں۔ انہیں میں کچھ ہیر پھیر اور رد و بدل کر لیا جاتا ہے۔ بعینہ یہی حال مذاہب کا ہے ہمیشہ نئے نئے بنتے رہتے ہیں۔ نئی نئی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن غور سے دیکھو تو اصل وہی ہے جو ہمیشہ سے چلی آرہی ہے البتہ کچھ رد و بدل کر لیا گیا ہے۔ اختلافات صرف اُن ممالک اور ان اقوام کی وجہ سے ہیں۔ جن میں مذاہب رائج ہوئے یا اُس زمانہ کی وجہ سے جبکہ مذاہب کی اشاعت ہوئی۔ اگر ابتدا سے لیکر تمام مذاہب کو سلسلہ وار جما یا جائے تو یہ اختلاف کا مسئلہ صاف طور سے سمجھ میں آجائے گا۔ ملک اور قوم اور زمانہ کی وجہ سے جو خصوصیات پیدا ہوگئی ہیں وہ اگر نکال دی جائیں تو پھر مشکل سے کوئی اختلاف باقی رہتا ہے۔ اگر اختلافات ہیں بھی تو وہ انسانی خیال کی ترقی کے مراحل کو ظاہر کرتے ہیں۔ اور اس لئے وہ رد کرنے یا خارج کرنے کے قابل نہیں بلکہ ایک منتظم سلسلہ میں آنے کے قابل ہیں۔

اس وقت کسی جدید مذہب کے قائم کرنے یا جدید صداقتوں کے پیدا کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اصل حق ظاہر کرنے کے لیے صداقت کے مختلف پہلوؤں کی ترتیب کی ضرورت ہے۔ ہماری رائے میں اس کام کو اسلام نے خاطر خواہ انجام دیا ہے۔

مذہب کے لئے سب سے بڑی آفت مبالغہ ہے۔ ایک مذہب نے کبھی

ایک خوبی کو لیا اور اسے آسمان پر چڑھا دیا اور دوسری خوبیوں کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ دوسرے نے کسی دوسری خوبی پر اس قدر زور دیا کہ باقی خوبیوں کی کچھ حقیقت نہ رہی۔ یہودی مذہب نے ظاہری ارکان کی پابندی میں اس قدر مبالغہ کیا کہ باطنی صفائی پس پشت جا پڑی۔ اس کے خلاف عیسائی مذہب نے باطنی صفائی پر اس قدر زور دیا کہ اگر اس پر عمل کیا جائے تو دنیا اور دنیاوی تعلقات سب ہیچ رہ جاتے ہیں۔ غرض مختلف مذاہب نے صداقت کے مختلف پہلوؤں کو خاص نظر سے دیکھا اور باقی پہلو یونہیں رہ گئے۔ اس مبالغہ سے مذاہب میں انحطاط اور تنزل پیدا ہوا۔ حالانکہ وہ بات جو باعث انحطاط ہوئی بڑی خوبی کی تھی۔ لیکن اس میں مبالغہ اس قدر کیا کہ وہ خود تو عیب ہو گئی۔ اور دوسری خوبیاں اس مبالغہ کی وجہ سے کمزور ہو گئیں۔ جس طرح کسی خاص عضو کی ورزش کرنے سے دوسرے اعضاء کمزور ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اخلاقی اور روحانی قوتوں کا بھی حال ہے کہ ایک پر زور دینے سے دوسری کمزور ہو جاتی ہیں۔ مذہب کی کامل صداقت اور اصل کامیابی کا راز یہ ہے کہ وہ سب میں اعتدال قائم رکھے۔

انسان کی دو حالتیں ہیں ایک حیوانی دوسری روحانی۔ اور ان دونوں میں آپس میں اختلاف اور عناد ہے۔

پھر روحانی حالت کی دو صورتیں ہیں۔ ایک عقل دوسری جذبات اور یہ ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔

اخلاق و تمدن کا تنہا ان میں سے کسی ایک کے ساتھ تعلق نہیں بلکہ یہاں دونوں (یعنی عقل و جذبات) گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔ اور ہم کی یہی دو صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ایک انسان کی ذاتی ضرورتیں دوسرے سوسائٹی کی ضرورتیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کی مخالف ہیں۔ اور باہم ایک دوسرے سے جد وجہد رکھتی ہیں کیونکہ انسان شخصی حیثیت سے حقوق رکھتا ہے۔ اور بحیثیت رکن سوسائٹی اس پر فرائض عائد ہیں۔ بہ حیثیت انسان تا طلق کے وہ کامل آزادی چاہتا ہے۔ سوسائٹی اس آزادی کی مانع ہے۔ شخصی ترقی کے لئے کامل آزادی کی ضرورت ہے لیکن تمدنی ترقی کے لئے حکومت کی ضرورت ہے جو اس قسم کی آزادی کو روکتی ہے اس لئے آزادی اور حکومت میں ہمیشہ جنگ و جدال رہتی ہے۔

غرض انسان اپنے خیالات و تعلقات میں اختلافات سے گھرا ہوا ہے اور یہ اختلافات رفتہ رفتہ عناد و عداوت تک پہنچ جاتے ہیں جو مذہب و تمدن کی تخریب کا باعث ہوتے ہیں اور اس لئے انسان اور انسانی تمدن کی بہبودی کے لئے ضرور ہے کہ اس کی اصلاح کی جائے مختلف زمانوں میں مختلف نبی آئے اور اپنے اپنے عہد میں انہوں نے اصلاح کی کوشش کی۔ لیکن نقص یہ رہا کہ وہ اصلاح صرف اسی زمانہ کے متعلق تھی۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ مبالغہ مذہب کے لئے سب سے بڑی آفت ہے۔ ایک زمانہ میں کسی ایک صداقت یا نیکی میں مبالغہ تھا

نبی نے اسے توڑنا چاہا۔ اور اس کے مقابل میں کسی دوسری صداقت یا نیکی میں مبالغہ کیا۔ نتیجہ یہہ ہوا کہ کامل اصلاح نہ ہو سکی لیکن یہ ضرور ہوا کہ صداقت کے تمام پہلوؤں کا کامل طور سے اظہار ہو۔ لہذا اس کی کامل اصلاح کے لئے ایک انسان کامل کی ضرورت تھی جو ملک عرب میں مبعوث ہوا۔ اس نے انسان کی مختلف حیثیتوں اور صداقت کے مختلف پہلوؤں پر ایسی غائر نظر ڈالی کہ جو اختلافات اب تک چلے آرہے تھے سٹ گئے۔ اور ایک ایسے مذہب کا سلسلہ قائم ہو گیا جو انسان کی دنیوی اور دینی نجات کا باعث ہوا۔ پیغمبر خدا صلعم ان اختلافات کی لم اور اصلاح کے اصلی راز کو خوب سمجھتے تھے۔ اور اس لئے انہوں نے مبالغہ سے احتراز کیا اور اعتدال کو مدنظر رکھا اور ان اختلافات میں ہیئت کے لئے مصالحت پیدا کر دی یہہ وہ رستہ تھا جس کی نسبت کہا گیا ہے کہ بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے۔ پیغمبر خدا نے اس معمے کو حل کیا۔ اور انسان کی کامل بہبودی اور اصلاح کی بنیاد ڈالی جس کا احسان اس عالم پر ہمیشہ ہمیشہ رہے گا۔

جس طرح مبالغہ انحطاط و زوال کی علامت اور تمام خرابیوں کی جڑ ہے اسی طرح اعتدال تمام نیکیوں کی اصل ہے۔ انسان کی حالت ایسی کش مکش میں ہے کہ وہ مبالغہ سے بچ نہیں سکتا۔ اگر ایک طرف جاتا ہے تو دوسری طرف سے محروم رہ جاتا ہے۔ اس لئے ایسی تعلیم کی ضرورت تھی جو اعتدال پر رکھے اور اس کی کسی وقت میں زوال نہ آنے پائے اعتدال

ہو رگئے اور اس کی کسی قوت میں زوال نہ آنے پائے اعتدال نہ صرف انسانی معاملات اور دنیا کے امور کی اصلاح کیلئے ضروری ہے بلکہ تمام اخلاق و نیکی اور کل کائنات کا دار و مدار اسی پر ہے زمین یہ ستارے یہ نظامات جو گردش میں ہیں اگر بال برابر اپنے اعتدال سے تجاوز کریں تو ایک عالم میں قیامت برپا ہوجائے اور یہ سارا کارخانہ خاک میں مل جائے۔ یہی حال کائنات کی ہر شئے میں ہے۔ نیکی و بدی کیا ہے؟ اخلاق کیا ہے؟ صحت کسے کہتے ہیں؟ ذوق کس چیز کا نام ہے؟ اگر ان سب باتوں پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان سب کا مدار اعتدال پر ہے۔ جہاں یہ نہیں ہے وہاں قیام اور استحکام کی صورت نہیں۔ اسی عالمگیر اور پر معنی اصول پر پیغمبر اسلام کی تعلیم مبنی ہے اور اسی اصول پر نظر نہ رکھنے سے قدیم مذاہب میں انحطاط و زوال پیدا ہوا اسلام نے اس کمی کو پورا کیا۔ اور اپنی تعلیم سے ہمیشہ کے لئے ایسی بنیاد قائم کردی جس میں انحطاط و زوال نہیں آسکتا۔

اگرچہ رہبانیت[1] کو اسلام نے خارج کیا ہے اور حسن معاشرت کے متعلق احکام دیئے ہیں۔ لیکن تاہم یہ بھی ہدایت کی ہے کہ بالکل دنیا ہی میں منہمک نہ ہوجاؤ۔ کیونکہ دنیا کی زندگی دھوکے کی ٹٹی ہے[2]۔ نماز روزے

۱؎ لا رہبانیۃ فی الاسلام۔

۲؎۔ وما الحیوٰۃ الدنیا الا متاع الغرور۔

رح کی تاکید کی ہے۔ ظاہری ارکان پر بھی ایک حد تک نظر رکھی ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی حکم ہوا ہے کہ نیکی کے یہ معنی نہیں کہ نماز کے لئے پورب پچھم کو منہ پھیر دیا بلکہ اللہ کی محبت میں عزیز و اقارب یتیموں محتاجوں مسافروں کو اپنا مال دینا۔ غلاموں کو آزاد کرنا۔ زکوٰۃ دینا۔ نماز پڑھنا اپنے عہد کو پورا کرنا۔ سختی اور تکلیف میں ثابت قدم رہنا۔ اس سے بڑھ کر نیکی کی کیا تعریف ہو سکتی ہے اس کا مدار محض ظاہری ارکان پر ہی نہیں ہے بلکہ خدا کی سچی محبت اور انسانوں کے ساتھ سچی ہمدردی اور ایثار پر ہے۔ اسلام کی بڑی خوبی یہی ہے کہ وہ دنیا اور آخرت مادی اور روحانی عالم دونوں کی رعایت رکھتا ہے اور جب انسان ظاہری ارکان اور اصول کا پابند ہو گیا تو پھر نیکی کے معنی اس کے لئے وسیع ہو جاتے ہیں۔ اور وہ آگے قدم رکھتا ہے اور اس کا روحانی جسم

لہ۔ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ج وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ٥

قوی ہونے لگتا ہے۔ خود آنحضرت صلعم کی زندگی اس کی بھی مثال ہے۔ خبابؓ صحابی آنحضرت صلعم کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سر کے نیچے کملی رکھے ہوئے کعبہ کے سایہ میں لیٹے ہوئے تھے آپ نے مشرکوں سے بہت ایذا اور تکلیف پائی تھی۔ میں نے آپ سے عرض کیا کہ آپ کفار پر بددعا کیوں نہیں کرتے۔ یہ سن کر آپ اٹھ بیٹھے اور آپ کا چہرہ سرخ ہو گیا اور فرمانے لگے کہ اگلے لوگوں میں ایسے ایسے بزرگ گزرے ہیں کہ بے دین لوگ ان میں سے کسی کو زمین میں گڑھا کھود کر کھڑا کر دیتے تھے اور اس کے سر پر آرہ چلا کر اسے دو ٹکڑے کر ڈالتے تھے لیکن اس قدر تکلیف بھی اس بندے کو دین سے نہ پھیرتی تھی اور کسی پر لوہے کی کنگھی اس سختی سے کھینچتے تھے کہ وہ اس کے گوشت کو طے کر کے پٹھے اور ہڈی تک پہنچتی تھی مگر یہ سختی اسے دین سے نہ پھیرتی تھی"۔ سچ پر ثابت قدم رہنے کی اس سے بڑھ کر اور کیا تعلیم ہو سکتی ہے۔

اسی طرح اسلام نے تمام تعلیم میں اعتدال کو مدنظر رکھا ہے خواہ عبادات میں ہو یا اخلاق میں۔ مثلاً یہ فرمایا ہے[1] کہ برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے۔ بدلہ لو تو اسی بدلے میں اسقدر تکلیف دو جتنی تمہیں پہنچی تھی۔ لیکن اگر صبر کرو درگزر کرو معاف کرو اور بخشدو تو اللہ تمہیں دوسرا اجر دیگا اور اللہ ایسے لوگوں کو دوست رکھتا ہے[2]

---

[1] وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ (رعد ۳)

[2] وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ (شوریٰ ۴۰)

اور اسکو بار بار مختلف مقامات میں تاکید سے بیان کیا ہے اور بدلے کے مقابلہ میں عفو کا درجہ بہت بڑا بتایا ہے۔ آخر یہاں تک کہدیا ہے کہ تم گنہگاروں خطاکاروں اور دشمنوں اور مخالفوں سے شیوہ عفو و غفران اختیار کروگے تو خدا بھی تمہاری خطاؤں سے درگزر کریگا۔ یعنی بدلہ لینا اگرچہ انسان کی عادت میں داخل ہے اور مقتضائے عدالت ہے لیکن اخلاق کریمانہ کا یہی مقتضا ہے کہ برائی کے عوض بھلائی کرو اور مخالفوں کی خطاؤں اور برائیوں کو معاف کرو اور عموماً درگزر کرو۔ پھر یہ بھی فرمایا ہے کہ بری بات کا جواب ایسا کہو جو بہت بہتر ہو۔[2] ایک دوسری جگہ ارشاد ہے کہ نیکی اور بدی برابر نہیں ہوسکتی۔ برائی کا دفعیہ ایسے برتاؤ سے کرو کہ وہ بہت ہی اچھا ہو۔ اگر ایسا کروگے تو تم دیکھو گے کہ تم میں اور کسی شخص میں عداوت تھی تو اب یکدم سے گویا وہ تمہارا دل سوز دوست ہے اور حسن مدارات کی توفیق انہیں لوگوں کو دیجاتی ہے جو صبر کرتے ہیں اور یہ انہیں کو دیجاتی ہے جنکے بڑے نصیب ہیں[3] پھر یہ بھی سمجھایا ہے کہ کسی قسم کی عداوت تم کو عدل کرنیسے باز نہ رکھے اور کسی جماعت کی دشمنی تم کو انصاف کرنیسے نہ روکے۔ تم اپنے دشمن اور دوست سب کے ساتھ عدل و احسان و انصاف کا برتاؤ کرو چنانچہ فرمایا ہے اے ایمان والو کھڑے ہوجایا کرو اللہ کے لئے گواہی دینے کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ بِهِ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِلصَّابِرِينَ (نحل) فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ (مائدہ)

لہ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ (نور – ۲۲)

لہ ۔ اِدْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ (مومنون ۹۶)

سہ وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ اِدْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ۔ وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ (حم سجدہ)

انصاف کی۔ اور کسی قوم کی دشمنی کے باعث عدل نہ چھوڑو۔ تقویٰ کی بات یہی ہے کہ تم عدل کرو۔ اس سے بڑھ کر حسن معاشرت اور نیکی کی اور کیا تعلیم ہو سکتی ہے۔

اسی طور پر روپے پیسے کے کمانے اور اسکے صرف میں اعتدال کی ہدایت ہے کھاؤ پیو مگر اسراف نہ کرو۔ اللہ مسرفوں کو پسند نہیں کرتا۔ خرچ کرنیوالے فضول خرچی نہ کریں اور نہ بہت تنگدستی کریں۔ ان کا خرچ دونوں کے بین بین ہو۔ رشتہ دار غریب اور مسافر کے حقوق دیتے رہو۔ اور دولت کو بیجا نہ اڑاؤ۔ دولت کے بیجا اڑانیوالے شیطانوں کے بھائی ہیں۔ اور شیطان اپنے رب کا ناشکر گزار ہے۔ اگر تم کو پروردگار کے فضل کے انتظار میں جس کی تم کو توقع ہے انسے منہ پھیرنا پڑے تو نرمی سے انکو سمجھا دو۔ اپنا ہاتھ نہ اتنا سکیڑو کہ گردن میں بندھ جائے اور نہ بالکل اسے پھیلا ہی دو کہ تم تہیدست ہو کر لوگوں کی ملامت سنتے بیٹھو

پھر اسلام نے ایک دوسری اعلیٰ تعلیم دی ہے جو تمدن کی جان اور ترقی عالم کی روح رواں ہے فرمایا ہے کہ "إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ" یعنے مسلمان سب بھائی بھائی ہیں یہ بات صرف اسلام میں پائی جاتی ہے کہ ایک ادنیٰ غلام اور شہنشاہ برابر ہے۔ اور صرف قول ہی قول نہیں بلکہ ابتدائے اسلام سے اب تک اس پر عمل جاری ہے اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے غلام بھی بڑے بڑے شہنشاہ ہو گزرے ہیں۔ اسلام کی حدود میں داخل ہوتے ہی غیر شخص برادری کا بھائی ہو جاتا ہے اور اس کے حقوق سب کے برابر ہو جاتے ہیں۔ اسلام کی

؎ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ۔

؎ كُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا۔ ؎ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ (انعام - ۱۷)

؎ وَالَّذِينَ إِذَا أَنْفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَٰلِكَ قَوَامًا (فرقان - ۱۶)

یہ تعلیم جادو کا اثر رکھتی ہے اور اسنے اشاعت اسلام میں بہت مدد دی ہے۔ دنیا میں جتنی اقوام ہیں انکی تقسیم محض حدود جغرافیہ کی رو سے ہے لیکن مسلمانوں کی قوم اس تنگ اور ادنے امتیاز سے بالا ہے مسلمانوں کی راہ میں ملکی حدود۔ آب وہوا۔ رنگ اور نسل حائل نہیں وہ سب ایک ہیں خواہ کہیں ہوں۔ افریقہ کا حبشی عرب کا بدو ہندوستان کا برہمن۔ یورپ کا فرنگی۔ مصر کا فلاح غرض دائرہ اسلام میں داخل ہوتے ہی یہ سب کمزور اور عارضی امتیازات اٹھ جاتے ہیں اور وہ ایک ہو جاتے ہیں مسلمان کہیں ہو اور کوئی ہو مسلمان ہے۔ اس کا وطن سارا عالم اور اس کی برادری سب مسلمان ہیں چنانچہ خدا فرماتا ہے کہ سب ملکر مضبوطی سے اللہ کا ذریعہ پکڑے رہو اور ایک دوسرے سے الگ نہ ہو اللہ کا وہ احسان یاد کرو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے اور اس نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کی اور اسکے فضل سے تم بھائی بھائی ہو گئے[1]۔

اس سے بھی بڑھ کر اعلی اور اکمل ایک اور تعلیم اسلام کی ہے جو درحقیقت تمام عالم کیلئے عام ہے یعنی پیغمبرؐ نے فرمایا ہے مَنْ قَالَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ فَدَخَلَ الْجَنَّۃَ" اس سے بڑھکر کامل وسیع اور عالمگیر اصول کسی دین ومذہب میں نہیں پایا جاتا۔ اسلام نے اپنا دائرہ اسقدر وسیع کر دیا ہے کہ اس سے زیادہ وسیع ہونا ممکن نہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس کا ہمیشہ بول بالا رہیگا اور دنیا پر اسکی حکومت ہوگی۔ گویا اسلام نے مذہب کی تکمیل کر دی اور خدا کی نعمت کو سارے عالم پر پھیلا دیا۔ اس کا مشرب اس قدر ہمہ گیر اس کے اخلاق اسقدر پاکیزہ اور اسکی تعلیم اسقدر اعتدال پر مبنی اور انسانی طبائع کے مناسب اور

---

[1] وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْکُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ اِذْ کُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِہٖ اِخْوَانًا ط (

انسان کی ترقی کی ممد ہے کہ دنیا کی مادی اور روحانی ترقی کا اس سے بہتر ذریعہ کوئی نہیں ہو سکتا یہ محض اقوال نہیں ہیں بلکہ خود پیغمبرؐ اور پاک باطن خلفا اور تابعین نے اپنے عمل سے اخوۃ اسلامی اور مساوات اور ایثار کا سچا سبق دیا ہے جس کی شہادت میں تاریخیں بھری پڑی ہیں۔ خود ڈاکٹر ڈریپر اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ جسطرح مسلمان پولیٹیکل حیثیت سے عالم پر چھا گئے۔ اسیطرح انہوں نے میدان علوم و فنون میں بھی حیرت انگیز ترقی کی۔ اور نہ صرف یونان کے مردہ علوم کو زندہ کیا بلکہ اپنے علمی اکتشافات و ایجادات اور اپنے انوکھے بے بہا خیالات سے دنیا کو مالا مال کر دیا۔ اور صلح جوئی آزادی بے تعصبی اور مساوات میں سب سے آگے بڑھ گئے اور یورپ کے اندھیرے گھپ میں وہ مشعل دکھائی جس کے نور سے وہ اب تک جگمگ جگمگ کر رہا ہے غرض اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو مادی اور روحانی ترقی دنیاوی تمدن اور اخروی راحت عقل اور جذبات مذہب و سائنس میں توافق اور توازن قائم رکھنے والا ہے۔ اب تک قدیم مذاہب میں سے کسی نے صداقت کے ایک پہلو پر ہی زور دیا تھا اور کسی نے کسی دوسرے پہلو پر مگر اسلام نے صداقت اور حقیقت کے کسی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا اور ان سب کو اس اعتدال اور خوبی کے ساتھ ترتیب دیا کہ اس کی نسبت یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ وہ خاتم المذاہب اور اکمل الادیان ہے اور انسان کی ترقی اور نجات کا سچا اور صحیح راستہ ہے۔

مقدمہ

کتاب مبادی سائنس

مبادی سائنس انجمن اردو کی پہلی کتاب ہے جو پبلک کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔ یہ کتاب در اصل فرانسیسی میں لکھی گئی تھی۔ فرانسیسی سے انگریزی میں ترجمہ کی گئی اور اس قدر مقبول ہوئی کہ اس کی بکری ہزاروں سے بڑھ کر لاکھوں تک پہنچ گئی۔ ترجمہ میں آسانی کی غرض سے اس کتاب کے دو حصے کر لئے گئے ہیں پہلے حصہ میں حیوانات، نباتات اور حجریات، معدنیات کا ذکر ہے جس کا یہ ترجمہ ہے۔ اور دوسرے حصے میں طبیعیات، کیمسٹری، فزیالوجی کا بیان ہے۔ اس کتاب میں بڑی خوبی یہ ہے کہ ان علوم کے تمام اصول او مسائل بہت ہی خوش اسلوبی کے ساتھ نہایت سہل زبان میں ادا کئے گئے ہیں اور یہی اس کتاب کے مقبول ہونے کی وجہ ہے۔

انجمن اردو نے سب سے اول اس کتاب کو کیوں انتخاب کیا اس کی دو وجوہ ہیں۔ اول یہ کہ زبان اردو کی توسیع و ترقی کا بہت بڑا ذریعہ یہی ہے کہ

اُسے علمی زبان بنانے کی کوشش کی جائے۔ اگر زبان سے صرف یہ مقصود ہے کہ روزمرہ کی بات چیت 'کھانے پینے' اُٹھنے بیٹھنے' سونے منہ دھونے کی کرلی جائے تو اتنا تو شاید جانور بھی آپس میں کہہ سُن لیتے ہیں۔ ایک ایسی زبان جسے ہندوستان سے عظیم الشان ملک کی عام زبان ہونے کا دعوےٰ ہے اُسے اسی قدر وسیع ہونا چاہیئے جتنا وسیع اس کا ملک ہے۔ اور اس کی اسی قدر مختلف حیثیتیں ہونی چاہئیں جتنی اس میں مختلف اقوام و ملل ہیں۔ اور یہ اُس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک کہ اُس میں مختلف علوم و فنون نہ آجائیں۔ علاوہ اس کے ملک میں بھی تعلیم اُسی وقت پھیل سکتی ہے جب علوم و فنون کی کتابیں ملکی زبان میں ہوں۔ ہر شخص انگریزی یا یورپین زبانیں نہیں جان سکتا۔ فی صدی چند ہی آدمی ایسے ہوں گے جو یہ زبانیں جانتے ہیں۔ باقی سارے ملک کی تعلیم کا دارومدار دیسی زبان پر ہے۔ لیکن جب دیسی زبان میں سوائے دیوانوں 'عشقیہ مثنویوں' ناولوں' تاریخی قصوں کے کچھ نہ ہو تو علم کی روشنی کیسے پھیلے۔ اور جب علم پڑھنے کے لئے ایک غیر زبان سیکھنی پڑے تو ہماری زبان کس مرض کی دوا ہے۔ آخر دوسروں کی زبان سے کب تک کام نکلے گا اور ہم گونگے بنے کب تک دوسروں کا منہ تکتے رہیں گے؟ یہی وجہ ہے کہ انجمن نے ایک ایسی کتاب کا انتخاب کیا اور ان علوم کی اشاعت کی کوشش کی جن کی ضرورت ہے۔ کسی انتہائی کتاب کا ترجمہ کرنا اس وقت بے موقع ہوگا۔ شروع ابتدائی کتابوں سے ہونی چاہیئے۔ تاکہ لوگ آسانی سے سمجھ سکیں اور اُن میں ایسے علوم کے پڑھنے کا ذوق پیدا ہو یہ کتاب اگرچہ ابتدائی ہے مگر جامع ہے اور ہر علم کے مسائل اصولی طور پر مکمل

بیان کئے گئے ہیں۔

دوسری وجہ اس کتاب کے انتخاب کی یہ ہے کہ ہم ہندو اور مسلمان صدہا سال سے علوم نظری میں اس قدر منہمک ہیں کہ گویا ہمارے دماغ کی ساخت ایک دوسری قسم کی ہو گئی ہے۔ ہمارا قدیم لٹریچر مابعد الطبیعیات والٰہیات سے بھرا پڑا ہے اور یہ مادی دنیا ہماری نظروں میں ایسی حقیر ہو گئی تھی کہ ہماری اکثر بحثیں اس خاکدان سے ہمیشہ ارفع و بالا بالا رہیں اور اگر کسی نے بدقسمتی سے ان بحثوں میں طبیعیات کے مسائل کو دخل دیا تو ہم نے اپنی منطقی بنوٹ کا ایسا پیچ مارا کہ طبیعی دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں کے تعلیم یافتہ قانون و منطق و فلسفہ میں بہت تیز ہوتے ہیں مگر میدان طبیعیات میں قدم رکھتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔ لہذا ہمارے دماغوں کا علاج علوم طبیعیات ہی کی اشاعت سے ہو سکتا ہے۔

اب مجھے مترجم کی نسبت بھی کچھ کہنا ضرور ہے۔ یہ کتاب علمی ہے اور علمی اصطلاحات سے بھری پڑی ہے۔ قابل مترجم نے نہایت تحقیق اور جانکاہی سے تمام اصطلاحات کا عربی میں ترجمہ کیا ہے اور اس بات کی کوشش کی ہے کہ حتی الامکان قدیم اور مروجہ عربی اصطلاحات لکھی جائیں۔ جہاں کہیں کوئی عربی اصطلاح نہیں ملی وہاں موزوں اور مناسب اصطلاح عربی زبان میں بنا لی گئی ہے۔ عربی زبان میں جدید الفاظ بنانے کی بہت کچھ گنجائش ہے اور سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ اس وسیع اور بے نظیر زبان سے فائدہ اُٹھایا جائے۔ مولوی معشوق حسین خان صاحب بی۔ اے (علیگ) نے اس

کتاب کا اُردو میں ترجمہ کرکے ملک پر بڑا احسان کیا ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ انھوں نے یہ ترجمہ بلا معاوضہ انجمن کو دیدیا ہے۔ ان کی یہ مثال نہایت قابلِ قدر اور قابل تقلید ہے اور انجمن بدرجۂ غایت ان کی شکرگزار ہے۔

آخر میں افسوس کے ساتھ اس امر کا اظہار کرتا ہوں کہ کتابت میں اکثر غلطیاں رہ گئی ہیں۔ سنگی چھاپے میں کتابت کی غلطیوں کا ہونا ایک ایسی معمولی بات ہوگئی ہے کہ میں نہیں جانتا کہ اُس کے لئے کیا عذر پیش کروں اس میں شک نہیں کہ کامل طور پر صحیح لکھنے والا ایسا ہی کم یاب بلکہ نایاب ہے جیسے یورپ میں ہاتھی' لیکن اس کتاب میں صرف کاتب ہی قصور وار نہیں بلکہ ایک وجہ اور بھی ہوئی۔ بات یہ ہے کہ لائق مترجم نے کتاب کا بہت سا حصہ ترجمہ کرکے خوشنویس سے صاف کرا لیا تھا اور کتاب چھپنے ہی کو تھی کہ لندن میں معلوم ہوا کہ انگریزی کتاب کا ایک جدید اڈیشن شائع ہوا ہے جس میں بہت کچھ اضافہ کیا گیا ہے اور کتاب کی حیثیت بالکل دوسری ہوگئی ہے۔ اس لئے انھیں سرے سے پھر ترجمہ کرنا پڑا۔ اتفاق سے اسی اثنا میں انھیں یہاں سے جانا پڑا۔ یہاں چونکہ طبع کا کل انتظام ہوچکا تھا لہذا جلد جلد ترجمہ کرکے بھیجنا پڑا، خوشنویس سے صاف کرانے کی مہلت نہ ملی، مسودہ ہی پر سے کاپی لکھی گئی۔ ایک تو علمی کتاب جس میں سینکڑوں غیر مانوس الفاظ، دوسرے جلدی میں لکھے ہوئے مسودے سے کاپی لکھنا' تیسرے طبع کی جلدی' ان تمام وجوہات سے کتابت میں غلطیاں رہ گئیں۔

کتاب کے آخر میں ایک مکمل فہرست انگریزی اصطلاحات کی مع ترجمہ

و تلفظ کے دیدی گئی ہے۔ اس سے پڑھنے والوں کو اور نیز اُن لوگوں کو جنھیں
اصطلاحات کے ترجمہ کی تلاش رہتی ہے بہت سہولت ہوگی۔ علاوہ اس کے
آئندہ جب اصطلاحاتِ علمیہ کی اُردو ولغت لکھی جائے گی تو اس سے
بہت بڑی مدد ملے گی۔

عبدالحق بی۔ اے (علیگ)
(سکرٹری انجمنِ اُردو۔ حیدر آباد دکن)

۱۰۔ اپریل سنہ ۱۹۱۰ء
مطابق ۱۱۔ خورداد سنہ ۱۳۱۹ ف

تاریخ و تذکرہ

۱۔ مقدمہ مشاہیرِ یونان و رُوما
۲۔ مقدمہ جنگِ رُوس و جاپان
۳۔ مقدمہ حیات النظیر
۴۔ مقدمہ تذکرہ گلشن ہند
۵۔ مقدمہ مآثر الکرام
۶۔ مقدمہ تذکرۂ مخزن نکات
۷۔ مقدمہ تذکرہ چمنستانِ شعرا
۸۔ مقدمہ ذکر میر
۹۔ مقدمہ تمدنِ ہند

مقدمہ مشاہیر یونان و روم

(مترجمہ مولوی سید ہاشمی فرید آبادی)

پڑھنے کی عادت بہت اچھی ہے۔ مطالعہ ایک شریفانہ فعل ہی نہیں حکیمانہ فعل ہے، لیکن پڑھنے پڑھنے میں فرق ہے۔ اور کتاب کتاب میں فرق ہے۔

میں ایک بدمعاش اور پاجی آدمی سے باتیں یا بے تکلفی کرتے ہوئے جھجکتا ہوں اور آپ بھی میرے اس فعل کو بری نظر سے دیکھتے ہیں۔ لیکن میں اس سے زیادہ بڑی اور پاجی کتاب پڑھتا ہوں نہ آپ کو ناگوار گذرتا ہے اور نہ مجھے ہی کچھ ایسی شرم آتی ہے بلکہ اس کی بات شربت کے گھونٹ کیطرح حلق سے اترتی چلی جاتی ہے۔ پاجی آدمی کی تو شاید کوئی حرکت ناگوار ہوتی اور میں اس سے بیزار ہو جاتا مگر یہ چپکے چپکے دل میں گھر کر رہی ہے اور اسکی ہر بات دلربا معلوم ہوتی ہے۔

اگر میں کسی روز بازار جاؤں اور چوک میں سے کسی مفلس اجنبی شخص کو ساتھ لے آؤں اور اس سے بے تکلفی اور دوستی کی باتیں شروع کر دوں اور پہلے ہی روز اس طرح سے اعتبار کرنے لگوں جیسے کسی پرانے دوست پر۔ تو آپ کیا کہیں گے؟ لیکن اگر ریل کسی اسٹیشن پر ٹھہرے اور میں

اپنی گاڑی سے اُتر کر سیدھے بک اسٹال (کتب فروش کی الماری) پر پہونچوں اور پہلی کتاب جو میرے ہاتھ لگے وہ خرید لاؤں اور کھول کر شوق سے پڑھنے لگوں تو شاید آپ کچھ نہ کہیں گے حالانکہ یہ فعل پہلے فعل سے زیادہ مجنونانہ ہے اُس کے لئے تو کوئی عذر ہو بھی سکتا ہے، مگر اس کے لئے کوئی عذر ممکن نہیں۔

میں ایک بڑے آباد شہر یا مجمع میں جاتا ہوں، کبھی ایک طرف نکل جاتا ہوں کبھی دوسرے طرف جا پہونچتا ہوں اور بغیر کسی مقصد کے اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا ہوں۔ افسوس کہ باوجود آدمیوں کی کثرت کے میں وہاں اپنے تئیں اکیلا اور تنہا پاتا ہوں اور اس ہجوم میں تنہائی کا بار اور بھی گراں معلوم ہوتا ہے میرے کتب خانے میں بیسوں الماریاں کتابوں کی ہیں، میں کبھی ایک الماری کے پاس جا کھڑا ہوتا ہوں اور کوئی کتاب نکال کر پڑھنے لگتا ہوں اور کبھی دوسری الماری میں سے کوئی کتاب اُٹھا کر دیکھنے لگتا ہوں۔ میں اِس طرح سینکڑوں کتابیں پڑھ جاتا ہوں لیکن اگر میں غور کروں تو میں دیکھوں گا کہ میں نے کچھ بھی نہیں پڑھا۔ اس وقت میری آوارہ خوانی مجھے ستائے گی اور جس طرح ایک بھرے پُرے شہر میں میری تنہائی میرے لئے وبال تھی اسی طرح اس مجمع شرفاء و علماء اور باد شعراء میں بھی تنہا اور حیران ہوں گا۔

بغیر کسی مقصد کے پڑھنا فضول ہی نہیں مضر بھی ہے، جس قدر ہم بغیر کسی مقصد کے پڑھتے ہیں اسی قدر ہم ایک بامعنے مطالعہ سے دور ہوتے جاتے ہیں۔

ملٹن نے ایک جگہ کہا ہے کہ "اچھی کتاب کا گلا گھونٹنا ایسا ہی ہے

جیسے کسی انسان کا گلا گھونٹنا" جس سے اس کی مراد یہ ہے کہ فضول اور معمولی کتابوں کے پڑھنے میں عزیز وقت ضایع کرنا اچھی کتاب کا گلا گھونٹنا ہے کیونکہ ایسی صورت میں وہ ہمارے لئے مردہ ہے۔

لوگ کیوں فضول، معمولی اور ادنیٰ درجے کی کتابیں پڑھتے ہیں؟ کچھ تو اس لئے کہ ان میں نیا پن ہے۔ کچھ اس خیال سے کہ ایسا کرنا داخلِ فیشن ہے اور کچھ اس غرض سے کہ اس سے معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ پہلی دو وجہیں تو طفلانہ ہیں۔ تیسری وجہ البتہ بظاہر معقول ہے لیکن اس کے یہ معنے ہوں گے کہ ہم معمولی ذلیل اور ادنیٰ معلومات کو اپنے دماغ میں بھرتے ہیں تاکہ اعلیٰ معلومات کی گنجایش باقی نہ رہے۔ اگر ہم اپنے مطالعہ کا ایک سیاہہ تیار کریں اور اس میں صبح سے شام تک جو کچھ پڑھتے ہیں لکھ لیا کریں اور ایک مدت کے بعد اُسے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ ہم کیا کیا کر گزرے۔ اس میں ہم بہت سی ایسی تحریریں پائیں گے جن کا ہمیں مطلق خیال نہیں، بہت سے ایسے ناول ہوں گے جن کے ہیرو ہیروئن تک کے نام یاد نہیں، بہت سی ایسی کتابیں کہ جن کی نسبت اگر ہم سے کوئی یہ کہتا کہ یہ ہم پڑھ چکے ہیں تو ہمیں کبھی یقین نہ آتا، بہت سی ایسی تاریخیں، سفرنامے، رسالے وغیرہ ہوں گے جنہیں پڑھ کر خوش تو کیا پچھتائے ہی ہوں گے۔ اگر ہم علی گڈھ کالج کے طالب علموں کے نام ان کے حلئے، ان کے وطن، ان کے محلّے، ان کی کتب نصاب تعلیم اور ان کے شجرے یاد کرنے شروع کر دیں اور اُسے معلومات کے نام سے موسوم کریں تو لوگ کیا کہیں گے؟ غرض ایسا ہی کچھ حال اس سیاہہ کا

ہوگا۔ اس کا اکثر حصہ خرافات کی ایک عجیب فہرست اور ہمارے ورق گردانی اور تضیع وقت و دماغ کی ایک عمدہ یادگار ہوگی۔

ملٹن نے کیا خوب کہا ہے "عمدہ کتاب حیات ہی نہیں بلکہ ایک لافانی چیز ہے" اس قول میں مطلق مبالغہ نہیں۔ عمدہ کتاب خود ہی لافانی نہیں بلکہ اپنے لکھنے والے کو اُن کو جن کا اس میں ذکر ہے، اور بعض وقت پڑھنے والوں کو بھی لافانی بنادیتی ہے۔ عمدہ کتابوں نے انسانوں کے اخلاق وطبایع وآراء پر بہت بڑا اثر ڈالا ہے، خیالات میں عظیم الشان تغیر پیدا کیا ہے قوموں میں ہل چل اور انقلابات بپا کئے ہیں اور ملکوں کی کایا پلٹ میں حیرت انگیز مدد دی ہے اور یہی عمدہ کتاب کی نشانی ہے۔ میں آج آپ کو ایک ایسی ہی کتاب کا حال سناتا ہوں یہ آج کل کی نہیں۔ صدی دو صدی کی نہیں بلکہ سنہ عیسوی کی پہلی صدی کی لکھی ہوئی ہے۔ یہ اب تک زندہ ہے یہہ لافانی ہے۔ اس نے بہت سے مُردہ دلوں کو زندہ دل بنادیا۔ بہت سے سوتے ہوؤں کو بیدار اور غافلوں کو ہشیار کردیا، بہت سی قوموں میں قومیت وانسانیت کی روح پھونکدی اور اس میں اب بھی اسی سحرکاری کی قوت موجود ہے بشرطیکہ ہمیں اپنی آوارہ خوانی سے فرصت ہو۔

جب روم کی قدیم سلطنت خانہ جنگیوں کی بدولت پارہ پارہ ہوگئی نیز مذہب عیسوی کے تازہ فروغ نے یونان قدیم کی تہذیب وحکمت کو برباد کردیا تو چوتھی صدی سے تیرھویں صدی عیسوی تک براعظم یورپ میں سخت جمود کی کیفیت طاری رہی۔ علمائے مذہبی کی تلقین اور حاکمانہ

تعلیم نے لوگوں کو دنیا اور معاملات دنیا کی جانب سے بالکل بے پرواہ کر دیا تھا، ہر دل پر آنے والی زندگی کا ہول اور قیامت کا خوف ایسا بیٹھ گیا تھا کہ جو لوگ تارک الدنیا نہ تھے حیات ظاہری کے مسائل پر غور کرنا انہیں بھی ناگوار اور تضیع اوقات معلوم ہوتا تھا، دماغوں میں اوہام پرستی اور متعصبانہ تنگدلی اور قومی عزت وغیرت کے تمام اصولوں سے بے خبری کے سوائے کسی چیز کے سمانے کی گنجائش نہ تھی اور شخصی بادشاہوں کے طفلانہ فرمان اور خود غرض پادریوں کے خلاف عدل وانصاف وانسانیت احکام کی تابعداری زندگی کا فریضہ مسلمہ بن گئی تھی۔

صدیوں تک اسی حالت خراب میں پڑے رہنے کے بعد آخرکار اہل مغرب میں حرکت پیدا ہوئی اور اندلس کے اسلامی درسگاہوں کے طفیل سے اور ان یونانی پناہ گزینوں کے اثر سے جو ترکی فتح قسطنطنیہ کے بعد جنوبی یورپ میں بھاگ آئے تھے یونان قدیم کے فلسفہ وحکمت اور رومی قوانین و نظام سلطنت کا علم ان ممالک میں پھیلا اور محض اس کی بدولت ذہنی ترقی کا وہ دور یورپ میں شروع ہوا جسے بجا طور پر اہل یورپ عہد بیداری یا نشاۃ الثانیہ سے تعبیر کرتے ہیں علم ومطالعہ کے شوق کے اس احیا نے ایک طرف تو اس زبردست مذہبی اصلاح کی تخم پاشی کی جو عیسائیوں کے نئے فرقے پراٹسٹنٹوں کی تحریک کی سنگ بنیاد تھی اور دوسرے طرف عدل و مساوات، رواداری اور معقولیت، آزادی خیال اور جمہوریت اور ایثار وحب وطن کا دلوں میں گہرا نقش بٹھا دیا۔ اور درحقیقت محض قدیم

علم ادب کا طفیل تھا کہ استبداد و مطلق العنانی کا زور ٹوٹا اور لوگوں کے خیالات میں وہ غیر معمولی تلاطم ہوا جس کا سب سے خوفناک مظاہرہ انقلاب فرانس تھا۔

اس طرح تقریباً پانسو برس کی محنت و مطالعہ کا جو کچھ نتیجہ ہوا وہ گویا اسی درخت کا پھل تھا جسے دو ہزار برس پہلے اہل یونان کے ہاتوں نے بویا تھا۔

لیکن ان یونانی کتابوں میں جو یورپ کے ایسے ذہنی انقلابات کا سبب ہیں اگر ہم بغور تلاش و امتیاز کرنا چاہیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ پلوٹارک متوطن خیرونیہ (علاقہ بیوشیہ یونان) کی کتاب "مشاہیر یونان و رومہ" منجملہ ان چند کتابوں کے ہے جنہوں نے مغرب کو قعر ذلت سے نکال کر اوج کمال پر پہونچا دیا اور اعلیٰ انسانی خصائل کا ایسا سبق دیا جو کبھی فراموش نہ ہوگا۔

مذہب ہو یا دنیوی معاشرت، سیاسیات ہو یا دینیات بغیر اخلاق کے چارہ نہیں۔ جب تک ان کی تہ میں اخلاق نہ ہو کامیابی ممکن نہیں۔ لیکن قابل غور اور اہم سوال یہ ہے کہ اعلیٰ اخلاق کی تعلیم کیونکر دیجائے کہ نوجوانوں کے دلوں میں اعلیٰ اور پاکیزہ خیالات اس طرح متمکن ہو جائیں کہ دنیوی لالچ خود غرضانہ خواہشات، دوستی اور مروت انہیں ڈانواں ڈول نکر سکے؟

بعض کا خیال ہے صرف مذہبی تعلیم ہی سے اخلاق درست ہو سکتے ہیں بعض کی رائے ہے کہ اخلاق کی کتابیں پڑھانے اور وعظ و پند کے ذریعے سے اخلاق سکھا سکتے ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ پہلا طریقہ حکم و فرمان پر مبنی ہے

اور بہت سے طبائع اُسے قبول کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتیں اور اس لئے اکثر محروم رہ جاتی ہیں۔ اور دوسرا طریقہ بے مزہ اور روکھا پھیکا ہے، خصوصاً نوجوان طبیعتیں اُس سے بھاگتی ہیں اور واعظوں کے وعظ اور ناصحوں کی نصیحتیں رائگاں جاتی ہیں۔ ایک تیسری تدبیر اصلاح اخلاق کی صحبت ہے، بے شک یہ ایک کارگر اور موثر تدبیر ہے لیکن ہر کہیں اعلیٰ اخلاق اور پاکیزہ سیرت کے کامل نمونے کہاں نصیب ہوتے ہیں۔ علاوہ اس کے کہ پہلے دو طریقوں میں دل کشی نہیں جو نصیحت کی تلخی کو کم کرنے کے لئے نہایت ضروری ہے ایک اور کمی بھی ہے، یعنے ان سے بڑائی حاصل کرنے کا دلوں میں ولولہ اور جوش پیدا نہیں ہوتا۔ اب صرف ایک ہی طریقہ باقی ہے جو موثر بھی ہے۔ دلکش بھی ہے۔ اور طبیعتوں میں ولولہ اور جوش بھی پیدا کرتا ہے۔ اور ہر کہیں میسر آسکتا ہے، اور وہ یہ کہ ان لوگوں کے حالات پڑھنے کے لئے دیئے جائیں جنھوں نے دنیا میں ایسے بڑے بڑے کام کئے ہیں جو کبھی مٹنے والے نہیں، بشرطیکہ ان کا لکھنے والا اُس گر سے واقف ہو۔

پلوٹارک اُس گر کو خوب سمجھتا تھا۔ اس نے یونان و روما کے سپوتوں کے حالات لکھنے میں ایسے دلاویز طریقے سے کام لیا ہے کہ خود بخود پڑھنے کی رغبت ہوتی ہے اور دوسری بات جو پلوٹارک کی سبق آموز اور زندہ جاوید کتاب کی وقعت بڑھانے والی ہے وہ اسکی تاریخی حیثیت اور صاحب کتاب کی غیر معمولی وسعت نگاہ ہے۔ اسکی سائی تحقیق و جستجو کو سیر کرنے کے لئے اول تو کتابوں کا ایک ذخیرہ کثیر اس کے سامنے تھا، جو اب

نا پید ہے اور دوسرے وہ پہلی صدی عیسوی کا آدمی ہے اور اس لیے یونان و روما کی تہذیب و معاشرت کا جیسا صحیح اندازہ وہ کر سکتا ہے اس زمانے میں ممکن نہیں۔ پس تاریخی اعتبار سے ان ملکوں کی کوئی قدیم تاریخ مکمل بلکہ معتبر نہیں سمجھی جاتی جب تک کہ مولف اسبات کا ثبوت نہ دے کہ اس نے پلوٹارک کی لکھی ہوئی سوانح عمریوں کو طالب علمانہ شوق و جانکاہی سے پڑھا ہے۔

آپ اس کتاب میں حب وطن، کامل ایثار، بے نفسی، و جاں نثاری، اور اولوالعزمی کی ایسی زندہ اور سچی تصویریں دیکھیں گے کہ ان کو پڑھ کر انسان بیخود ہو جاتا ہے اور دل بے اختیار سچے جذبات سے اُبلنے لگتا ہے۔ اور خواہ کیسا ہی آدمی ہو یہ ممکن نہیں کہ اس کے پڑھنے کے بعد وہ متاثر نہ ہو اور ان انسانی اعلیٰ خوبیوں کا دائمی اثر اس کے دل پر باقی نہ رہے۔ دنیا میں سینکڑوں آدمی ایسے گذرے ہیں کہ اس کتاب نے ان پر جادو کا سا اثر کیا ہے اور اس کی بدولت انہیں حیات جاوید حاصل ہوئی ہے۔

روسیو جو فرانس کا ایک بڑا حکیم گذرا ہے اور جو ان چند برگزیدہ لوگوں میں سے تھا جو انقلاب فرانس کا پیش خیمہ تھے۔ اس کتاب کو پڑھ پڑھ کر تپے سے باہر ہو جاتا۔ اور لڑکپن کے زمانے میں بھی اس سے ان بے نفس اولعزم لوگوں کی تقلید میں عجیب و غریب حرکتیں سرزد ہو جاتی تہیں۔ وہ اس کتاب کو بہت عزیز رکہتا تھا اور ہمیشہ اس کے پڑھنے سے اس پر نئی کیفیت طاری ہوتی تھی۔

فرانس کے عہد بیداری کے ایک دوسرے نامور مصنف "مونٹین" کی نسبت لکھا ہے کہ وہ پلوٹارک کے مطالعہ سے بے انتہا متاثر ہوا تھا اور اپنی کامیابی کے لئے علاوہ دیگر یونانی فلسفیوں کے پلوٹارک کا بھی رہین منت تھا۔

پلوٹارک کو انسانی سیرت اور باطن کی تصویر کھینچنے میں کمال حاصل ہے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا زندہ تصویریں ہمارے سامنے موجود ہیں اور تھوڑی دیر کے لئے ہم خود اپنے اردگرد کے حالات سے بالکل بے خبر ہو جاتے ہیں شکسپیر کے کلام کا مشہور نقاد "ریلے" لکھتا ہے شکسپیر جو پلوٹارک کا بہت کچھ زیر بار احسان ہے بعض اوقات کیریکٹر (سیرت) کی تصویر اُتارنے میں پلوٹارک کے حیرت انگیز بیان کو نہیں پہونچتا۔

فردوسی بھی اس بارے میں کمال رکھتا ہے اور شاہنامے کے پڑھنے کے بعد ہم رستم و افراسیاب، سیاوش و سہراب وغیرہ کو نہیں بھول سکتے لیکن حب وطن، کمال ایثار اور انسان کے اخلاقی کمالات کی وہ تصویریں جو دل میں گھر کر لیتی ہیں اور جو تزکیۂ نفس اور اصلاح اخلاق کا زبردست آلہ ہیں، اس میں نہیں پائی جاتیں۔ پلوٹارک کو اس خصوصیت میں سب پر تفوق حاصل ہے اور جسے یقین نہ ہو وہ بروٹس لکرگس اور کیٹو (خرد) وغیرہ کے حالات پڑھ کر دیکھ لے اور سوچے کہ ان اعلیٰ صفات کی حامل کوئی اور کتاب بھی ہے۔

اگر اس کتاب کے پڑھنے کے بعد کوئی اس سے متاثر نہ ہوا اور اس کے دل میں اخلاقی کمالات کا جوش اور ولولہ پیدا نہ ہو تو اُسے چاہیئے کہ وہ خدا سے خشوع و خضوع

کے ساتھ دعا مانگے کہ خدا اس کے حال پر رحم کرے!

مجھے سچی اور قلبی مسرت ہے کہ آخر یہ دلچسپ اور وقیع المنزلت کتاب جو دنیا کی امہات کتب میں سے ہے انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہوئی اور ہمارے اہل ملک کے سامنے منجملہ (پانچ جلدوں کے) اس کی پہلی جلد آج پیش کی جا رہی ہے۔ خدا کرے کہ اُسے یہاں بھی وہی تاثیر اور قبولیت نصیب ہو جسکی وہ مستحق ہے۔

میں اس امر پر بھی خاص مسرت کا اظہار کرتا ہوں کہ انجمن ترقی اُردو کی خوش نصیبی سے اُسے مترجم بھی ایسا ہی قابل اور محقق ملا ہے۔ سید ہاشمی صاحب نے اس کتاب کا ترجمہ جس جانکاہی شوق اور محنت سے کیا ہے وہ بہت قابل تعریف ہے۔ اور میری رائے میں یہ اُردو ترجمہ بلحاظ طرز بیان، سلاست اظہار مطالب، انگریزی ترجمے پر فوقیت رکھتا ہے علاوہ اس کے لایق مترجم نے ایک بڑا کام یہ کیا ہے کہ کتاب کے شروع میں ایک تاریخی مقدمہ (جو گویا یونان اور رومہ کی قدیم تاریخ کا ایک خلاصہ ہے)، اضافہ کر دیا ہے جس سے اُردو ترجمہ کی وقعت اور بڑھ گئی ہے۔ یہ بہت ضروری تھا۔ اس لئے کہ ان سوانح عمریوں میں خاص تاریخی سلسلہ نہیں ہے اور بہت سی باتیں اس وقت تک سمجھ میں نہیں آسکتیں نہ کتاب کا پورا لطف آسکتا ہے جب تک کہ یونان و رومہ کی تاریخ سے واقفیت نہ ہو۔ پس یقین ہے کہ اُردو خوان پبلک کے لئے یہ نہایت مفید اور کارآمد ثابت ہوگا۔

مقدمہ بر کتاب

جنگ روس و جاپان

(مصنفہ مولوی ظفر علی خاں صاحب)

انیسویں صدی کے نصف سے یورپ میں ایک نیا مرض چل نکلا ہے جس کا نام "جوع الارض" ہے۔ یہ مرض استقا سے ملتا جلتا ہے۔ جس طرح استقا کا مریض پانی پیتا جاتا ہے اور پیاس نہیں بجھتی اسی طرح اس سنئے دکھ کا دکھیا را ملک کے ملک ہضم کرتا جاتا ہے اور اس پر بھی ہل من مزید کا نعرہ بلند ہے۔ اس مرض میں وہی مبتلا ہوتے ہیں جو ظرف کے تھڑے اور مزاج کے کڑے ہیں۔ اور انہوں نے اپنی ہوس مٹانے کے لئے وہ وہ سامان کشت و خون و جنگ و جدل جمع کیا ہے جو دید ہے نہ شنید۔ فوج پر فوج بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ خشکی اور تری دونوں پر پھیلتے چلے جا رہے ہیں۔ آلات حرب میں اصلاحیں ہو رہی ہیں۔ اور پے در پے دوسروں پر ہاتھ ڈالنے اور خون بہانے کی تدبیریں کی جا رہی ہیں۔ اور رعایا ہے کہ مارے بوجھ کے دبی جا رہی ہے۔ ملک کا روپیہ نہایت بے دردی کیساتھ آپس کے کشت و خون کے لئے پانی کی طرح بہایا جاتا ہے۔ خلق خدا جس کے پسینے کی یہ کمائی ہے بھوکوں مرے تو مرے مگر ان جابروں کی ہوس پوری

ہو کے رہے۔ دوسرے سلاطین ان کی یہ تیاریاں دیکھ کر سہمے جاتے ہیں اور ان کے پنجے سے اپنے تئیں بچانے اور جان سلامت رکھنے کے لئے مجبوراً وہ بھی اپنی فوجیں بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان اخراجات کی وجہ سے بعض چھوٹی چھوٹی ریاستوں مثلاً "بلگیریا" اور "سرویا" کا حال پتلا ہو رہا ہے اور قریب ہے کہ "اٹلی" اور "آسٹریا" بھی اس کا مزہ چکھیں اور اپنے ہاتھوں اپنی قبر بنائیں۔

انیسویں صدی کے نصف سے پہلے ریلوے اور تار برقی کا اجرا، وسائل نقل و حرکت کی سہولتیں، خط و کتابت کی آسانیاں، مطابع کی کثرت اور علوم و فنون کی ترقی دیکھ دیکھ کر لوگ پھولے نہیں سماتے تھے اور کہتے تھے کہ فاصلہ جو کسی کے سکیڑے سکڑتا نہیں اور وقت جو کسی کے ٹالے ٹلتا نہیں اب دونوں انسان کے پنجۂ قدرت میں ہیں۔ اور یہ پیشین گوئی ہوتی تھی کہ تاریکی و ظلمت ہوا ہو گئی ہے یہ زمانہ عام امن و صلح کا ہے۔ اب دنیا میں آزادی اور فارغ البالی کا ڈنکا بجے گا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد زمانہ نے اُن کی آنکھیں کھول دیں اور وہ سب خیالات کافور ہو گئے۔ طرفہ ماجرا یہ ہے کہ وہی سامان جو تہذیب و شائستگی کی جان تھا جنگ و جدل اور کشت و خون کا بھی مایۂ ناز ہے۔ وہی ریلیں وہی ٹیلگراف بلکہ بے تار کا ٹیلگراف۔ وہی مطبع، وہی قوت ایجاد و اختراع سب کے سب صرف کشت و خون میں اور مرنے اور مار رکھنے کا سامان ہیں۔ ان ایجادوں نے جتنی آسانی تہذیب و شائستگی کی ترقی دینے میں پیدا کی تھی اس سے کچھ کم ظلمت

وجہالت کے پھیلانے میں نہیں کی۔ یہ کہنا کسی طرح غلط نہ ہوگا کہ گذشتہ تیس سال میں دنیا نے سوائے جنگی تیاریوں میں مصروف رہنے کے کوئی بڑا کام نہیں کیا۔ اس سے زیادہ کوئی شرم کی بات نہیں کہ وہ زمانہ جو تہذیب وشائستگی اور ترقی علوم و فنون کی معراج سمجھا جائے اس کا سب سے بڑا کام یہ ہو کہ لوگ ایک دوسرے کا خون پینے کے لئے تیار کئے جائیں۔ غرض انسان کی دو بڑی دولتیں یعنی روپیہ اور وقت اس کی نذر ہو رہا ہے۔

صلح ہے اک مہلت سامان جنگ — کرتے ہیں بھرنے کو یاں خالی تفنگ
ہدنگیتی پر نہ بھولیں کامراں — آخر اس کی آشتی لائے گی رنگ
علم کیا اخلاق کیا ہتیار کیا — سب بشر کے مار رکھنے کے ہیں ڈھنگ (حالی)

عذر یہ ہے کہ سب کچھ ہم اپنے بچاؤ کے لئے کر رہے ہیں سچ ہے۔ لیکن اس سے زیادہ سچ یہ ہے کہ یہ تقاضائے فطرت انسانی ہے کہ قوت کے ہوتے ساتے آدمی نچلا نہیں بیٹھ سکتا۔ جہاں زور پیدا ہوا اور اس کے پھسلنے۔ چنانچہ ان سلاطین نے جو "جوع الارض" کے شکار ہو چکے ہیں دنیا کو اپنا شکار بنایا۔ آس پاس دست اندازی شروع کی اور خدا کی خدائی کا ایک حصہ ہضم کر گئے۔ چھوٹے چھوٹے نقصوں سے اگر قطع نظر کی جائے تو وہ موٹی موٹی آسامیاں بھی جہاں سے گذشتہ پچاس سال سے یہ جوع الارض کے مریض لقمۂ تر بستر حاصل کر رہے ہیں تعداد میں کچھ کم نہیں ہیں۔ مثلاً سب سے بڑی مریضہ دولت برطانیہ ہے۔ جان نہ پہچان بڑی خالہ سلام۔ یہ درحقیقت مصر کی خالہ بن بیٹھی ہیں۔ اور محض از راہ ہمدردی اس موٹے تازے بچے کے

رکھ رکھاؤ اور دیکھ بھال میں مصروف ہیں۔ خیر یہ تو تھا ہی بیٹھے بیٹھے سوڈان پر ایک ہاتھ ایسا مارا کہ صفایا کر دیا۔ اس میں کہنے کو مصر بھی شریک ہے۔ ادہر ہندوستان میں برہما کا الحاق ہوا اور برار کا پٹہ دوامی حضور نظام سے حاصل کیا۔ افریقہ میں ٹرانسوال سے وہ کشتم کشتا ہوئی کہ الاماں الحفیظ خون کی ندیاں بہہ گئیں مردوں کے پشتارے لگ گئے مگر نہ چھوڑا اور آخر لے کے چھوڑا۔ آرنج فری اسٹیٹ بھی اپنی آزادی سے ہاتھ دھو بیٹھی اور حکومت انگریزی میں شامل ہو گئی۔ جزیرہ قبرس کو لارڈ بیکنس فیلڈ نے جو رجوع الارض کا بہت بڑا مریض گزرا ہے بہ زمانہ برلن کانفرنس ٹرکی سے معاہدہ کر کے ہتیا لیا تھا۔ اس کا اصلی منشا یہ تھا کہ اسے فوجی پڑاؤ بنائے کیوں کہ ان دنوں فرانس کا ڈر لگا ہوا تھا کہ کہیں مصر پر فوج نہ بھیجدے۔ دولت فرانس اگرچہ جمہوری سلطنت ہے مگر پڑوس کا اثر کہئے یا زمانہ کا یہ بھی اسی مرض میں مبتلا ہو گئی اور ٹیونس دبا بیٹھی اور ادہر انڈو چائنا کی عنان انتظام اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ یہاں تک کہ انام، کوچن چائنا، کمبوڈیا اور ٹانکن جو پہلے خود مختار ریاستیں تھیں اپنی خود مختاری اُس جمہوری سلطنت کی نذر کر چکیں جس نے چار دانگ عالم میں آزادی، مساوات، اخوت کا علم بلند کر دیا تھا۔ روس جو اس مرض کے طفیل حیوان ناطق سے حیوان مطلق ہوتا چلا جاتا ہے اور جو اپنی حرص اور سخت جانی اور ایذا رسانی میں کسی طرح خرس کوہی سے کم نہیں بسرابیا اور آرمینا کے شمالی صوبے آخر ڈکار ہی گیا۔ ادہر وسط ایشیا میں وہ ہاتھ پاؤں پھیلائے کہ افغانستان ڈنڈا جا ملایا۔ دوسری طرف مشرق

الاقصیٰ میں تلاطم مچاتا ہوا منچوریا میں جابراجا۔ جرمنی نے خود اس مرض کا ب
تازہ شکار ہے ایک طرف زنگبار میں اور دوسری طرف کیوچیو میں (چین)
جا جھنڈا گاڑا۔ اور سنئے ہینڈ کی کو بھی زکام ہوا۔ اور آسٹریا اور اٹلی بھی چلیں
ہنس کی چال۔ ایک نے بوسینا اور ہرزی گونیا اینٹھ لیا اور دوسری نے ساوا۔
اور اٹلی نے بے چارے ابی سنیا (حبش) کا ٹینٹوا دبا ہی دیا ہوتا مگر وہ تو پہلے
گو آڈو وا پر ایسی منہ کی کھائی کہ آدھا مرض جاتا رہا۔ بلجیم بھی کوئی سلطنت
میں سلطنت ہے۔ یہ بھی لہو لگا کے شہیدوں میں داخل ہو گئی اور گو نام کو نہ سہی
مگر حقیقت میں کانگو فری اسٹیٹ پر قابض ہے۔ اور تو اور ریاست ہائے متحدہ
امریکہ جس نے لڑ کر اور خون بہا کر اپنا پیچھا چھڑایا اور آزادی حاصل کی تھی اور
جس کے نام سے آزادی امن صلح تہذیب و شائستگی کا بول بالا ہے افسوس ہے
کہ اس میں بھی اس منحوس مرض کے آثار نظر آرہے ہیں۔ پچھلے دنوں بیٹھے بٹھائے
اسپین سے جھونز ہو گئی۔ تھوڑی سی لپاڈکی کے بعد اسپین تو بھاگتا نظر آیا اور
اس آزادی کی ملکہ نے 'کیوبا' پوانٹو ریکو' اور فلپاین کو مال غنیمت
سمجھ کر بچا لیا۔ جب نوبت یہاں تک پہونچ گئی تو پھر باقی کیا رہا۔ بے چارہ
افریقہ جسے برظلمات کا خطاب عطا ہوا ہے ان شہسواروں کا جولان گاہ
بلکہ شکارگاہ ہے۔ جس قوم نے اس بدنصیب ملک سے غلامی کو مٹایا اس نے
بہت بڑا احسان کیا۔ صرف اُن مظلوموں ہی پر نہیں بلکہ تمام بنی نوع آدم پر
مگر یہ کیسی بھلائی۔ اور کہاں کا احسان ہے کہ اس کے بعد ہی اس غریب کا
تکا بوٹی کر ڈالا اور اب تک نوچا نوچی اور لوٹ کھسوٹ مچ رہی ہے اہل یورپ نے

قریباً سارے ملک کے حصے بگڑے کر لئے ہیں اور جو ایک آدھ حصہ باقی ہے وہ چند روز کا مہمان ہے۔

یہ مرض متعدی بھی معلوم ہوتا ہے۔ پادشاہ اور بڑے بڑے مدبرین سلطنت تو خیر اس میں پھنسے ہی تھے اور پھنس رہے ہیں مگر تعجب اور سخت تعجب یہ ہے کہ اچھے اچھے حکیم اور فلسفی، فاضل مورخ اور ادیب بھی اس کے اثر سے نہ بچے۔ یہ بزرگ بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ آنکھیں بند کر کے اسی ڈھرے پر پڑ لئے اور اس دماغ سے جس میں اس مرض کے جرم گھس بیٹھے ہیں نئے نئے اصول اور مسائل اختراع کئے اور وہ طومار باندھا کہ ایک دنیا انہیں کی ہاں میں ہاں ملانے لگی اور حکمت و فلسفہ، تاریخ و تمدن انہیں من گھڑت اصول پر قائم کر لئے خلاصہ ان سب کا یہ ہے کہ۔

۱۔ تمدن ہمارا۔ تہذیب ہماری۔ باقی سب وحشت اور جہالت ہے۔

۲۔ بنی نوع انسان کی گوری چٹی نسل (اہل یورپ و امریکہ) آب و ہوا کی خنکی، شکل و شمایل کی خوبی۔ رنگ و روپ کی صباحت۔ قویٰ کے جسمانی و دماغی کی توانائی اور سلیم الطبعی، عالی ہمتی، مستقل مزاجی، جدت طرازی اور مستعدی کے لحاظ سے اس قابل ہے کہ دنیا کی رہنما اور پیشوا بنے۔ بہ خلاف اس کے کالے پیلے انسان نما حیوان (اہل ایشیا و افریقہ) آب و ہوا کی گرمی، شکل و شمایل کی زبونی، رنگ و روپ کی تیرگی و زردی۔ قوائے دماغی و جسمانی کی کمزوری اور حدت ذہن، پست ہمتی، تلون۔ تقلید۔ کاہلی اور سریع الاعتقادی کے اعتبار سے اس لائق ہیں کہ اہل مغرب کے محتاج

اور دست نگر رہیں۔

۳۔ ہم (اہل یورپ) اس لئے پیدا کئے گئے ہیں کہ دنیا پر حکومت کریں۔ اور تہذیب کی روشنی پھیلائیں اور اہل مشرق کے خلق سے یہ منشا ہے کہ وہ ہمارے غلام ہو کے رہیں اور ہم سے تہذیب و انسانیت کا سبق سیکھیں۔

۴۔ اس لئے ہمارا فرض ہے کہ جہاں کہیں ہم دیکھیں کہ جہالت کی ظلمت چھا رہی ہے انصاف وعدل کا خون ہو رہا ہے یا حکومت وحشیانہ ہے وہاں ہم فوراً پہنچیں جہالت اور وحشت کا خاتمہ کر دیں۔ اور ان اصول پر حکومت کا ڈول ڈالیں جنھیں ہم بنی نوع انسان کے حق میں مفید اور بہتر سمجھتے ہیں۔

یہ اُن لوگوں کے اصول متعارفہ ہیں اور اُنہیں کو مدنظر رکھ کر بڑے بڑے مورخ اور فلسفی دنیا کی تاریخ پر نظر ڈالتے عجیب عجیب اور طرح طرح کے نتائج مستنبط کرتے اور فصاحت وبلاغت کے دریا بہا دیتے ہیں۔ بن آئے کی بات ہے۔ وہ کیا ہم خود قائل ہوتے جاتے ہیں۔ لیکن ان لن ترانیوں کو سن کر مولانا حالی کا یہ شعر خود بخود زبان پر جاری ہو جاتا ہے۔

صحرا میں کچھ بکریوں کو قصاب چراتا پھرتا تھا
دیکھ کے اس کو سارے تمہارے آگئے یاد احسان ہمیں

لیکن ایک اور لطف یہ ہے کہ اصول اصول میں فرق ہے جن حالات میں جو اصول ہم پر عائد ہوتے ہیں اور جن کی بدولت ہمیں بہت کچھ کوڑی سمجھنا

پڑتی ہے وہی حالات بعینہٖ وہی موقع اگر کسی دولت یورپ میں آن پڑے تو کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی اور سب اصول و قواعد بالائے طاق دھرے رہ جاتے ہیں کیا خوب کہا ہے اسی بالغ نظر زمانہ شناس شاعر نے

داد طلب سب غیر ہوں جب تو ان میں کسی کا پاس نہ ہو
تبلائی ہے زمانہ نے انصاف کی یہ پہچان ہمیں

غرض ہمیشہ زمانہ کا چلن اسی اصول پر رہا اور ہے کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ زبردست ہمیشہ غالب رہا اور نہ معلوم کب تک غالب رہے گا۔ جسے وہ انصاف کہے وہ انصاف ہے اور جسے وہ ظلم کہے وہ ظلم ہے۔ اور طرہ یہ کہ مارے اور رونے نہ دے۔ یہی لوگ دنیا کے رہنما اور مہذب کہلاتے ہیں اور یہی اس عالم کون و فساد کے چشم و چراغ ہیں۔ کتنے پتہ کی بات کہی ہے کسی جاپانی نے کہ "اہل جاپان نے فلسفہ و ادب میں عمدہ عمدہ کتابیں تصنیف کرکے یورپ کے سامنے پیش کیں۔ لیکن یورپ اُنہیں ناشائستہ سمجھتا رہا اس کے بعد انہوں نے رنگ برنگ کے سوتی اور اونی اور ریشمی کپڑے اور چینی کے برتن اور آرائش و ضرورت کے سامان کے دل پسند نمونے تیار کرکے مغربی تہذیب کے نقادوں کی خدمت میں روانہ کئے لیکن پھر بھی وہ کودن اور جاہل اور غیر مہذب ہی رہے۔ آخر اُنہوں نے تلوار ہاتھ میں لی اور ڈیڑھ لاکھ روسیان بدنصیبوں کا گلا کاٹ ڈالا۔ اس پر اُن کو فوراً تہذیب و شائستگی کا تمغہ مل گیا اور وہ دفعتہً مہذب اقوام کے زمرہ میں داخل ہو گئے۔

اسی برادری کے ایک تاجدار کو جو اس منحوس مرض کا سب سے بڑا مریض ہے جو اس کی بدولت اکال الامم اور ہادم الاقوام بن گیا ہے اور جس کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے تھوڑے دن ہوئے اس بیماری کا دورہ اُٹھا۔ اس کی حالت غیر ہوگئی اور آپے سے باہر ہوگیا۔ وہ اپنا لاؤ لشکر بری اور بحری دل بادل فوج لے کر سمندروں کو کھندلتا ہوا ایک چھوٹی سی چٹان سے جا بھڑا لیکن ٹکراتے ہی اُس کے جہاز پاش پاش ہوگئے۔ جوں جوں وہ غیظ و غضب میں آکر اس پر حملے کرتا تھا اُتنا ہی اور زک اٹھاتا اور جتنا کھسیانا ہو ہو کر جھپٹتا تھا اتنی ہی اور منہ کی کھاتا تھا۔ وہ شخص جس کے نام سے بڑے بڑے بادشاہ کانپ اُٹھتے تھے، جس کی نقل و حرکت کی جھوٹی افواہوں سے ایک عالم میں کھل بلی مچ جاتی تھی جس کے رعب سے سلطنتوں کی قسمتیں بدل جاتی تھیں، جس کے ایک اشارہ سے ادہر کی دنیا اُدہر ہو جاتی تھی اور جس کی چین جبیں تیغ و تفنگ سے زیادہ کارگر ہوتی تھی، جو آسمانی باپ کے مقابلہ میں دنیا کا چھوٹا باپ کہلاتا تھا، وہ ایک چھوٹی سی ریاست کے ہاتھوں یوں تابڑ توڑ شکستیں کھائے اور ذلتیں اُٹھائے، خدا کی قدرت ہے! اس نامراد مرض نے آخر اس کے غرور کو خاک میں ملا کے چھوڑا اور اس کی ہوا و ہوس نے خود اُسے نادم کیا۔ وہ شخص جس نے دنیا میں امن و امان قائم کرنے لئے سفید علم بلند کیا تھا جس نے جنگ کے مٹانے اور صلح قائم رکھنے میں ایک عالم کو صلائے عام دی تھی اور دنیا میں ستجگ کا آغاز کرنا چاہتا تھا معلوم ہوا کہ بہروپیا تھا۔ کیونکہ اُس نے محض وسوسۂ

دھوکہ دینے کے لئے اور دوسروں کے خون سے اپنی پیاس بجھانے کے لئے پانچ لاکھ بندگان خدا کا خون بہادیا اور اربوں روپئے پر پانی پھیر دیا۔ لیکن غرور کا سر نیچا۔ اس کا وہ لشکر جرار جو او کصیب من السماء فیہ ظلمات و رعد و برق آندہی اور طوفان۔ گرج اور بجلیوں کے ساتھ آیا تھا۔ دم بھر میں کافور ہوگیا۔ اور اس تاریکی کو پھاڑ کر مشرق سے وہ آفتاب طلوع ہوا ہے جس کی شعاعیں اہل ارض کے نشو ونما اور فروغ کا باعث ہو رہی ہیں۔

اوس کی شکست اس ذلت کے ساتھ اور جاپان کی فتح اس زور اور آب وتاب کے ساتھ ایک معمولی بات نہیں۔ یہ وہ انقلاب ہے جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں ڈھونڈے نہ ملیگی۔ اب زمانہ نے نیا جنم لیا ہے بہت سے پرانے اصول مٹانے پڑیں گے اور بہت سے نئے اصول بنانے پڑیں گے بہت سے پرانے سبق بہلانے پڑیں گے اور بہت سے نئے سیکھنے پڑیں گے واقعات کو اب دوسری نظر سے دیکھنا ہوگا اور اصول تمدن وتاریخ میں دائرۂ نظر اور وسیع کرنا ہوگا۔ یورپ کا غرور اور تکبر اب قایم نہیں رہ سکتا۔ اور اگر رہا تو وہ خودمٹ کے رہے گا۔ مشرق میں ایک نئی قوت پیدا ہوئی ہے جس نے کلہ بہ کلہ یورپ کے قوی ہیکل دیو سے مقابلہ کرکے اسے زیر کیا ہے اب اس سفید دیو کی لاش خون آلودہ خاک میں پڑی سسک رہی ہے وہ مرض جس کے ہاتوں یورپ لاچار تھا اور جس کے زور میں وہ بڑھ بڑھ کر قدم مار رہا تھا۔ اس کا علاج بحر اٹلانٹک کے کنارے ایک جزیرہ میں ہوا

اور پیٹ پر عمل کرنے کے بجائے ڈاکٹر مکاڈو نے مریض کی چاند پر ٹیکا لگایا۔ کیونکہ اس مرض سے دماغ میں خلل آگیا تھا اور یہ وہی قدیم مشرقی علاج ہے جو صدیوں پہلے نمرود کے سر پر کیا گیا تھا۔ جاپان جیسا جنگ میں افضل رہا ویسا ہی صلح میں بھی۔ اور جنگ اور صلح اور شجاعت اور علم دونوں کا سہرا اسی کے سر رہا۔ جس طرح اس کی بہادری اور حب الوطنی نے اہل عالم کو دنگ کر دیا تھا اس سے زیادہ اس کی فراخ حوصلگی اور صلح جوئی نے ساری دنیا کو ششدر و حیران کر دیا۔

یہ مریض کچھ تو اس کے دھچکے سے پہلے ہی ضعیف اور ناتوان ہو گیا تھا۔ ادھر اس کے گھر میں نفاق و جنگ وجدل کا طوفان بپا ہو گیا۔ چھوٹے باپ کے سعادت مند فرزندوں نے علم مخالفت بلند کر رکھا ہے۔ سارے ملک میں کشت وخون کا بازار گرم ہے۔ وہ جبر و تعدی اور ظلم و ستم سہتے سہتے تنگ آ گئے ہیں۔ اس لئے انہوں نے اس بات پر کمر باندھ لی ہے کہ یا تو آزادی حاصل کریں یا جان دے دیں۔ زار ہے کہ سہا جاتا ہے اور آئے دن نئی بلا اور مصیبت کا سامنا ہے۔ رعایا۔ بغاوت پر تلی ہوئی ہے چھوٹے بڑے سب آزادی آزادی پکار رہے ہیں۔ زار اور اس کے وزیر بے کس اور بے بس ہیں۔ ہزار وعدہ کرتے ہیں مگر یقین کسے آئے، ان کی نالائقی اور جابرانہ سلوک نے انہیں اس قابل نہ رکھا کہ ان کی بات باور کریں۔ فوج اور پولیس ہزار روکتی اور تھامتی اور گولیوں کا نشانہ کرتی ہے مگر وہ مادہ جو لاوے کی طرح زمین سے ابل رہا ہے چند قزاقوں کی ہائیں

اور چند قرابینوں کی ٹھائیں ٹھائیں سے کہیں رکتا ہے ؟ لیکن باوجود اس شریف مقصد کے جس کے پیچھے وہ جان و مال قربان کر رہے ہیں ۔ انہوں نے اس عزت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا جو بہ حیثیت یورپین ہونے کے انہیں حاصل ہے یعنی ظالم گورنمنٹ کی مخالفت کرتے کرتے وہ اپنا ریخ دغصہ ایک بے کس مشرقی قوم پر نکال رہے ہیں ۔ غریب یہودی چن چن کے قتل کئے جا رہے ہیں ۔ ان کے گھر بار لٹ گئے ۔ سینکڑوں بچے یتیم اور عورتیں بیوہ ہو گئیں خاندان کے خاندان تباہ و برباد ہو گئے ۔ عراقی پر بس نہ چلا گدھے کے کان اینٹھے ۔ گورنمنٹ کا وہ حال رعایا کی یہ کیفیت ۔ اب اس ظالم مظلوم نما مریض یعنی زار روس کو سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ اپنی خون خواری سے باز آئے ۔ ظلم و تعدی کے زمانے کو خیرباد کہے ۔ اپنے جابرانہ اختیارات سے ہاتھ دھو بیٹھے ۔ امن و صلح کا اعلان کرے ۔ رعایا کو واجبی حقوق اور آزادی عطا کرے ۔ ہاتھ کو روکے دل کو قابو میں رکھے اور اُس بری گھڑی کو یاد کر کے پچھتائے جب جاپان پر دست درازی کا قصد کیا تھا ۔

مگر اے بد نصیب ملک تجھے بھی کچھ خبر ہے ؟ خدا کی خدائی بدل گئی زمین و آسمان بدل گیا ۔ اصول و آئین بدل گئے اور تو ہے کہ ویسا ہی سکون پسند اور لدھڑ نظر آتا ہے جیسا پہلے تھا ۔ گو تجھ میں بھی ایک سرسری سی پیدا ہو چکی ہے مگر کہاں یہ خفیف سی جنبش اور کہاں وہ قیامت کی حرکت کہ جس سے لاکھوں کے وارے نیارے ہو گئے ۔ ممالک میں تہلکہ پڑ گیا ۔ سلطنتوں کی پالیسیاں بدل گئیں ۔ تعلقات میں فرق آ گیا ۔ حکومت کا رُخ

پھر گیا۔ مغرب مشرق اور مشرق مغرب بن گیا۔ جو آگے تھے وہ پیچھے ہٹ گئے اور جو پیچھے تھے وہ آگے بڑھ گئے اور ایسے بڑھے کہ زمین سے آسمان پر پہنچ گئے۔ جہاں وہ شجاعت اور شہرت کے ستارے بن کر جگمگا رہے ہیں اور اپنی نورانی شعاعوں سے اوروں کو بھی منور کر رہے ہیں۔ اس کا ذکر خیر تیرے ہاں بھی ہے اور چرچے بھی بہت کچھ ہو رہے ہیں۔ لیکن خالی باتوں سے کیا حاصل۔ لڈو کہنے سے کہیں منہ میٹھا ہوتا ہے؟ تجھ میں جوش نہیں تیرا دل بجھا ہوا اور مُردہ ہے۔ اور جوش ہو کہاں سے؟ اس لئے کہ تجھ میں حب وطن نہیں اور اس کے لئے ضرورت ہے تحریک کی اور تحریک بھی کیسی؟ جو برقی قوت کی طرح جوڑ جوڑ بند بند ریشے ریشے میں حرکت پیدا کر دے۔

ہمارے خیال میں کوئی تحریک اوس عجیب وغریب اور حیرت انگیز واقعہ سے بڑھ کر نہیں ہو سکتی جو ہمارے پڑوس میں جو ایک چھوٹے سے جزیرہ والوں سے ظہور میں آیا ہے۔ یہ ہماری عین خوش قسمتی ہے کہ ایک ایسا انقلاب انگیز واقعہ ہماری زندگی میں واقع ہوا۔ جس کے طفیل ہم اپنے دماغ میں اس خیال کے لانے اور اپنی زبان سے یہ الفاظ کہنے کے قابل ہو سکتے ہیں کہ "جب ہمارے بھائی بند اتنا کچھ کر سکتے ہیں تو اگر ہم دل پر رکھ لیں تو کیا کچھ بھی نہیں کر سکتے؟

مگر اے ہندوستان اہل تجھ میں جوش اور حرکت پیدا کرنے کے لئے کیا کیا جائے؟

کیا وہ خونخوار اور ہیبت ناک جنگ روس وجاپان تیری آنکھوں کے سامنے پانی پت کے میدان پر پھر قائم کی جائے؟ کیا اون بہادر محب الوطنوں کے

سینوں میں سے دل نکال کر تیرے سامنے لائے جائیں کہ دیکھ اپنے ملک کی محبت میں یہ کیسے پھڑک رہے ہیں۔ یہ سب وہم و گمان ہے ہاں البتہ ایک تدبیر ممکن ہے۔ ادب نے دنیا میں بڑے بڑے کام کئے ہیں۔ ہنستوں کو رلانا اور روتوں کو ہنسا دینا دشمن کو دوست دوست کو دشمن بنانا اس کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔ بگڑی بات کا سنوارنا اور صاف سیدھی بات کا بگاڑ دینا اس کا ایک کھیل ہے۔ ایک ذرا سی بات میں ہزاروں کا سر کٹوا دینا اور لاکھوں کا خون بہا دینا اور ایک کلمہ میں پشتینی مخالفوں اور جانی دشمنوں کی جھٹ پٹ صلح کرا دینا اس کے لئے کوئی بات ہی نہیں۔ وہ تلواروں کا مقابلہ زبان سے اور تیروں کا مقابلہ قلم سے کرتا ہے۔ اور اپنے زور سے جدھر چاہتا ہے دنیا کو کھینچ لے جاتا ہے۔ لیکن اس میں بھی قسمیں ہیں اور درجے۔ نظم ہے۔ نثر ہے اور ان کی بھی بیسیوں قسمیں۔ اور اس پر اپنی اپنی طبیعت اور اپنا اپنا دماغ۔ لیکن ان سب میں موثر اور کارگر اگر کوئی ہے تو ڈراما ہے۔ جو دنیا کی مختلف حالتوں اور انسان کی مختلف کیفیتوں کو اس خوبی سے دکھاتا ہے کہ نقل میں اصل کا مزہ آجاتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اصل میں وہ مزہ نہیں آتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان بالطبع نقل کرنے اور نقل دیکھنے سے خوش ہوتا ہے۔ مثلاً وہی شئی یا بات جو روزانہ دیکھنے یا سننے میں آتی ہے جب ہم کسی تھیٹر میں اس کی نقل ہوتے دیکھتے ہیں تو جتنی وہ اصل کے مطابق ہوتی ہے اسی قدر اس میں لطف آتا ہے۔ غرض رنج و الم۔ عیش و عشرت۔ نکبت و اقبال۔ کمال و زوال سب کی تصویریں سامنے کھنچ جاتی ہیں۔ اور یہ معلوم

ہوتا ہے کہ درحقیقت یہ واقعات ہمارے سامنے گزر رہے ہیں۔ جو لوگ ڈراما کے کرنے والے ہیں اون کی حالت صورت، بول چال، لباس سب کے سب ایک عجیب کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ جن باتوں کو ہم اپنی زبان یا صرف قلم اور فصاحت کے زور سے بار بار جتانا چاہتے ہیں وہ سب مرحلے ڈراما کے ایک ایکٹ میں طے ہو جاتے ہیں۔ جہاں انسان کی اور تمام قوتیں قاصر ہیں وہاں اس کا جلوہ برقی لہر کا کام کرتا ہے۔ عالم، جاہل، بچے بوڑھے سب پر اس کا اثر جادو کا سا ہوتا ہے۔ نصیحت بہت ناگوار اور تلخ ہوتی ہے لیکن یہاں آکر ایسی شیریں اور پُر لطف ہو جاتی ہے کہ جو اس سے بھاگتے تھے وہ خوشی خوشی اس کے سننے کے لئے دوڑے آتے ہیں۔ کوئی واعظ کوئی فصیح مقرر یا لکچرار اپنے کلام اور فصاحت سے اتنا اثر نہیں ڈال سکتا جتنا ڈرامے کے چند ایکٹ۔ خصوصاً جب واقعات ایسے حیرت افزا اور جوش انگیز ہوں جن سے قوموں کی قوموں میں انقلاب پیدا ہو گیا ہو۔ خیالات کی ترتیب بدل گئی ہو اور سونے میں سہاگہ یہ کہ ان واقعات کا لکھنے والا ایسا ہو جس کے قلم میں زور اور تاثیر ہے اور جسے نظم و نثر میں یکساں کمال ہے۔

اس ڈرامے میں اقبال و ادبار کی سچی تصویریں کھینچی ہیں ایک طرف حب وطن، شجاعت جوش اور غیرت کا زور ہے اور دوسری طرف غرور و تکبر، لاف و گزاف، ذلت و نکبت کے آثار ہیں۔ غرض جنگ کی ابتدا سے انتہا تک سارے واقعات ڈرامے کے پردہ میں اس خوبی اور بے تکلفی اور پُر زور اور پُر جوش نظم و نثر میں تحریر کئے گئے ہیں کہ ممکن نہیں کہ آدمی پڑھے

اور اس کے دل میں جوش اور غیرت موج زن نہ ہو۔ محبت جو حقیقی زندگی میں بھی اسی طرح جلوہ فگن ہوتی ہے جیسے فسانوں اور ڈراموں میں، وہ اس خوں ریز جنگ و جدل اور کشت و خون میں بھی عجیب طرح سے اپنی جھلکی دکھا گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کا قلب ہی بجائے خود ایک عالم ہے جس میں ہزاروں کیفیات اور جذبات بستے ہیں۔ اور ایک ذرا سے اشارہ پر اپنا کرشمہ دکھا جاتے ہیں۔ کیسا پُر زور ہونا چاہیئے وہ قلم جو ان تمام کیفیات کو اس طرح بیان کرے کہ تصنع کا نام نہ ہو۔

مولوی ظفر علی خاں صاحب نے جنگ و جدل، معرکہ آرائی، شجاعت و تہور خدعتہ و تدبیر، گھمسان خوں ریزی، حسن و عشق کی گھاتیں، حریفوں کی چالیں، شکست و فتح، صلح و امن ان سب کارناموں کا ایسا صحیح خاکہ کھینچا ہے کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا ہم خود اس میں شریک ہیں۔ علاوہ اس کے یہ اردو میں ایک بے نظیر اور انوکھی تصنیف ہے۔ مصنف نے ملک پر بڑا احسان کیا ہے کہ اس نے ایک ایسی چیز پیش کی ہے جس کی ملک کو ایسے وقت میں سخت ضرورت تھی۔ اس سے ہمیں عبرت اور سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ ایک چھوٹی سی قوم بہت تھوڑے عرصہ میں ایسی ترقی کرلے کہ بڑے بڑے ترقی یافتہ اقوام دیکھتی کی دیکھتی رہ جائیں ایک پِدّا شہباز کا شکار کرے ایک پودنا دیو کو پچھاڑے ممکن ہے کہ یہ سب کچھ پڑھ جائیں اور ترقی کا خیال پیدا نہ ہو؟ ہمیں جنگ کی ضرورت نہیں، جہاد کی حاجت نہیں، ہاں ہے تو جہاد اکبر کی ضرورت ہے۔ دیو نفس کو پچھاڑیں اس کے کھوٹ چن چن کے نکالیں۔ خود غرضی، نفاق اور سستی،

وکاہلی کو پاس نہ آنے دیں اور ایک ایسی سلطنت کے زیر عاطفت جس سے بڑھ کر امن جو، صلح پسند اور ہمدرد اس زمانہ میں ملنا ناممکن ہے، ترقی کی راہیں نکالیں، زمانہ کی رفتار کو سمجھیں اور اس بام رفعت پر چڑھنے کی کوشش کریں جہاں پہنچے بغیر ممتاز ہونا محال ہے کیا ممکن نہیں کہ وہ ملک جو ہمیشہ سے علوم وفنون اور صنعت وحرفت میں مشہور اور ضرب المثل ہے ہماری کوشش اور اتحاد سے اپنی قدیم عزت اور عظمت کو پھر حاصل کر لے؟ ممکن ہے مگر کب؟ جب ہم میں دل ہو، دل میں عزت، ہمت اور جوش ہو اور جوش میں قیام اور ثبات ہو۔

گر یہ نہیں تو بابا وہ سب کہانیاں ہیں

حیدرآباد دکن
۱۵ نومبر ۱۹۰۵ء

سوانح

حیات النذیر

گلشن ہند

مآثر الکرام

مخزن نکات

چمنستان شعرا

مقدمہ حیات النذیر

مؤلفہ مولوی سید افتخار عالم صاحب مارہروی مرحوم

یہ بھی اُردو علم ادب کی ترقی کی علامت ہے کہ مشاہیر ملک وملت کے حالات پر بھی بہت سی اچھی اچھی کتابیں لکھی گئی ہیں اور لکھی جارہی ہیں اب تک زیادہ تر اُن قدما کے حالات لکھے گئے ہیں جو بلحاظ تقدس ودیگر کارہائے نمایاں پہلے ہی سے ہیرو سمجھے جاتے ہیں اور جن کے سوانح قدیم عربی کتب میں جا بجا پائے جاتے ہیں یا اون کے متعلق مستقل کتابیں موجود ہیں اور اون کی عزت ووقعت صدہا سال سے ہمارے دلوں میں گھر کر چکی ہے۔ ان مؤلفین کو یہ آسانی ہوتی ہے کہ مواد تیار ملتا ہے البتہ مختلف کتابوں سے حالات جمع کرنے اور ترتیب میں اول بدل کرکے اردو زبان میں پیش کرنے کی زحمت ضرور گوارا کرنی پڑتی ہے۔ اگر ان کتابوں کی ترتیب عمدہ اور زبان فصیح ہوتی ہے تو ان کا مقبول ہونا کچھ مشکل نہیں ہوتا کیونکہ وہ لوگ پہلے ہی سے مقبول خاص وعام ہیں۔ مگر ہمعصر مشاہیر کے حالات کا لکھنا اس کے مقابلہ میں بہت کٹھن ہے اولی تو تمام حالات کا جمع کرنا اور مختلف واقعات اور بیانات کی چھان بین کے

بعد کیرکٹر کی صحیح تصویر کھینچنا ہی ایک ایسی دشواری ہے جسے اُسی کا جی جانتا ہے
جسکو کبھی اس قسم کے کام کرنے کا تجربہ ہوا ہے، دوسرے صدہا شخص ایسے
زندہ موجود ہیں جو اُس نامور شخص کے خیالات سے آگاہ ہیں اور اُنہوں نے
اس کو مختلف حالات میں دیکھا ہے اور اس کے متعلق خاص رائے رکھتے
ہیں۔ سوانح نگار جانتا ہے کہ اوسکی کتاب موافق و مخالف ہر دو گروہ کے
ہاتھ میں جانے والی ہے اور اس لئے طعن و تشنیع کی زد سے بچنے کے لئے
بڑی احتیاط کرنی پڑتی ہے۔ مؤلف حیات النذیر نے ہماری قوم کے ایک
علامہ کا قول نقل کرکے آجکل کے طریقہ تحریر سوانح عمری کو "پُر فریب" بتایا ہے
اور اوس پر پُر زور بحث کی ہے لیکن میں پوچھتا ہوں کہ وہ کون ایسا زمانہ تھا
جبکہ یہ پُر فریب طریقہ رائج نہ تھا۔ علامہ موصوف کو کبھی کسی ہمعصر نامور شخص
کی (بشرطیکہ وہ کسی ہمعصر کو اس قابل سمجھیں) سوانح عمری لکھنے کا اتفاق
نہیں ہوا ورنہ انہیں اس سے زیادہ دشواری پیش آتی جو ہماری زبان
میں بہتر سے بہتر "سوانح عمری" لکھنے والے کو پیش آئی ہے۔ اُنہوں نے
اب تک انہیں قدمائے کرام کے حالات پر قلم اٹھایا ہے جنہیں لوگ ایک
زمانہ سے پوجتے آتے ہیں اور جنکی تنقید اور نکتہ چینی کتب کے حوالہ تک
محدود ہے۔ تاہم (بے ادبی معاف) کیا علامہ موصوف کی تالیفات اس
"پُر فریب طریقہ" سے پاک صاف ہیں۔

بات یہ ہے کہ بڑے آدمی کی بڑائی صرف اوسکی ذات تک محدود
نہیں ہوتی بلکہ اس کے تعلقات، گردوپیش کے حالات اور قومی و ملکی معاملات

سے تانے بانے کی طرح جکڑے ہوئے ہوتے ہیں کہ اوسکی ذات کو اُن سے
جدا کرنا قریب قریب ناممکن کے ہوتا ہے، ورنہ بڑا آدمی کچھ بڑا نہیں رہتا
اسلیئے سوانح نگار کے فرائض میں داخل ہے کہ وہ اس شخص کے کیریکٹر کو
ان تمام گردوپیش کے واقعات وحالات کی روشنی میں دکھائے۔ اس سے
کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ اختلاف رائے ہر زمانہ میں اور ہر ملک میں ہوتا ہے
اور علاوہ اس کے ہمعصر مشاہیر کے متعلق بعض غلط فہمیاں عام طور پر
پھیل جاتی ہیں سوانح نگار کا فرض ہے کہ وہ ان غلط فہمیوں اور غلط
بیانیوں کو صحیح اور سچے واقعات اور اوس کے وسیع تعلقات اور اصلی
خیالات کے اظہار سے جن پر عام لوگوں کو آگاہی نہیں ہوتی رفع کرے
اور اپنی رائے اور صحیح قیاس کے اظہار سے دریغ نہ کرے اور محض
مخالفوں کے ڈر سے یا اون کی خوشی کے لیئے عامیانہ مقبولیت حاصل کرنے
کی خاطر پہلو نہ بچائے۔ انصاف پسند لوگ سوانح نگار کی اس محنت کی داد دینگے
اور اوس کے ممنون ہونگے۔ اگرچہ بدبیں لوگوں کو اس سے تکلیف ضرور ہوگی
نرے خالی خولی ذاتی حالات کا بیان کر دینا کافی نہیں ہے۔ اور کوئی سوانح
نگار اس طور پر اپنے فرض سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ جس قدر جو شخص بڑا ہوگا
اسی قدر سوانح نگار کو اپنی رائے اور قیاس سے زیادہ کام لینا پڑے گا۔
وسعت تعلقات سے اصل حقیقت کے سمجھنے میں نہ صرف الجھن پیدا ہوتی ہے
بلکہ غلطی واقع ہو جاتی ہے اور اس لئے یہ ضروری ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ گرد
وپیش کے حالات کا اثر اُس پر اور اوس کا اثر اون حالات پر کیا پڑا۔ قطع نظر

غلطی وصحت کے اس کی نیت کا اندازہ کرنا پڑیگا اسکے اصلی اور اندرونی خیالات کو دیکھنا پڑیگا اس کے برتاؤ اس کے طرزِ کلام وطرزِ تحریر اس کی عام روش اور رجحان کی تلاش کرنا پڑیگی غرض سوانح نگار اس تمام چھان بین ہمہ کرید، جستجو وتلاش کے بعد صحیح قیاس اور رائے قائم کرسکیگا اور اور اس سے اس کی اپنی نیز اور لوگوں کی بہت سی غلط فہمیاں رفع ہو جائینگی۔ اگر سوانح نگار ایسا شخص ہو جو اس بڑے شخص کی خوبیوں کا قدرداں نہیں تو کیا وہ اس اہم فرض کو ادا کرسکتا ہے ؟ مثلاً اگر وہی کتاب جسے علامۂ موصوف نے ہماری زبان میں بہتر سے بہتر سوانح عمری فرمایا ہے خود اُن کو لکھنے کے لئے دی جاتی ہے تو ناظرین سمجھ سکتے ہیں کہ وہ کیسا ہوتی۔

یہ بحث ممکن ہے کہ بعض حضرات کو گراں گزرے لیکن اس موقع پر مجھے اس کی ضرورت اس لئے پڑی کہ مولوی افتخار عالم صاحب نے ہمارے زمانہ کے ایک ایسے نامور شخص کی سوانح عمری لکھی ہے جن کے مخالف بھی بہت سے لوگ موجود ہیں اور جن کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں بھی خاص وعام میں پھیلی ہوئی ہیں میں نہایت مسرت کے ساتھ اس امر کا اعتراف کرتا ہوں کہ مولف حیاۃ النذیر نے اس اہم فرض کو بڑی خوبی کے ساتھ انجام دیا ہے اور ممکن ہے کہ بعض کٹ حجت لوگ اون کے تصفیہ کو تسلیم نہ کریں لیکن جب وہ بھی ٹھنڈے دل سے غور کریں گے تو کم سے کم اپنی رائے میں جھوجھر سے ضرور ہو جائیں گے۔

شمس العلماء ڈاکٹر مولانا نذیر احمد مرحوم ہماری قوم میں ایک ایسے فرد بے نظیر گزرے ہیں کہ وہ ہمیشہ یاد رہیں گے اور کم سے کم جب تک اُردو زبان زندہ ہے اُن کا نام بلاشبہ زندہ رہے گا۔ وہ محض اپنی محنت و استقلال اور قابلیت سے دنیا میں بڑھے اور ایک معمولی غریب شخص سے امیر اور ایک ادنی طالب علم سے اعلیٰ درجہ کے فاضل ہو گئے ان کی زندگی سیلف ہلپ (اپنی مدد سے آپ بڑھنے) کی ایک نمایاں اور روشن مثال ہے اُنہوں نے معلمی سے زندگی شروع کی اور آخر عمر تک معلم رہے اُن کی تعلیم ان کی تصانیف کے صفحات میں موجود ہے۔ ان کا بڑا کام اصلاح معاشرت (سوشل ریفارم) ہے یعنی یہ کہ دنیا میں خوش کامیاب اور بے لوث زندگی کیونکر بسر کرنی چاہیئے۔ ایک بڑا کمال ان کی تصانیف میں یہ ہے کہ انہوں نے اسلامی سوسائیٹی اور خاص کر اسلامی خاندان کی اندرونی معاشرت کی تصویر ایسی سچی اور بے لاگ کھینچی ہے کہ آنکھوں کے سامنے نقشہ پھر جاتا ہے اور ایک مسلمان پڑھنے والے کو رہ رہ کر شُبہ ہوتا ہے کہ کہیں اسی کے خاندان کے پتر سے تو نہیں کہہ رہے ہیں۔ خدا کے فضل سے اُردو میں ایسے ایسے باکمال انشاء پرداز ہوئے اور اب بھی زندہ موجود ہیں جو اردو زبان اور اپنی قوم کے لئے باعث فخر ہیں مثلاً کسی نے تاریخی واقعات کی چھان بین کر کے عجیب حالات کا انکشاف کیا ہے کسی نے دربار شاہی کی شان و شوکت یا جنگ کے خونریز منظر کا مرقع کھینچا ہے کسی نے قوم کے گذشتہ جاہ و جلال پر فصاحت کے دریا بہائے

ہیں کسی نے قومی ادبار و ذلت پر پُر درد نوحہ پڑھا ہے، لیکن روزمرہ کے معمولی واقعات جو صبح شام ہماری آنکھوں کے سامنے ہمارے گھروں میں اندر باہر واقع ہوتے رہتے ہیں انکا بیان کرنا مولانا مرحوم پر ختم ہے اور بیان بھی کیسا! ایسا پر لطف ایسا سچا اور سلجھا ہوا کہ دل میں کھب جائے اور پڑھنے کے ساتھ ہی آنکھوں کے سامنے جیتی جاگتی چلتی پھرتی تصویریں آجائیں۔ ایک وسیع اور عظیم الشان منظر کی تصویر کھینچنا جس میں پہاڑ بھی ہوں صحرا بھی ہو دریا بھی ہو آسان ہے لیکن انسانی خصائل یا کسی ادائے خاص کی تصویر کھینچنا بہت مشکل ہے۔ یہاں صرف اوپری نظر جو بیرونی اشارات تک محدود ہو کافی نہیں بلکہ اُسے عکس ریز (ایکس ریز) کی طرح جسم کے اندر گھس کر دلوں کو بھی ٹٹولنا پڑتا ہے اور مولانا میں یہ قوت بدرجۂ کمال موجود تھی۔

مولانا کا احسان تعلیم نسواں پر بھی کچھ کم نہیں بلکہ میرے خیال میں حامیانِ تعلیم نسواں کی تقریروں، لکچروں، تحریروں اور قیام مدارس سے کہیں بڑھکر ہے۔ ان لوگوں نے پڑھنے کی ترغیب دی اور اس کے وسائل بہم پہونچائے مگر مولانا نے لڑکیوں کو پڑھنا سکھایا اور یہی نہیں بلکہ پڑھنے میں جو ایک مزہ ہے وہ دلوں میں پیدا کیا۔ مرحوم اگر سوائے مراۃ العروس کے کوئی دوسری کتاب نہ لکھتے تو بھی وہ اُردو کے باکمال انشاء پرداز مانے جاتے اور اُن کی حیات جاودانی کے لیے صرف یہی ایک کتاب کافی ہوتی۔ ایک بڑی خوبی اسمیں (اور اون کی دوسری کتابوں

میں بھی) یہ ہے کہ عورتوں کی زبان اور اون کے خیالات کو ہو بہو اس خوبی سے
ادا کیا ہے کہ خود عورتیں قائل ہو جاتی ہیں)۔ یہ بات سوائے مرحوم کے
اردو کے کسی دوسرے مصنف کو حاصل نہیں۔

مولانا اپنی طرز تحریر کے آپ موجد تھے اور یہ انہیں کی ذات
سے مخصوص ہے اس میں بڑی بے تکلفی اور بے ساختہ پن پایا جاتا ہے۔ انشا پرداز
کو بڑی دقت یہ ہوتی ہے کہ جو خیال اوس کے دل میں آیا ہے اُسے
اُسی قوت اور شان کے ساتھ الفاظ میں ادا کرے اور اسی لئے اُسے
اکثر اوقات تشبیہ و استعارات سے کام لینا پڑتا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے
کہ مولانا کو کبھی ایسی دقت محسوس نہیں ہوئی وہ کبھی تشبیہ و استعارات سے
کام نہیں لیتے اور ایسے ٹھیٹ جاندار اور چپیاں الفاظ استعمال کرتے ہیں
کہ اُن سے بہتر اس خیال کے اظہار کے لئے سمجھ میں نہیں آتے۔ زبان
پر انہیں اسقدر قدرت حاصل تھی کہ شاید آج تک کسی اردو انشا پرداز
کو نصیب نہیں ہوئی اور یہی وجہ ہے کہ ان کا خیال کبھی تشنہ نہیں رہتا۔
آمد کی یہ کیفیت ہے کہ ایک دریا ہے کہ اُمڈا چلا آتا ہے ان کی طبیعت قدرتی
طور پر پُرزور واقع ہوئی تھی اور یہی زور اُن کے تمام خیالات اور الفاظ میں ہے
جو قوت اور زور ہمنے اُن کی عبارت میں دیکھا ہے وہ کہیں دوسری جگہ
نظر نہیں آتا۔ اُنہیں اس بات کی ضرورت ہی نہیں پڑتی کہ ہیر پھیر یا
تشبیہات و استعارات سے اپنا مافی الضمیر ادا کریں وہ اسی زبان میں سے
جسے ہم روزمرہ بولتے اور لکھتے پڑھتے ہیں ایسے الفاظ نکال لاتے تھے کہ

گویا وہ اسی خیال کے ادا کرنے کے لئے بنے ہیں اور پھر اس پر ظرافت سونے میں سہاگے کا کام دیتی ہے۔ اُن پر یہ اعتراض کیا گیا ہے اور وہ ایک حد تک بجا اور صحیح بھی ہے کہ وہ بعض اوقات رکیک اور مبتذل الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اس کی وجہ ایک تو وہی ہے جو میں ابھی بیان کر چکا ہوں یعنی وہ ہیر پھیر اور تشبیہات و استعارات سے کام لینا نہیں جانتے تھے دوسرے طبیعت قدرتاً واقع ہوئی تھی پُر زور وہ اپنے خیال کو اسی زور اور شان کے ساتھ ادا کرنے کے لئے الفاظ کی پرواہ نہیں کرتے تھے جن الفاظ میں ان کا اصلی خیال صحیح طور سے ادا ہو سکتا اُن کے استعمال میں کبھی نہ چوکتے تھے اور یہ فعل ان کا کوئی ارادی نہ تھا بلکہ طبیعت کی افتاد ہی ایسی تھی اور اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی طبیعت میں آورد نہ تھی بلکہ سراسر آمد تھی علاوہ اس کے آدمی تھے صاف گو اور آزاد رو، جو دل میں تھا وہ زبان پر اور اس پر شوخی و ظرافت اور غضب تھی یہی وجوہ ہیں کہ ان کی ایک کتاب پر اسقدر شور و غل مچا۔

مرحوم جیسے اعلیٰ درجہ کے محرر تھے ویسے ہی مقرر بھی تھے لوگ ان کے لکچروں میں اس طرح ٹوٹے پڑتے تھے جیسے قحط کے مارے کھانے پر گرتے ہیں ہم نے انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں خود دیکھا ہے کہ گرمی کے دن ہیں دوپہر کا وقت ہے ہزاروں بندگان خدا دھوپ میں بیٹھے ہیں مگر کیا مجال کہ پہلو تک بدلیں۔ کلام میں تاثیر بھی وہ تھی کہ جب چاہا ہنسا دیا اور جب چاہا رلا دیا۔ آواز بھی ایسی ملی تھی کہ سب جگہ یکساں پہونچتی تھی

اور اس میں ایک خدا داد اثر تھا۔ شوخی و ظرافت خاص کر اون کے لکچروں میں دیکھنے اور سننے کے قابل تھی۔ ایسا اعلیٰ درجہ کا مقرر ہمارے ملک میں پیدا نہیں ہوا وہ ساری مجلس پر چھا جاتے تھے اور حاضرین مجلس کی یہ حالت تھی جیسے کسی نے سحر کر دیا ہو۔ مسٹر ماریسن کی جو رائے مؤلف نے لکھی ہے وہ بالکل صحیح اور بے مبالغہ ہے۔ انجمن حمایت اسلام، آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس، مدرسہ طبیہ دہلی ہمیشہ اون کے لکچروں کے شرمندہ احسان رہیں گے۔ ان کے لکچروں کے متعلق یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ کہیں سے کہیں چلے جاتے تھے یہ اعتراض شاید کسی حد تک صحیح ہے لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ جیسی اُن کی طبیعت ان کی تحریر ان کی عبارت ان کے الفاظ اور اُن کی تقریر پُر زور تھی ویسے ہی ان کا خیال بھی پُر زور تھا اور تخیل کے پرواز میں دور تک پہونچتے جاتے تھے لیکن اتنی دور نہیں کہ نظر سے غائب ہو جائیں جولانی طبع انہیں ادہر سے ادہر ضرور لے جاتی تھی لیکن تاہم مبحث کے آس پاس ہی رہتے تھے۔

ہمارے اس زمانے کے اہل قلم سوائے ایک دو کے زیادہ تر ترجمان ہیں، انگریزی کے یا عربی کے۔ مگر مرحوم میں جدت پائی جاتی ہے اور وہ اپنے خیالات اور تحریرات کے لئے کسی دوسرے کے محتاج نہیں ہیں اور یہ اُن کی اعلیٰ دماغی کی بہت بڑی دلیل ہے ان کی اصل تصانیف اُن کی جدت طرازی اون کے پر زور تخیل اور مشاہدہ کے نتائج ہیں وہ نقل نہیں ہیں بلکہ اصل ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ انوکھی اور دلا ویز

ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ مقبول خاص وعام ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ جو لوگ اُردو سیکھنا اور اپنے خیالات انگریزی نما اُردو میں نہیں بلکہ ٹھیٹ اردو میں ادا کرنا چاہتے ہیں اون کے لئے مولانا کی تصانیف کا مطالعہ ازبس ضروری اور مفید ہے کیونکہ اپنے خیال یا مافی الضمیر کی صحیح تصویر الفاظ میں کھینچنا ان پر ختم ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ان کا پورا پورا تتبع کریں کیونکہ یہ نہ صرف مشکل ہے بلکہ شاید مفید بھی نہو لیکن اس میں کچھ شبہ نہیں کہ ہم ان کی تصانیف کے مطالعہ سے بہت کچھ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔

اس جدید زمانے میں مسلمانوں میں جتنے سربرآوردہ لوگ ہوئے ہیں خواہ وہ کسی خیال اور کسی رنگ کے ہوں سرسید سے لیکر شمس العلماء مولانا شبلی تک (باستثناء شمس العلما مولوی محمد ذکاءاللہ مرحوم) سب میں زیادہ تر دینی لگاؤ تھا اون کی تان دین ہی پر ٹوٹتی ہے اور یہی اون کے خیالات اور اعمال کا مرکز ہے۔ مولانا نذیر احمد مرحوم کا بھی یہی حال تھا گو ان کی اکثر تصانیف میں یہ لگاؤ نظر آتا ہے لیکن اُنھوں نے خاص خاص کتابیں مثلاً رویائے صادقہ، اجتہاد، الحقوق والفرائض، امہات الامہ لکھکر اور خاص کر ترجمہ قرآن مجید سے ایسی عظیم الشان دینی خدمت ادا کی کہ مسلمان ان کے اس احسان کو کبھی نہیں بھول سکتے۔ ان کی دینی خدمت کے متعلق یہاں زیادہ بحث کرنا نہیں چاہتا مولفِ حیاۃ النذیر اسپر خوب دل کھول کے لکھ چکے ہیں۔ لیکن ترجمہ قرآن مجید کے متعلق چند الفاظ لکھے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس ترجمہ کی تمام خوبیوں کا گنوانا تو میری

طاقت سے باہر ہے لیکن اس سے بڑھکر اور کیا خوبی ہوگی کہ ہزار ہا مسلمان جو اب تک قرآن پاک کے سمجھنے سے قاصر تھے اب بلا تکلف قرآن کے مطالب سمجھنے لگے اور خدا کے احکام خود اسی کے کلام کے ذریعہ سے جاننے لگے اردو ترجمے اس سے پہلے بھی موجود تھے لیکن ترجمے کیا تھے الفاظ کے گورکھ دھندے تھے خاک سمجھ میں نہیں آتے تھے اور سمجھ میں آئیں تو کیونکر؟ مکھی پر مکھی ماردی تھی اور جو طبیعت پر زور دے کر کچھ سمجھے بھی تو وہ لطف فصاحت کہاں جس کے لئے قرآن سارے عالم میں مشہور ہے۔ قرآن پاک کا یہ پہلا اردو ترجمہ ہے جس میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ علاوہ زبان کی سلاست اور فصاحت کے جہاں تک ممکن ہو اصل عربی کا زور اور اس کی شان قایم رہے۔ مولانا چونکہ عربی اور اُردو کے بےمثل ادیب تھے اور زبان کا خاص ذوق تھا اس لئے ترجمے میں وہ ساری خوبیاں موجود ہیں جو ہونی چاہئیں مسلسل پڑھتے جائیے سارے مطالب سمجھ میں آتے جاتے ہیں اور فصاحت اور ادبیت کا لطف ایسا کہ چھوڑنے کو جی نہ چاہے۔ اس سے بڑھکر اور دینی خدمت کیا ہوگی اور یہ صرف دینی ہی خدمت نہیں بلکہ اُردو ادب کی بھی ایک بہت بڑی خدمت ہے اب تک بعض لوگ اس بات پر اڑے ہوئے ہیں کہ مولانا شاہ عبدالقادر کا ترجمہ سب ترجموں سے افضل ہے اور مرحوم کا ترجمہ اس سے لگا نہیں کھاتا۔ اس میں اب بحث کی ضرورت نہیں ہے عام مقبولیت نے ثابت کردیا ہے کہ مرحوم کا ترجمہ ایسا مطلب خیز فصیح اور شگفتہ ہے کہ موجودہ ترجموں میں کوئی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا

ایک بات میں البتہ شاہ صاحبؒ کے ترجمہ کو فضیلت ہے اور یہ فضیلت غالباً اُسے ہمیشہ رہے گی وہ یہ ہے کہ بعض بعض مقامات پر عربی الفاظ کا ترجمہ اونھوں نے ایسے ٹھیٹ ہندی الفاظ میں کیا ہے کہ اس سے بہتر نہیں سکتا خصوصاً جہاں کہیں ایسے الفاظ آگئے ہیں کہ ان میں اشتراک معانی کی بحث آپڑی ہے تو اونھوں نے ہندی کے بھی ایسے ہی لفظ چن کر رکھے ہیں کہ اون میں بھی اشتراک کا وہی لطف باقی رہتا ہے اور یہ ان کی کمال ادبیت کی دلیل ہے۔ مگر اس کا لطف صرف ادیب ہی حاصل کرسکتے ہیں مطالب قرآن سے اسے کچھ تعلق نہیں۔ مولوی نذیر احمد مرحوم کا ترجمہ بامحاورہ فصیح اور شگفتہ ہونے میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ یہاں مجھے اس ترجمے کے ضمن میں ایک مزے کی بات اور کہنی ہے جس سے ہماری قوم کے علما کی حالت کا پتہ لگتا ہے مولانا کے ترجمہ کا شائع ہونا تھا کہ ان پر اعتراضات کی بوچھاڑ ہونی شروع ہوئی اور ساتھ ہی ساتھ اُن حضرات کے ترجمے بھی شائع ہونا شروع ہوئے اور اکثر یہ اعتراضات اس نیت سے کیئے گئے تھے کہ مولانا کے ترجمہ کی طرف سے لوگ بدگماں ہوجائیں اور ہمارے ترجمے بکنے لگیں۔ افسوس اس سے قبل کسی کو ترجمہ کی ضرورت کا خیال نہ ہوا اور اب جو مولانا کا ترجمہ شائع ہوا اور اوس کی شہرت ہوئی تو یہ بھی لگے منہہ چڑانے لیکن مولانا کے ترجمہ کے سامنے کسی کا فروغ نہوا ان اعتراضات یا اسی قسم کی تحریرات میں جہاں کہیں مرحوم کا نام آتا تو یہ مولوی مارے جلن کے اُن کے نام کے ساتھ کبھی مولوی کا لفظ نہ لکھتے

[illegible] الامہ میں ڈپٹی صاحب نے رسول اکرم صلعم پر نہایت ہی رکیک حملے
کیے ہیں۔ مگر مسلمانوں نے [illegible] کو نذیر احمد [illegible] بنا دیا ہے اور
[illegible] - کیونکہ موصوف [illegible]

بلکہ ہر جگہ ڈپٹی نذیر احمد تحریر فرماتے تھے یہ کم ظرفی کی بات نہیں تو کیا ہے؟ تعجب کی بات ہے کہ ایک شخص باوجود عالم، حافظ اور مترجم قرآن ہونے کے بھی ان مولویوں کے نزدیک مولوی کہلانے کا مستحق نہیں جن کے علم و فضل کی ساری پونجی مسلمانوں کے ارتداد و کفر کے فتوے لکھنے میں صرف ہوتی ہے۔

[illegible]

بڑے اور نامور لوگوں پر اکثر اپنے ہمعصروں کے ہاتھوں بڑے بڑے ظلم ہوئے ہیں مولانا بھی آخر عمر میں اس سے نہ بچے۔ امہات الامہ کا شایع ہونا تھا کہ دلی میں ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ مولوی تو پہلے ہی سے اُن سے جلے بیٹھے تھے ان کی بن آئی خوب جلے پھپولے پھوڑے، مخالفت میں رسالے چھپوائے، طرح طرح کے بہتان باندھے، کفر کے فتوے لکھے اور بدنام کرنے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی طرح طرح سے عوام کو بھڑکایا یہاں تک کہ بعض تو جان کے لاگو ہو گئے اور مرنے مارنے پر مستعد ہو بیٹھے۔ یہ غدر دلی سے اُٹھا اور دوسرے مقامات تک پہونچا۔ لیکن سب سے حیرت انگیز اور عبرت ناک واقعہ یہ ہے کہ اِس کتاب کے چھپنے کے بعد ندوۃ العلما کا جو اجلاس دلی میں ہوا اس میں علمائے کرام تو موجود تھے ہی اُنہوں نے باہم "سکوٹ" کر کے امہات الامہ کی تمام جلدوں کو جو ابتدائی طوفان کے بعد شہر کے بعض معززین نے مولانا کی منت سماجت کر کے ایک صاحب کے پاس رکھوا دی تھیں اور بکری موقوف کرا دی تھی، منگوائیں اور اپنے سامنے ان کتابوں کا ڈھیر لگوایا اور ان میں سے ایک مولوی نے

زیادہ تر ثواب کمانے کے لیے آگے بڑھ کر مٹی کا تیل چھڑکا اور بسم اللہ کہکر آگ لگادی۔ اوس کے شعلوں کی روشنی مولویوں کے مقدس چہروں پر پڑ رہی تھی اور اون کی آنکھوں کی چمک اور چہروں کی بشاشت سے اس خوفناک دلی مسرت اور باطنی اطمینان کا اظہار ہو رہا تھا جو ایک خونخوار درندے یا سنگدل انسان کی صورت سے انتقام لیتے وقت ظاہر ہوتا ہے اگر حکومت کا ڈر نہ ہوتا تو مولانا ئے مرحوم بھی اس آگ میں جھونک دے جاتے۔ یہ منظر قابل دید تھا، مولویوں کا یہ حلقہ زمانہ وسطیٰ کے اُن پادریوں کی یاد دلاتا تھا جنھوں نے کتابیں تو کتابیں ہزاروں بے گناہ زندہ دہکتی آگ میں جھونک دے، کھڑ کھڑاتے تیل کے کڑاہوں میں ڈال دئیے، گلوں میں پتھر باندھکر بہتے دریاؤں میں ڈبو دیے، کتوں سے پھڑوا دئیے اور طرح طرح کے عذاب دے دے کر اور عجیب وغریب شکنجوں میں کس کس کر سسکا سسکا کر مار ڈالے۔ اُن کے سامنے راکھ کا ڈھیر ایک تودہ عبرت تھا جو بیسویں صدی عیسوی کے روشن زمانے کی ایک عجیب یادگار تھا۔ یہ راکھ اس قابل تھی کہ اس کی ایک ایک چٹکی بطور یادگار کے شیشوں میں بند کر کے رکھ لی جاتی تاکہ آئندہ نسلیں اسے سامنے رکھ کر ان علمائے کرام و مصلحان ملک وملت کی ارواح پاک پر فاتحہ دلاتیں اور ان کے حق میں دعائے خیر کرتیں۔

اس بات گویا مولویوں نے شب برات منائی اور اس آگ سے اپنے نفوس مطمئنہ کو ٹھنڈا کیا اور اپنے اعمال ناموں میں ایک ایسی بڑی

نیکی کا اضافہ کیا جو غالباً ان کی نجات آخروی کا باعث ہوگی یہ ادن بزرگوں کا کام ہے جنہوں نے چشم بددور مسلمانوں کی دینی و دنیوی اصلاح و فلاح کا بیڑا اُٹھایا ہے۔

طالب علمی کے زمانے میں جب میں انگریزی تاریخوں اور دوسری کتابوں میں یورپین مورخوں کا یہ الزام پڑھتا تھا کہ مسلمانوں نے حضرت عمرؓ کے حکم سے اسکندریہ کے بے نظیر کتب خانے کو جلا کر خاک کر دیا تو بے حد رنج اور صدمہ ہوتا تھا لیکن جب شمس العلما مولانا شبلی نے ایک محققانہ رسالہ لکھکر محکم دلائل اور زبردست شہادتوں سے اس کی تردید کی تو اس بے نظیر رسالے کو پڑھکر پوری تسکین ہوگئی اور یہ یقین ہوگیا کہ یہ محض فسانہ اور یورپین مورخوں کا مسلمانوں پر افترا اور بہتان ہے۔ مگر جب مجھے اس واقعہ کی خبر لگی اور خصوصاً جب میں نے یہ سنا کہ علامہ موصوف بھی (بالواسطہ یا بلاواسطہ) اس کار خیر میں شریک تھے تو میرا خیال بدل گیا اور اب تک میرا خیال ہے کہ کچھ تعجب نہیں کہ مسلمانوں نے کتب خانہ اسکندریہ جلا دیا ہو۔

اس واقعہ کا ایک بہت بڑا اثر یہ ہوا کہ جب مرحوم کے فرزند رشید نے مدرسۃ العلوم مسلمانان (علیگڈھ) سے اپنے پدر بزرگوار کی یادگار قایم کرنے کی درخواست کی اور خود بھی اس میں معقول امداد دینے کا وعدہ کیا تو کالج کے سنڈیکیٹ نے بڑی ڈھٹائی سے مولویوں کے ڈر کے مارے صاف انکار کر دیا اور انکار کی وجہ مرحوم کے معتقدات قرار دی جو اُن کے زعم شریف میں خلاف اسلام تھے۔ کوئی ممبران سنڈیکیٹ

سے پوچھئے کہ ہم کسی کے مذہب پر رائے دینے والے کون؟ اور اس معاملہ کو مذہب سے تعلق؟ سر ولیم میور اور میکڈانلڈ جیسے لوگوں کی تو یادگار قایم کی جائے اور ایک حافظ عالم، مترجم قرآن، محسن کالج کی یادگار قایم کرنے میں یہ انکار! اور انکار بھی کیسا ناروا اور شرمناک! خصوصاً جبکہ ارکان سنڈیکیٹ میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے کتاب امہات الامہ کو بالاستیعاب پڑھا ہو۔ صرف مولویوں کے خوف سے گھبرا کر یہ فیصلہ کر دیا نہایت افسوس اور رنج کی بات ہے کہ کارکنان کالج میں مداہنت اور بزدلی پیدا ہوتی جاتی ہے اگر خدانخواستہ یہی حال رہا تو جس غرض سے بانی کالج نے یہ کالج قائم کیا تھا وہ فوت ہو جائیگی اور اس کا وجود بے سود ثابت ہوگا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ بعد میں اپنے کیے سے پچتائے اور اس کی تلافی اس طرح کی کہ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں مرحوم کی یادگار قایم کرنے کے متعلق رزولیوشن پاس کیا غنیمت ہے دیکھیں ہمارے علما کیا کرتے ہیں؟ تلافی تو خیر وہ کیا کریں گے مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ ایجوکیشنل کانفرنس کے خلاف فتویٰ نہ لکھ ماریں۔

مرحوم کے حق میں یہ صریح بے انصافی اور سخت ظلم ہوا ہے اور مجھے امید ہے کہ انصاف پسند اصحاب اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھیں گے اور اس محسن ملک و قوم کی یادگار قایم کرنے میں سعی بلیغ فرمائیں گے۔ ورنہ ہماری قوم پر یہ بڑا دھبا رہ جائیگا۔

قابل مولف نے مرحوم کے کیرکٹر کے متعلق مفصل اور کافی بحث

کی ہے اس کے بعد یہ کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے۔ مرحوم میں بڑی بڑی خوبیاں تھیں اور سب سے بڑی صفت ان کی معاشرت میں اعتدال اور کفایت شعاری کی تھی جس کی آج کل ہمیں بڑی ضرورت ہے اور ہماری تمدنی اصلاح کا بڑا دارومدار اسی پر ہے۔ لیکن اس سے حاصل اکیا عمر بھر کی کفایت شعاری کا یہی نتیجہ ہونا چاہیئے کہ اس کا سارا مال اولاد باہم تقسیم کرے! کیا اس میں قوم کا کوئی حصہ نہیں؛ خصوصاً جبکہ اولاد کھاتی پیتی اور مرفہ الحال ہو۔ ایثار کی تلقین کرنا اور بات ہے اور اس پر عمل کرنا اور کسی شے کا علم عمل کے لئے کافی نہیں۔ اعمال پر تربیت اور خاص کر ابتدائی تربیت کا بڑا اثر ہوتا ہے ابھی ہماری قوم میں ایسے لوگ پیدا نہیں ہوئے الا ماشاءاللہ البتہ اس زمانے میں مولوی کرامت حسین صاحب کی ایک مثال ہمارے سامنے ہے جو ہر طرح قابل تحسین اور لائق تقلید ہے انہوں نے بھی اپنی عمر کفایت شعاری میں بسر کی لیکن اس کے ساتھ ہی اپنا سارا اندوختہ قوم کی نذر کر دیا۔

گذشتہ اجلاس آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ایام میں ترقی اُردو کا بھی ایک جلسہ ہوا تھا اس میں علاوہ دیگر تجاویز کے ایک یہ تجویز بھی پیش ہوئی تھی کہ محسنین اُردو کی سوانح عمریاں لکھوائی جائیں۔ اس میں مولوی نذیر احمد مرحوم کا نام بھی پیش کیا گیا تھا لیکن اس کے بعد ہی جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ مولوی افتخار عالم صاحب اس کام کو کر رہے ہیں بلکہ کر چکے ہیں تو مجھے بے انتہا خوشی ہوئی اور حسن اتفاق سے چند ہی روز بعد

اون سے ملاقات بھی ہوگئی تو میں نے ان کی خدمت میں مبارکباد عرض کی اور اپنی بے حد مسرت کا اظہار کیا حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے بڑا کام کیا اور بڑا احسان کیا ہے اور جس محنت جانفشانی اور لگاتار کوشش سے اس فرض کو انجام دیا ہے وہ انہیں کا حصہ ہے اور حق یہ ہے کہ انہوں نے سوانح عمری کا حق ادا کر دیا ہے۔ مرحوم کی یہ بھی خوش نصیبی ہے کہ انہیں ایسا سوانح نگار ملا جس نے اس کام کو نہایت ہمدردی دلسوزی اور صداقت کے ساتھ پورا کیا ہے۔ طرز تحریر بھی فصیح اور شگفتہ ہے بعض جگہ تو مجھے شبہ ہو جاتا تھا کہ کہیں مرحوم کی عبارت تو نہیں۔ امید ہے کہ پبلک اور خاص کر مرحوم کی تصانیف کے دلدادہ ضرور اس کی قدر کرینگے۔

قابل مؤلف نے اس کتاب کو علیا حضرت ہر ہائنس بیگم صاحبہ بھوپال کے چھوٹے صاحبزادہ حمید اللہ خاں بہادر کے نام معنون کیا ہے صاحبزادہ صاحب مدرسۃ العلوم مسلمانان علیگڈھ میں تعلیم پاتے ہیں اور ایک ہونہار اور لایق نوجوان ہیں۔ ہمدردی قدردانی اور فیاضی میں اپنی والدہ ماجدہ کے قدم بقدم چلتے ہیں۔ ان کی ذات سے بڑی بڑی توقعات ہیں اگلے زمانے میں مؤلفین و مصنفین کو امرا و روسا کے دربار سے ایسے ایسے صلے ملتے تھے کہ وہ عمر بھر کو نہال ہو جاتے تھے ہمیں یقین ہے کہ لایق مؤلف کی جانکاہی اور محنت کی قدر اون کی لیاقت کے موافق کی جائیگی۔

---

*

مقدمۂ گلشن ہند

(مصنفہ میرزا علی لطف[1])

یہ کتاب شعرائے اُردو کا قابلِ قدر و نایاب تذکرہ ہے اتفاق زمانہ سے ایک ایسے نیک دل اور باہمت شخص کے ہاتھ لگ گیا۔ جس نے باوجود بے بضاعتی کے چھپوانے کا تہیہ کیا اور مجھ سے کتاب پر مقدمہ لکھنے کی فرمائش کی۔ میں خود بے بضاعت تاہم اس فرمائش کو جو اُنھوں نے دلی شوق سے کی تھی ٹال نہ سکا اور بسر و چشم قبول کیا۔

حقیقت اس کتاب کی یہ ہے کہ نواب وزیرالممالک آصف الدولہ کے عہد اور امیرالممالک لارڈ وارن ہیسٹنگز، گورنر جنرل کے زمانے میں علی ابراہیم خاں[2] نے ایک تذکرہ شعرائے ہند کا فارسی میں لکھا تھا اور اس کا نام

[1] مولوی عبداللہ خاں صاحب کتبخانہ آصفیہ حیدرآباد دکن۔

[2] علی ابراہیم خاں متخلص بہ علی، مشہور ادیب اور مورخ ہیں۔ پٹنہ کے رہنے والے تھے اور بعہد گورنر جنرل لارڈ کارنوالس، بنارس میں چیف مجسٹریٹ اور بعدازاں گورنر رہے اور ۱۲۰۸ھ میں وہیں انتقال کیا۔ اُن کی مشہور تصانیف یہ ہیں (۱) گلزار ابراہیم

گلزار ابراہیم رکھا تھا۔ کوئی بارہ برس کی محنت میں ۱۱۹۸ھ مطابق ۱۷۸۴ء میں جا کر ختم ہوا۔ اتفاق سے یہ تذکرہ اردو کے بڑے قدردان اور محسن، مسٹر گلکرسٹ کی نظر سے گذرا انھوں نے مولف تذکرہ ہذا سے فرمایش کی کہ اگر اس کا ترجمہ سلیس اردو میں ہو جائے تو بہت خوب ہو۔ ان کا منشا اس سے یہ تھا کہ انگریز بھی اسے پڑھ سکیں، اور ان میں اردو زبان اور شاعری کا ذوق پیدا ہو جائے اس طرح یہ کتاب اردو میں لکھی گئی۔ لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیئے

تذکرہ شعرائے اردو جو شاہ عالم بادشاہ کی بادشاہت، آصف الدولہ کی وزارت، اور وارن ہسٹنگز کی گورنر جزلی میں ۱۷۸۴ء (۱۱۹۸ھ) میں لکھا ہے اور جس پر میرزا علی لطف نے اپنے تذکرہ گلشن ہند کی بنیاد رکھی۔ (۲) خلاصۃ الکلام اور صحف ابراہیم یہ دونوں فارسی شعرا کے تذکرے ہیں (۳) وقایع جنگ مرہٹہ، یہ کتاب بعہد لارڈ کارنوالس ۱۲۰۱ھ میں لکھی گئی۔ اس میں ۱۱۹۹ھ ۱۷۸۵ء تک کے حالات درج ہیں۔ میجر فلر نے انگریزی میں اس کتاب کا ترجمہ کیا ہے۔ اس میں بڑی خوبی سے مرہٹوں کے حالات لکھے گئے ہیں اور پانی پت کی جنگ کا حال ایک ایسے شخص سے لے کر لکھا ہے جس نے اپنی آنکھوں یہ جنگ دیکھی تھی۔

(۴) ایک کتاب میں راجہ چیت سنگھ والی بنارس کے بغاوت کے حالات لکھے ہیں۔ یہ واقعہ خود مصنف کے زمانہ کا ہے گرچونکہ اس کتاب کے شروع ہی میں یہ فقرہ لکھا ہے کہ "من کہ علی ابراہیم خان یکے از خیر خواہان کمپنی انگریز ام"، لہذا کسی قدر بدگمانی ہوتی ہے

(۵) خطوط جو برٹش میوزیم کی لائبریری میں محفوظ ہیں اور جس سے اس زمانے کے بعض حالات پر روشنی پڑتی ہے۔

(۶) (ایک مجموعہ ہے فارسی مثنویوں کا ردیف وار ضخیم جلد وں میں ۱۲۔ شیروانی)

کم ہزا ترجمہ ہے بلکہ مترجم نے اس میں بہت کچھ اضافہ کیا ہے، حالات میں بھی اور کلام میں بھی، جس سے بالکل نئی صورت پیدا ہوگئی ہے اور ایک تالیف کی حیثیت ہوگئی ہے۔

یہ تالیف اس زمانہ میں ہوئی جب کہ دلّی میں شاہ عالم بادشاہ اور لکھنؤ میں نواب سعادت علیخان رونق بخش مسند حکومت تھے، بادشاہ تو ایک بے بسی اور بے کسی کی حالت میں تھے، اور نام کے بادشاہ رہ گئے تھے البتہ پورب کے طرف سے ایک جھلکی دکھائی دی۔ دلّی کے اہل کمال اپنے وطن سے مُنہ موڑ اُسی طرف ہو لئے۔ یہ قدردانی کے بھوکے تھے۔ قدر ہوتے جو دیکھی تو وہیں کے ہو رہے سب سے زیادہ شاعری کا ہنگامہ گرم تھا، بچہ بچہ شاعری کا دم بھرتا تھا۔ ادھر سے اساتذہ جو پہنچے تو انہوں نے وہ رنگ جمایا کہ سب کے رنگ پھیکے پڑ گئے یہاں تک کہ نواب سعادت علی خان جیسا عالی دماغ، متین، منتظم، اور کام کرنے والا شخص بھی اس کے اثر سے نہ بچا۔ باوجود اس کے انشاء اللہ خان نے جو ہزار بھکڑوں کا ایک بھکڑ تھا، آخر انہیں اپنی گون نہ دیکھ کر کہہ ہی دیا۔

"میں ہوں نسوڑا اور تو ہے مقطع میرا تیرا میل نہیں"

کہتے ہیں کہ یہ اردو شاعری کے عروج کا زمانہ تھا۔ بیشک۔ لیکن یہ ایک ایسا عروج تھا جس کے ایک رخ پر عروج اور دوسرے رخ پر زوال کی تصویر نظر آتی تھی۔ عروج تو اس لئے کہ زبان روز بروز منجھتی جاتی تھی اور صاف اور شستہ ہوتی جاتی تھی، زوال اس لئے کہ فن

شاعری میں صرف فارسی والوں کی تقلید کی جاتی تھی اور تقلید بھی ناقص
اس کے بعد اور لوگ جو پیدا ہوئے وہ بھی اسی ڈگر پر ہو لئے۔ شاعری بس
اسی کا نام رہ گیا تھا کہ بندش چست ہے، قافئے کو اچھی طرح نباہ دیا، ایک
آدھ محاورہ آگیا، کسی نئی یا سنگلاخ زمین میں غزل کہہ دی۔ کبھی کبھار ڈرتے
ڈرتے سال دو سال میں کسی نئی تشبیہہ یا استعارے کا استعمال ہو گیا، رہا
مضمون، سو خدا کے فضل سے اس میں برکت ہی برکت تھی اور اب بھی
وہی حال ہے، مضمون تو مضمون تشبیہات تک مقررہ ہیں اور اب تک
وہی استعمال ہوتی چلی آتی ہیں۔ کسی نئی تشبیہہ کا لکھنا بڑی بہادری اور
جرأت کا کام ہے، کیوں کہ ہمارے نکتہ سنج شاعر اس کے لئے سند طلب
کرتے ہیں۔ جیسے کوئی قانون داں کسی فوجداری جرم میں تعزیرات ہند
کی دفعہ تلاش کرتا ہے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ ان شعراء کی محنت سے
زبان صاف ہو گئی، لیکن اپنی شاعری کی طرح ٹھٹھر کے رہ گئی اور جو حصار
کہ ہمارے نغز گو شعراء نے اس کے گرد باندھ دیا تھا اس سے آگے قدم
نہ رکھ سکی۔ اس سے بڑھ کر محدود ہونے کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ شاعری
کا دعویٰ ہے، اُردو کے استاد ہیں، مگر خط و کتابت فارسی میں کرتے ہیں،
دیوان اُردو ہے مگر مقدمہ فارسی میں لکھا ہے۔ کوئی معاملہ آپڑا اظہار طلب
فارسی میں ہوتا ہے اُردو میں نہیں۔ کسی طبیب کے پاس جائے نسخہ فارسی
میں ہے (اور یہ اب تک مرائج ہے) سرکاری دفاتر میں فارسی رائج ہے،
یہاں تک کہ خط کی مشق کے لئے بھی شعر لکھے جاتے ہیں تو فارسی، اب

اُردو کو وسعت ہو تو کیوں کر۔

لیکن ایک قوم جو سات سمندر پار سے آئی تھی اور جس کا تسلط اس وقت ہندوستان پر اس طرح بڑھتا چلا جاتا تھا جیسے ساون بھادوں کی گھٹا آسمان پر چھا جاتی ہے، اس نے اُردو کی دستگیری کی۔ اور وہ اس لیئے کہ ہندوستان سے واقف ہونے اور یہاں کی مہذب سوسائٹی میں ملنے جلنے کے لیئے اس کا جاننا ضروری تھا۔ دوسرے یہ زبان ریاست کی گود میں پلی تھی، جہاں جہاں اُس وقت بھی مُغلیہ حکومت کے آثار تھے اس کا دور دورہ تھا۔ علاوہ اس کے ہندوستان کی جدید زبانوں میں سب سے زیادہ ہونہار نظر آئی اس لیئے اُنہوں نے اس کی سرپرستی کی سب سے بڑا احسان جان گلگرسٹ کا ہے جس نے انیسویں صدی کے شروع میں بمقام فورٹ ولیم کلکتہ اس کا ایک محکمہ قایم کیا، جس کا ابتدائی اور اصلی مقصد یہ تھا کہ جو انگریز یہاں ملازمت اختیار کرتے ہیں اُن کی تعلیم کے لیئے اُردو کی مناسب اور مُفید کتابیں تالیف کرائی جائیں اور غالباً اُسی شخص کا احسان ہے کہ بجائے فارسی کے اُردو زبان دفتری زبان قرار پائی۔ یہ عجیب واقعہ ہے، اور یاد رکھنے کی بات کہ فارسی جو مسلمان فاتحوں کی چہیتی زبان تھی، ایک ہندو راجہ ٹوڈرمل کی کوشش سے دفاتر میں داخل ہوئی۔ اور دوسرے دور میں اُردو نے ایک انگریز کی وساطت سے دربار سرکار میں رسائی پائی اس شخص نے اس وقت کے قابل قابل لوگ بہم پہنچائے اور مختلف کتابیں لکھوانا شروع کیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جدید اُردو نثر کا لکھنا اسی وقت سے شروع ہوا اور بلا مبالغہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو احسان ولی نے اردو نظم پر کیا تھا، اس سے زیادہ نہیں تو اسی قدر احسان جان گلکرسٹ نے اردو نثر پر کیا۔

چون کہ یہ تذکرہ بھی اسی نامور اور قابل شخص کی تحریک سے لکھا گیا تھا لہذا اس مقام پر مختصراً یہ بیان کرنا کہ اس کی نگرانی میں، یا اور انگریزوں کی سعی سے کیا کیا کام ہوا اور اردو زبان میں کس قدر اضافہ ہوا نامناسب نہ ہوگا۔

اس سلسلے میں سب سے اول سید محمد حید بخش حیدری قابل ذکر ہیں انھون نے ۱۸۰۱ء میں توتا کہانی لکھی جو اصل میں انھون نے طوطی نامہ کو اپنی زبان میں لکھا ہے۔ طوطی نامہ ابن نشاطی نے عبداللہ قطب علی شاہ کے زمانہ میں، دکنی زبان میں لکھا تھا مگر ماخذ اس کا ایک سنسکرت کتاب ہے۔ آرایش محفل یعنے مشہور قصہ حاتم، بھی جو اب تک عوام میں دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے انھیں کا لکھا ہوا ہے۔ ایک کتاب گل مغفرت یا دہ مجلس مسلمانون کے اولیاء اللہ کے حالات میں بھی لکھی ہے، فارسی کی مشہور کتاب بہار دانش کا بھی اردو ترجمہ کیا ہے، جس کا نام گلزار دانش ہے۔ ایک اور کتاب تاریخ نادری اردو میں لکھی، یہ کسی فارسی تاریخ کا ترجمہ ہے۔

دوسرے صاحب۔ میر بہادر علی حسینی ہیں، انھون نے میر حسن دہلوی کی مشہور و معروف مثنوی سحر البیان (قصہ بدر منیر و بے نظیر) کو اردو نثر میں کیا ہے اور اس کا نام نثر بے نظیر رکھا ہے اور ایک اور

کتاب اخلاق ہندی کے نام سے لکھی اس کتاب کا ماخذ فارسی کتاب مفرح القلوب ہے جو اصل میں سنسکرت سے لی گئی ہے یہ دونوں کتابیں ۱۸۰۲ء میں لکھی گئی تھیں

میر امن دہلوی سب سے زیادہ قابل ذکر ہیں احمد شاہ درانی کے زمانے میں جو دلی پر آفت آئی تو یہ وطن کو چھوڑ کر پٹنہ میں آ رہے، یہاں سے ۱۸۰۱ء میں کلکتہ پہنچے۔ باغ و بہار کی وجہ سے ان کا نام ہمیشہ یاد رہے گا، یہ کتاب ۱۸۰۱ء میں لکھی گئی ہے اور انیسویں صدی کے آغاز میں دلی کی جو زبان تھی اس کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس کتاب کا ماخذ امیر خسرو رح کی چہار درویش ہے، میر امن نے امیر خسرو رح کی تصنیف سے ترجمہ نہیں کیا بلکہ اس سے پیشتر ایک صاحب حسین نامی ساکن اٹاوہ نے اسے امیر خسرو کی کتاب سے ترجمہ کیا تھا اور اس کا نام نو طرز مرصع رکھا تھا، میر امن نے اخلاق محسنی کے تتبع میں ایک کتاب گنج خوبی بھی اسی زمانہ میں لکھی۔ حفیظ الدین احمد فورٹ ولیم کالج میں پروفیسر تھے ۱۸۰۳ء میں انھوں نے علامی ابوالفضل کی کتاب عیار دانش کا ترجمہ اردو میں کیا اور خرد افروز اس کا نام رکھا۔ اصل کتاب سنسکرت میں ہے اور عربی میں کلیلہ دمنہ کے نام سے مشہور ہے،

میر شیر علی افسوس بھی اسی سلسلے میں ممتاز شخص ہیں، دہلی کے رہنے والے تھے گیارہ برس کے سن میں اپنے والد کے ساتھ لکھنؤ آئے بہت سے انقلابات کے بعد نواب سالار جنگ اور پھر ان کے بیٹے نوازش علی خاں کے ہاں ملازم رہے، اور جب یہ شیرازہ بکھر گیا تو صاحب عالم

و عالمیان مرزا جواں بخت جہاندار شاہ کے متوسل ہو گئے مگر جب شہزادہ عالم کا کوچ شاہ جہاں آباد کے طرف ہوا تو یہ ساتھ نہ جا سکے۔ اور نواب سرفراز الدولہ بہادر کے ساتھ زندگی کے دن بسر کرنے لگے۔ اُن کو میر حیدر علی حیرآن سے تلمذ ہے اور بعض کا قول ہے کہ میر درد اور میر سوز کے شاگرد ہیں۔ اتنے میں صاحب عالی شان، بارلو صاحب نے مسٹر گلکرسٹ کے مشورے سے زبان دانِ ریختہ کو لکھنؤ سے طلب فرمایا۔ چنانچہ لکھنؤ کے رزیڈنٹ مسٹر اسکاٹ نے میر شیر علی افسوس کو انتخاب کیا، اور دو سو روپیہ ماہانہ تنخواہ مقرر کر کے پانسو روپیہ خرچ راہ دیا اور کلکتہ روانہ کیا، ۱۸۰۰ء میں کلکتہ پہنچے، اور نو برس بعد انتقال کر گئے۔ یہاں اُنہوں نے ایک قابل قدر کتاب آرایش محفل لکھی، جس میں ہندوستان کے مختلف حالات درج ہیں اِس کتاب کا ماخذ سجان رائے کی کتاب خلاصۃ التواریخ ہے۔ اور مرنے سے سال بھر پہلے یعنے ۱۸۰۸ء میں سعدی کی گلستاں کا ترجمہ باغ اُردو کے نام سے اُردو میں کیا۔

نہال چند نے ۱۸۰۳ء میں مثنوی گل بکاؤلی کو اُردو نثر میں لکھا، اور نام اس کا مذہب عشق رکھا۔

کاظم علی جوآن بھی دہلی کے تھے، بعد ازاں لکھنؤ میں آئے اور وہاں سے ۱۸۰۰ء میں کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج میں آئے۔ اُنہوں نے ۱۸۰۱ء میں شکنتلا کا قصہ اُردو میں لکھا تو از کبیشر نے جو برج بھاکا میں (۱۷۱۶ء) شکنتلا کی کہانی لکھی تھی۔ اس کا یہ ترجمہ ہے اُنہوں نے ایک بارہ ماسہ بھی لکھا ہے اور اس میں ہندو مسلمانوں کے تیوہاروں کا ذکر ہے جس کا نام دستور ہند

اور جو سنہ ۱۸۱۲ء میں چھپا۔

اکرام علی نے سنہ ۱۸۱۰ء میں رسائل اخوان الصفا میں سے ایک رسالے کا ترجمہ عربی سے اُردو میں کیا جس میں شاہ جنّات کے سامنے انسان و حیوان کا جھگڑا پیش ہے کہ ہم دونوں میں کون افضل ہے، یہ منجملہ اُن رسائل کے ہے جو بغداد کی مشہور سوسائٹی اخوان الصفا کے اہتمام سے لکھے گئے تھے۔

سری لالو گجرات کا برہمن تھا، جو شمالی ہند میں آگرہ آباد ہو گیا تھا، اس نے فورٹ ولیم کالج کی نگرانی میں ہندی کی بعض کتابیں مثلاً پریم ساگر، راج نیتی، لطائف ہندی ترجمہ یا تالیف کیں۔ سنگھاسن بتیسی، سری لالو اور جوان نے مل کر سنہ ۱۸۰۱ء میں لکھی، جو آدھی اُردو آدھی ہندی ہے۔

مظہر علی ولا نے بیتال پچیسی لکھی، جو مضمون اور زبان کے لحاظ سے سنگھاسن بتیسی کے مثل ہے اور نیز ولا کی مدد سے قصہ مادھونال کو برج بھاکا سے اُردو میں ترجمہ کیا۔

علاوہ اس کے خود گلکرسٹ نے سنہ ۱۸۰۱ء میں اُردو کی ایک لغت لکھی، زبان کے بعض قواعد لکھے اور مختلف طرح سے اُردو زبان کی خدمت کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر گلکرسٹ سے اول بھی ایک شخص فرگسن نامی نے اُردو کی ایک لغت لکھی تھی، جو لندن میں سنہ ۱۷۷۳ء میں طبع ہوئی۔ مگر چونکہ وہ بالکل ناکافی تھی۔ جنرل ولیم کرک پیاٹرک نے ایک ڈکشنری لکھنے کا ارادہ کیا جس کے انہوں نے تین حصے کئے۔ مگر اس کا ایک ہی حصہ طبع ہونے پایا۔ اِس حصے میں انہوں نے وہ الفاظ لئے ہیں جو عربی فارسی سے ہندی میں آگئے ہیں

باقی دو حصوں کے طبع کرنے کے لئے انہیں ناگری ٹائپ کا انتظار تھا، وہ جلد تیار نہ ہو سکا اور کتاب ناقص رہ گئی، یہ ایک حصہ لندن میں ۱۷۹۸ء میں طبع ہوا۔ لندن سے جب یہ واپس آئے تو دیکھا کہ ڈاکٹر گلکرسٹ بھی اسی کام میں لگے ہوئے ہیں تو چاہا کہ دونوں مل کر اسے انجام دیں۔ مگر ان کو اور بہت سے کام کرنے تھے۔ اس لئے تھوڑے دنوں کے بعد وہ الگ ہو گئے اور ڈاکٹر گلکرسٹ تنہا یہ کام کرتے رہے۔

ڈاکٹر صاحب نے ایک حصہ انگریزی ہندوستانی لغت کا تیار کر کے ۱۷۹۸ء میں چھاپ دیا۔ مگر دوسری جلد ہندوستانی انگریزی لغت ختم نہ کر سکے، علاوہ اُن تمام دقتوں کے جن سے وہ گھبرا گئے تھے ایک دقت یہ بھی تھی کہ خریدار بہم نہ پہنچے، صرف سترہ صاحبوں نے خریداری منظور کی حالانکہ خرچ کا اندازہ کم سے کم چالیس ہزار روپیہ کا کیا گیا تھا، ڈاکٹر صاحب نے اس کام کو نہایت حسرت کے ساتھ خیرباد کہا۔ اس کے بعد میجر ڈیوڈ تامسن رچرڈسن سپرنٹنڈنٹ و کمانڈنٹ ملٹری ایکاڈمی نے اردو لغت لکھنی شروع کی مگر افسوس کہ اس کا بھی وہی حشر ہوا اور طبع ہوتے ہوتے رہ گئی۔ اس کے بعد ۱۸۰۸ء میں ڈاکٹر ٹیلر نے ایک ہندوستانی انگریزی لغت طبع کرائی۔ اسی کتاب کو پھر ڈاکٹر ولیم ہنٹر نے فورٹ ولیم کالج کے دیسی ادیبوں کی امداد سے نظر ثانی کر کے چھپوایا۔

گلیڈون نے ایک لغت فارسی اور ہندوستانی زبان کی دو جلدوں میں لکھی جو کلکتہ میں ۱۸۰۹ء میں چھپی۔ مسٹر جان شکسپیر نے ایک اردو لغت

۱۸۱۰ء میں طبع کرائی۔ یہ کتاب زیادہ تر ٹیلر کی لغت سے ماخوذ ہے، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اسی کتاب کو دوسرے قالب میں پیش کیا گیا ہے۔ فوربس کی لغت ۱۸۴۷ء میں لندن میں چھپی ایک فرانسیسی برٹرینڈ نے بھی ایک لغت لکھی، جو پیرس میں ۱۸۵۸ء میں طبع ہوئی۔ براٹیس کی لغت ۱۸۶۴ء میں لندن میں چھپی، پلیٹس نے بھی ایک لغت لکھی ہے جس کے طبع ہونے کا سن مجھے معلوم نہیں ہوا۔ اس زمانے میں ڈاکٹر فیلن نے اردو کی کئی لغات لکھیں ان کی ہندوستانی انگریزی لغت درحقیقت سب سے بہتر ہے۔ یہاں تک کہ اہل زبان نے بھی جو دو ایک لغت لکھے ہیں، ان میں بھی زیادہ تر فیلن کا تتبع کیا گیا ہے، بلکہ اسی سے ماخوذ ہیں۔

اس تذکرے میں جو انگریزوں کے احسان کا ذکر کیا گیا ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس تذکرے سے بھی بعض باتیں ایسی معلوم ہوتی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگریزوں کو اس زبان سے خاص دلچسپی تھی اور اس کی ترقی دینے میں انھوں نے حتی الامکان کوشش کی۔ میر شیر علی افسوس کا ذکر تو پہلے ہو چکا ہے اور وہ ہم نے اسی تذکرے سے لیا ہے میر کے حال میں لکھا ہے۔

"جن ایام میں کہ درخواست صاحبان عالی شان کی زبان دانانِ ریختہ کے مقدمہ میں کلکتہ سے لکھنؤ گئی تو پہلے کرنل اسکاٹ صاحب کے سامنے تقریب میر کی ہوئی لیکن علتِ پیری سے یہ بیچارے

مجھول سے محمول ہوئے اور جوانان نومشق مربی گری
سے قوت بدنی کے مقبول ہوئے۔ زمانہ خوش طبعوں سے
کبھی نہیں خالی ہے، اکثر اہل لکھنو پکارتے تھے کہ کلکتہ
میں شاعری کی چادر خواست حمالی ہے۔"

غالباً اس جگہ کے لئے میر شیر علی افسوس کا انتخاب ہوا۔ کاش میر صاحب کا انتخاب ہوتا۔ چونکہ ان کی نظم میں انتہا درجے کی فصاحت و شیرینی اور گھلاوٹ موجود ہے اس لئے ممکن تھا کہ وہ فورٹ ولیم کالج میں جاکر نثر میں کوئی ایسی یادگار چھوڑ جاتے کہ اہل زبان اُن کی نظم کی طرح اسے سر آنکھوں پر رکھتے اور اُردو زبان میں ایک عجیب اور قابل قدر اضافہ ہوتا۔

نواب محبت خان محبت، خلف ارشد نواب حافظ الملک حافظ رحمت خاں، کے ذکر میں لکھا ہے کہ

"اُنہوں نے نواب ممتاز یار الدولہ مسٹر جانسین کی فرمائش
سے قصہ سسی پنوں کا اُردو میں نظم کیا۔ نام اس کا اسرار محبت رکھا۔"

میر قمر الدین کے حال میں درج ہے کہ

"اُنہوں نے میر محمد حسین، فرنگی لقب، کے توسل سے
ممتاز یار الدولہ مسٹر جانسین کی سرکار میں توسل حاصل کیا
اور ان کی رفاقت میں کلکتہ آکر عماد الدولہ گورنر
مسٹر ہیستن (ہسٹنگز) جلادت جنگ بہادر کی عنایت
سے پیشگاہ نظامت صوبہ بنگال سے ملک الشعرا کا خطاب لیا۔"

اِس زمانے میں علاوہ ڈاکٹر فیلن کے، جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے کرنل ہال رائڈ سابق ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب نے بھی اردو زبان کی ترقی میں بیش بہا مدد دی، سلسلہ تعلیم کے لئے عمدہ عمدہ کتابیں لکھوائیں انگریزی سے بھی بعض چیزیں ترجمہ کرائیں، اور اس میں مفید اور نیک مشورہ دیا، کتابت اور چھپائی میں خاص اہتمام کیا، اور اس میں کارآمد اصلاحیں کیں، اور سب سے بڑا کام یہ کیا کہ لاہور میں ایک انجمن قائم کی جس میں نیچرل مضامین پر عمدہ نظمیں لکھوائیں، شمس العلما مولانا خواجہ الطاف حسین حالی اور شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد کی بعض نظمیں انہیں کی تحریک سے لکھی گئیں اور وہیں پڑھی گئیں۔ کرنل ہال رئد کا یہ کام بہت قابل قدر اور قابل تعریف ہے۔ اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اُردو نثر کی طرح اُردو نیچرل شاعری کی بنا بھی ایک حد تک انگریزوں ہی کے ہاتھوں رکھی گئی۔ آج کل مسٹر ل ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن پنجاب نے جو انجمن ترقی اُردو کی صدارت قبول فرماکر اُردو کی سرپرستی فرمائی ہے وہ بھی کچھ کم قابل شکریہ نہیں۔ اِسی سلسلے میں جو ایک اور قابل قدر کام انگریزوں کے ہاتھوں ہوا ہے اور جس کا ذکر میں یہاں مناسب سمجھتا ہوں، وہ یہ ہے کہ سب سے اول اردو کتابیں بھی انھوں ہی نے چھپوائیں۔ اول اول فورٹ ولیم کالج ہی کے پریس میں اُردو کتابیں ٹائپ میں طبع ہوئیں۔ اور جتنی کتابیں کہ ڈاکٹر گلکرسٹ اور اس کے جانشینوں کی نگرانی اور مشورے سے تیار ہوتی تھیں وہیں چھپتی تھیں اس کے بعد لتھوگراف پریس جب

پہلے دلی میں ۱۸۳۷ء میں استعمال ہوا۔ اور اس کے بعد سے روز بروز کتابوں کے چھپنے میں ترقی ہوتی رہی۔

وہ انگریز حاکم، جس نے اُس ملک میں بیٹھ کر جو اردو کا جنم، جھوم اور وطن مالوفہ ہے اسے دفاتر سے نکال کر ذلیل کرنا چاہا تھا، وہ سخت غلطی پر تھا اگر وہ اس زبان کی تاریخ سے واقف ہوتا اور یہ جانتا کہ اس کے واجب التعظیم بزرگوں نے اس کے حاصل کرنے اور اُسے وسعت دینے میں کیسی کیسی مشقتیں جھیلی ہیں، اور اس عجیب و غریب سلطنت کی بنیاد کے ساتھ ہی اس عجیب و غریب زبان کی بنیاد بھی مستحکم کی ہے، تو ضرور اپنی حرکت پر نادم ہوتا۔ یہ زبان کسی خاص فرقے یا کسی خاص ملت کی نہیں ہے، اس پر دنیا کی تین بڑی قوموں نے عرق ریزی کی ہے ہندو اس کی ماں ہیں، مسلمان اس کے باپ ہیں اور انگریز اس کے گاڈ فادر ہیں۔ جو لوگ اس کے مٹانے کی کوشش کرتے ہیں وہ گویا اس نشانی کو مٹانا چاہتے ہیں، جو تینوں کے اتحاد کی یادگار ہے۔ وہ غلطی پر ہیں، جب تک ہندو اور مسلمان اور انگریز دنیا میں قایم ہیں کم از کم اس وقت تک یہ زبان ضرور قایم رہے گی

افسوس ہے کہ صاحب تذکرہ نے اپنے حالات کچھ نہیں لکھے، دیباچے میں تو ذکر ہی نہیں، شعرا کے سلسلے میں جہاں اپنا حال لکھا ہے وہ بھی برائے نام ہے، بلکہ دوسرے شعرا کے مقابلے میں بالکل کم اور ناکافی ہے، البتہ اپنا کلام بڑے شوق سے نقل کیا ہے اور شاید اس

موقع کو غنیمت سمجھ کر سب کا سب درج تذکرہ کر دیا ہے۔ لہٰذا ہم نے کچھ ان کے کلام سے اور کچھ ادھر اُدھر سے تھوڑا بہت حال بہم پہنچایا ہے۔

نام میرزا علی، تخلص لطف تھا، ان کے والد کاظم بیگ خان استرآباد کے رہنے والے تھے ۱۱۵۴ھ ہجری میں نادر شاہ کے ساتھ شاہ جہان آباد تشریف لائے اور ابو المنصور خان صفدر جنگ کی وساطت سے دربار شاہی میں رسوخ پایا۔ فارسی کے شاعر تھے، اور ہجری تخلص کرتے تھے، فارسی میں میرزا علی لطف باپ ہی کے شاگرد تھے۔ میرزا لطف دیباچے میں لکھتے ہیں "

"میرا ارادہ سیر حیدر آباد کا تھا مگر چون کہ مسٹر گلکرسٹ نے بڑے اخلاق اور تپاک کے ساتھ مجھ سے اس تذکرے کے لکھنے کی خواہش کی اُسے بسر و چشم قبول کیا"

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں۔

"آج کے دن تک کہ ۱۲۱۵ھ ہجری اور ۱۸۰۱ء کے ہیں"

اور بعد ازاں مارکویس آف ولزلی کا ذکر کر کے لکھتے ہیں۔

"موافق حکم اس صاحب والا مناقب کے کہ نام نامی اسم گرامی اس کا اوپر مذکور ہوا ہے اس ہیچمدان نے یہ تذکرہ لکھا۔"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ تذکرہ موٴلف نے ۱۸۰۱ء میں ترتیب دیا، اس کے مادہ تاریخ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ کتاب ۱۲۱۵ھ ہجری میں لکھی گئی۔

حیران پھریں ہیں سب سرو یا سمن اور دے
تاریخ اس کی جب سے کہ رشک بہشت ہے ۱۲۱۵ھ

اور غالباً یہی سال اختتام تذکرہ کا بھی ہے۔

دوسری بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ اس فرمائش کے بعد نہیں، تو اول ضرور حیدرآباد میں تشریف رکھتے تھے، کیونکہ ان کے کلام میں وہ قصاید درج ہیں جو انہوں نے اعظم الامرا ارسطو جاہ، اور میر عالم کی مدح میں لکھے تھے اعظم الامرا مرہٹوں کی قید سے نجات پانے کے بعد دوبارہ ۱۷۹۷ء میں وزیر مقرر ہوئے اور مئی ۱۸۰۴ء میں انتقال کر گئے اس کے بعد اسی سال میر عالم وزیر ہوئے اور ۱۸۰۸ء میں وفات پائی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موٴلف اس زمانے میں حیدرآباد چلے گئے تھے چوں کہ ان کو زیادہ تر یا تو انگریزوں سے سابقہ رہا ہے۔ یا اہل حیدرآباد سے، اس لئے انہوں نے ایک شعر میں اس تعلق کو بڑی خوبی سے ادا کیا ہے۔ کہتے ہیں

ہوا آوارہ ہندوستان سے لطف آگے خدا جانے
دکن کے سانولوں نے مارا یا انگلن کے گوروں نے

جو قصیدہ انہوں نے اعظم الامرا ارسطو جاہ کی مدح میں لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے بھی وہ فارغ البال اور خوش حال تھے اور دکن

میں جا کر ارسطو جاہ کے ہاں ڈیڑھ سو روپیہ ماہانہ کے ملازم ہو گئے تھے مگر اس تنخواہ سے خوش نہیں تھے، اضافے کی درخواست کرتے ہیں اور بڑے زور سے کرتے ہیں۔

کل ہی کی بات ہے، یہ مسافر وطن میں تھا — سو دو سو آشنا کا حق بندگی گزار
شکر خدا کہ آج بیک بینی و دو گوش — گرچہ دکن میں ہے، نہیں ہر در پہ خوار و زار
ہر چند ہے تری ہی عنایت سے یہ سکون — لازم وگرنہ تھا بشریت کو اضطرار
اس سامعہ خراشی سے مجھ کو جو ہے غرض — سو یہ ہے، اے امیر فلک قدر و کے تبار
سرکار سے تری جو زراہ تفضلات — ہے ڈیڑھ سو روپے ترے خادم کا ماہوار
ہر چند جائے شکر ہے، پر عرض کیا کروں — جس طرح اس میں کاٹتا ہوں لیل او نہار
بے گفتگو پچاس تو ان ڈیڑھ سو میں سے — ہو کر سوار چھاتی پہ لے جاتے ہیں کہار
خلق خدا کا بار اٹھاتی ہے پالکی — میں اپنی پالکی کا ہوں برعکس زیربار
باقی جو سو رہے، کئی دن میں یاں پہ پھر — شل مجردات فقط ان کا ہے شمار
تجھ سا ہو قدردان نکات، اور یہ نکتہ سنج — یوں ہو اسیر پنجۂ چرخ ستم شعار
فضل و ہنر جو مجھ میں ہے وہ سب یک طرف — اور قدردانیاں بھی تری سب یک کنار
ہے ہمت بلند کا تری جو اقتضا — اس امر میں تو ہے تجھے آئندہ اختیار
ازبس کہ کم دماغ ہوں ضیق معاش سے — بالفعل تو اضافے کا ہوں گا امیدوار
لیکن نہ وہ اضافہ جو ہووے برائے نام — کافر ہوں سو پچاس میں گر ہو گشود کار
تضعیف اصل چاہتا ہے تجھ سے یہ ضعیف — کیوں کر یہ بے حیائی نہیں ہوتی بار بار
غالب ہے تجھ پہ شاق، نہ ہوں میرے تین سو — چھ سو جب اُن تینوں کو تو دے بلکہ چھ ہزار

جو شکایت شاعر نے اخیر شعر میں کی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہال قدیم سے چلی آرہی ہے اور اب تک باقی ہے۔

اس قصیدے میں شاعر نے تعلّی کی ہے اور ناصر علی کا ذکر کیا ہے کہ ذوالفقار خاں کی مدح میں اس نے قصیدہ کہا اور صرف اِس کے اِس مطلع پر،

اے شانِ حیدری ز جبین تو آشکار
نامِ تو در نبرد کند کارِ ذوالفقار

امیرالامراء نے زر و سیم نثار کیا پھر اِس مطلع کو پڑھ کر کہتا ہے کہ اس میں کیا رکھا ہے۔

جُز لفظِ ذوالفقار نہیں اس میں کوئی بات ۔۔۔ ایسی کہ ڈال دیویں سپر جس کے آگے یار
آئینِ قدر دانی میں لیکن برائے نام ۔۔۔ لازم یہی ہے کر گیا جو خانِ باوقار

اور پھر خود اس مطلع کا جواب لکھتا ہے۔

کہتی ہے فارسی میں مجھے طبع مطلعے ۔۔۔ ہاں در جواب مطلع ناصر علی بیار
اے ذرہ ہا ز نام تو خورشید اعتبار ۔۔۔ تاثیرِ اسم اعظم از اِسم تو آشکار

کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ اس میں بھی سوائے لفظ اعظم کے اور کیا رکھا ہے مگر افسوس ہے کہ باوجود اس کے یہ مطلع ناصر علی کے مطلع کو نہیں پہنچتا۔

میر عالم بہادر کی مدح میں جو قصیدہ لکھا ہے اس میں بھی یہی رونا رویا ہے۔

پر اتنی عرض اسے حاجت سوائے خلق ہی تجھ سے
کہ نہ خواہاں نہیں کچھ ملک و کوس و طبل و لشکر کا
توجہ اتنی فرما تو کہ با احتیاج کی رُو سے
نہ ہوں محتاج عند الوقت سیم و زر و گوہر کا

نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ اپنے تذکرۂ شعرا، گلشن بیخار میں لکھتے ہیں کہ میرزا لطف کچھ دنوں نواح عظیم آباد میں بھی رہے ہیں، اور نسبت شاگردی، میر تقی سے رکھتے ہیں۔"

لیکن خود میرزا لطف اپنے حال میں لکھتے ہیں:

"اور مشورہ ریختہ کا فقط اپنی ہی طبع ناصواب سے ہے"

اور اسی کو صحیح سمجھنا چاہیے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ میر تقی کے بہت بڑے مدّاح اور ماننے والے ہیں اور غالباً اسی وجہ سے وہ اُن کی شاگردی سے منسوب کر دیئے گئے ہیں۔

لطف ایک معمولی شاعر ہیں، غزل و قصیدہ و مثنوی سب کچھ لکھا ہے مگر کلام میں لطف نہیں، البتہ یہ تذکرہ اُن کا ایسا کارنامہ ہے جو از دو زبان میں قابل یادگار رہے۔ چوں کہ ایک انگریز با اقتدار کی فرمائش سے لکھا ہے! زبان صاف اور سادہ ہے تاہم قافیئے کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تذکرے اگرچہ اور بھی لکھے گئے ہیں مگر اس میں بعض خصوصیتیں ایسی ہیں کہ جس سے یہ درحقیقت قابل قدر ہے:

۱۔ اول تو سو برس پہلے کی زبان ہے جس سے زبان کے متعلق بہت کچھ پتہ لگ سکتا ہے اور محقق علم اللسان کو، اور نیز اُن لوگوں کو

جنھیں زبان کا چسکا ہے، بہت کچھ نئی باتیں معلوم ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ ایک ظاہر بات جو ہمیں عام طور پر اِس کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہوئی وہ یہ ہے کہ دکن کی زبان میں بعض الفاظ جو روزمرہ بول چال میں آتے ہیں اور ہندوستانیوں کو اجنبی معلوم ہوتے ہیں وہ درحقیقت پرانی زبان کی یادگار ہیں" مثلاً کر کے" کا خاص استعمال، جو ہم یہاں ہر روز سنتے ہیں اس تذکرے میں بھی جا بجا پایا جاتا ہے مثلاً وہ لکھتے ہیں۔

" شورش تخلص، متوطن عظیم آباد کے، مشہور میر مُنّا کر کے تھے۔"

اِسی طرح میر قمرالدین منت کے حال میں لکھا ہے۔

" چنانچہ شکرستاں کر کے ایک نسخہ اِس شہر میں مثال کا بطور گلستاں کے مشہور ہے۔"

دکن میں بعض لوگ بعد میں کی جگہ " بعد از " بولتے ہیں سوز نے ایک شعر میں یہی لفظ لکھا ہے۔

ہے جیتے جی تو مجھے کو سے یار میں رونا　　رہے گا مرگ کے بعد از مزار میں رونا

فعل کے بعض استعمال بھی بعض اوقات بالکل ایسے ہیں جو ہم حیدرآباد میں اکثر سنتے ہیں مثلاً فعل متعدی میں فعل بہ لحاظ مفعول کے آتا ہے مگر اِس کتاب میں بعض جگہ فاعل کے لحاظ سے آیا ہے دکن میں عموماً اِسی طرح بولتے ہیں رضیا کے حال میں لکھا ہے۔

" دلی سے جب کہ لکھنؤ میں آئے تو طور سکونت کا وہیں ٹھہرائے۔"

کلفر کے تذکرے میں لکھتے ہیں

"بیشتر دکن بطور سیاحت کے دیکھے اور اکثر مقاموں میں سیر کی وضع پر پھرے۔"

دکن میں عام طور پر میں "کہا" بولتے ہیں قایم کہتے ہیں۔

میں کہا، عہد کیا کیا تھا رات
ہنس کے کہنے لگا کہ یاد نہیں"

۲۔ دوسرے علاوہ اس کے کہ موتف ایسے زمانے میں تھا جب کہ اُردو زبان عروج پر تھی اور بڑے بڑے اساتذہ زندہ تھے، موتف ان کا ہم عصر تھا، اور ان میں سے اکثر سے ان کی شناسائی اور دوستی تھی اور اس لیئے جس وثوق اور صحت کے ساتھ، اُن کے حالات یہ لکھ سکتا ہے دوسرا نہیں لکھ سکتا، اور بعض حالات تو ایسے لکھے ہیں جو کہیں دوسری جگہ دیکھنے میں نہیں آئے۔ مثلاً۔ رزیڈنٹ لکھنو کا میر تقی کو فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں زبان ریختہ میں تالیف و تصنیف کے لئے طلب کرنا، اور بوجہ پیرانہ سالی اُن کا منتخب نہ ہونا۔ یا میر صاحب ہی کے حال میں ایک ایسا فقرہ لکھا ہے جس کا دل پر بہت اثر ہوتا ہے اور جو صرف اس تذکرے کا موتف ہی لکھ سکتا تھا کیوں کہ وہ اُن کا دیکھنے والا تھا اور خاص ارادت رکھتا تھا علاوہ اس کے اس سے میر صاحب کی اس خاص وضع اور طبیعت کا اندازہ بھی ہوتا ہے جو انہوں نے عمر بھر نباہی وہ لکھتا ہے۔

نا قصد وانی سے اغنیا کی، اور نا سمجھی سے اہل دنیا کی

اب بازارِ سخن سازی اس درجہ کاسد ہے اور
ہوائے شہرستانِ معنی طراز اس مرتبہ فاسد، کہ
میر سا شاعر، جو کہ سحر کاری سخن میں طلسم ساز ہے
خیال کا اور جادو طرازی بیان میں معانی پرواز ہے
مقال کا، وہ نانِ شبینہ کا محتاج ہے اور بات کوئی
نہیں پوچھتا اُس کی آج ہے۔"

شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد اپنی کتاب آبحیات میں لکھتے ہیں۔

"جب میر صاحب لکھنو آئے تو نواب آصف الدولہ
نے دو سو روپیہ مہینہ کر دیا مگر چوں کہ بد مزاج انتہا
درجے کے تھے نواب سے بگاڑ کر لیا اور گھر بیٹھ
رہے، اور زندگی فقر و فاقے میں گزار دی۔"

مگر اس تذکرے کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صحیح نہیں کیوں کہ
اِس میں لکھا ہے کہ

نواب آصف الدولہ مرحوم نے روزِ ملازمت خلعت
فاخرہ دیا اور تین سو روپے مشاہرہ مقرر کر کے
تحسین علی خاں ناظر کے سپرد کر دیا، اگرچہ گرفتہ
مزاجی سے ان کی روز بروز صحبت نواب مرحوم
سے بگڑتی گئی، لیکن تنخواہ میں کبھی قصور نہوا۔ اور
نواب سعادت علی خاں بہادر کے عہد میں آج کے

دن تک کہ ۱۲۱۱ھ ہیں وہی حال ہے جو اوپر مذکور ہوا۔
مگر صاحب تذکرہ کا چند سطر اوپر یہ کہنا کہ وہ نان شبینہ کا محتاج ہے یا تو مبالغہ ہے یا یہ ہے کہ وہ دوسروں کے مقابلے میں اُن کے کمال کی پوری قدر نہ ہوئی غرض یہ کہ بعض باتیں اِس میں نئی نظر آتی ہیں۔

۳۔ تیسرے، صاحب تذکرہ نے ایک یہ کام بھی بہت اچھا کیا ہے، کہ جن لوگوں کو تھوڑا یا بہت یا کسی قدر تعلق سلطنت سے رہا ہے ان کے تذکرے میں تاریخی حالات بھی خوب خوب لکھے ہیں، چنانچہ شاہ عالم المتخلص بہ آفتاب کے حال میں ان کا بزمانہ ولی عہدی عماد الملک کے خوف سے دلی چھوڑنا، باپ کا دھوکے سے فیروز شاہ کے کوٹلے میں قتل ہونا اور ان کا ۱۱۷۳ھ میں تخت نشین ہونا۔ راجہ نارائن سے جنگ کے دلیر خاں کی دلیری اور جاں نثاری، فتح و نصرت کا حاصل ہونا وغیرہ وغیرہ بالتفصیل لکھا ہے اور اخیر میں کور نمک سنگدل غلام قادر خاں روہیلے کا دردناک واقعہ بھی درج کیا ہے اور بادشاہ کی دردناک غزل بھی نقل کر دی ہے جس میں یہ واقعہ منظوم ہے اور خود اردو نظم میں ترجمہ کر کے متن میں درج کی ہے اِس لئے کہ تذکرہ اُردو کا ہے اور اصل غزل حاشئے پر لکھ دی ہے البتہ اتنا تکلف کیا ہے۔ اسی طرح تانا شاہ، آصف الدولہ، اور مرزا محمد رضا اُمید کے حالات میں اکثر تاریخی واقعات اور قصص لکھے ہیں۔ خصوصاً میرزا محمد رضا اُمید کے تذکرے میں، امیر الامرا حسین علی خاں اور ان کے بھائی کے حالات بڑی خوبی سے تحریر کئے ہیں۔

۴۔ چوتھے، اس کتاب سے زمانہ کی سوسائٹی پر بھی روشنی پڑتی ہے اور یہ بات تو صاف نظر آتی ہے کہ ہمارے شاعروں کا گروہ عجیب بے فکرا تھا اور دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہ تھی آخر میں جب ہمارے بادشاہ تو اب اور امرا اس طرف جھکے، تو وہ بھی ایسے ہی ہو گئے ان لوگوں نے رہا سہا انہیں اور کھو دیا، ملک گیری اور ملک داری کبھی کی جا چکی تھی، اس لئے اولوالعزمی اور ہمت بھی اس کے ساتھ ہی رخصت ہو گئی۔ جسمانی اور دماغی قویٰ میں انحطاط پیدا ہو گیا تھا، ایسی حالت میں حقیقی مسرت کہاں! البتہ عارضی خوش حالی اور جھوٹی زندہ دلی موجود تھی، شعر شاعری نے اس کا سامان اور مہیا کر دیا "دیوانہ را ہوئے بس است" شاعروں کی بن آئی وہ تو اس شغل میں رہے اور یہاں کام تمام ہو گیا۔ اس زمانے کی سب سے بڑی علمی اور مہذب مجلسیں مشاعرے تھے، جن کے لئے بڑے بڑے اہتمام کئے جاتے تھے، اس کے خاص خاص آداب تھے بڑے بوڑھے، جوان، بچے سب ہی شریک ہوتے تھے، باکمال سخن وروں کو دل کھول کے داد دی جاتی تھی۔ کبھی کبھی بحث مباحثے ہوتے ہوتے لڑائی جھگڑے ہو جاتے اور تھکا فضیحتی تک نوبت پہنچ جاتی تھی، نوجوان ان مشاعروں میں شریک ہوتے اور اپنے کانوں سے تحسین و آفرین کے نعرے سنتے تھے جو شعرا کے لئے سب سے بڑی داد اور سب سے بڑا انعام تھا، تو اُن کے دل میں بھی اُمنگ پیدا ہوتی تھی کسی استاد کے پاس حاضر ہوتے شاگرد ہو گئے اور شعر کہنا شروع کر دیا۔ گویا شعر کہنے کے مصرف

کسی استاد کا شاگرد ہو جانا کافی ہے۔ یہ مشاعرے درحقیقت شاعرگرتھے میں ان شاعروں کو برا نہیں سمجھتا مگر جہاں یہی سب سے بڑی علمی اور ادبی مجالس ہوں تو ایسی سوسائٹی کی حالت کیا ہو گی۔

علاوہ اس عام حالت کے۔ تذکرے میں جو بعض باتیں ضمناً بیان کر دی ہیں وہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ ایک واقعہ، جس کا مجھ پر بھی اثر ہوا، یہ ہے کہ نواب وزیر اودھ اُس زمانے میں جب کہ ان کا عروج اقبال تھا اور بادشاہ نام کے بادشاہ رہ گئے تھے تب بھی شاہان دہلی اور اُن کے گھرانے کی بے انتہا تعظیم و تکریم کرتے تھے اور تعظیم بھی ایسی کہ آج کل کے نوجوانوں کے خیال میں بھی نہیں آسکتی چنانچہ میرزا جواں بخت جہاندار شاہ کے حال میں لکھا ہے کہ وہ ۱۱۹۸ھ میں دلی سے لکھنؤ چلے آئے تھے:

> نواب آصف الدولہ مرحوم نے، جو مراتب آداب خدمت گزاری ادا کیے، خواصی میں بیٹھنے کے سوا گھڑیوں ہاتھ باندھے سامنے کھڑے رہے باوصف اس ناز پروری کے کہ کبھی پیادہ قدم کاہے کو چلے تھے پانچوں ہتیار باندھے ہوئے ایک الائچی اور گلوری کی بخشش پر دس دس مرتبہ مجرا گاہ پر سے جا کر آداب بجالاتے تھے۔"

۵۔ پانچویں بعض ایسے لوگوں کا حال بھی دیا ہے جس کی نسبت اُردو کی شاعری کا گمان بھی نہیں ہو سکتا مثلاً کوئی کہہ سکتا ہے کہ شاہ ولی اللہ اُردو کے شاعر تھے اور اُن کا تخلص اشتیاق تھا' یا عبدالقادر بیدل بھی اُردو میں شعر کہتے تھے' یا تاناشاہ سے بھی ایک شعر منسوب ہے جو آدھا اُردو اور آدھا ہندی ہے بعض ایسے شعرا کا بھی کلام درج ہے کہ جن کا نام تو بہت مشہور ہے۔ مگر کلام دستیاب نہیں ہوتا شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد اپنے تذکرہ آبحیات میں لکھتے ہیں۔

"ایک موقعہ پر میر حسن مرحوم کا سفر شاہ مدار کی چھڑیوں کے ساتھ سطابق پڑا' چنانچہ سفر مذکور کا حال ایک مثنوی کے قالب میں ڈھالا ہے اس میں فیض آباد کی تعریف اور لکھنو کی ہجو کی ہے' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت عورتوں کی پوشاک وہاں کیا تھی اور چھڑیوں والوں کے جزئیات رسوم کیا کیا تھے میں نے یہ مثنوی دلی کی تباہی سے پہلے دیکھی تھی اب ملتی نہیں لوگ بہت تعریف لکھتے ہیں۔"

حسن اتفاق سے صاحب تذکرہ نے اِس مثنوی کا وہ حصہ' جس میں فیض آباد اور لکھنو کی ہجو ہے میر حسن کے حالات میں نقل کر دیا ہے' ناظرین کو لکھنو کی ہجو میں یہ شعر دیکھ کر بہت تعجب ہوگا۔

زبس کو نسے یہ شہر ہم عدو ہے   اگر شیعہ کہیے نیک اس کو بد ہے

اس مثنوی کا نام غالباً گلزارِ ارم تھا، میر حسن کے دوسرے کلام کا بھی انتخاب کیا ہے۔ درحقیقت کلام سب اچھا ہے مگر افسوس کہ آجکل نہیں ملتا۔

خواجہ میر درد کے بھائی، میاں سید محمد میر اثرؔ کی مثنوی خواب و خیال اب تک سنی ہی سنی تھی، اس کے چند شعر اثر کے حالات میں درج ہیں شمس العلماء مولوی شبلی نے اس پر مفصلہ ذیل نوٹ لکھا ہے جو کتاب کے صفحہ ۲۲ پر درج ہے:

"مولوی حالی صاحب نے اپنے دیوان کے مقدمہ میں لکھنو کی شاعری میں صرف نواب مرزا شوق کی مثنویوں کا اعتراف کیا ہے۔ لیکن چونکہ ان کے نزدیک شعرائے لکھنو سے ایسی فصاحت اور سلاست کی توقع نہیں ہو سکتی اس لئے اس کی وجہ یہ قرار دی کہ نواب مرزا نے خواجہ میر اثر کی مثنوی دیکھی تھی اور اس کا طرز اُڑایا تھا اس کا فیصلہ خود ناظرین کر سکتے ہیں کہ یہ مثنوی نواب مرزا کا ماخذ اور نمونہ ہو سکتی ہے۔"

ہمیں تعجب ہے کہ مولوی شبلی صاحب نے صرف "اعتراف" کا لفظ لکھا ہے، حالانکہ مولانا حالی نے ان مثنویوں کی بیحد تعریف کی ہے، سوائے ایک نقص کے جس سے خود مولوی شبلی صاحب کو بھی انکار نہیں ہو سکتا، اور یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ لکھنو کی شاعری میں صرف نواب مرزا

کی شاعری کو اعتراف کیا ہے بلکہ میرانیس کی شاعری کی اس قدر توصیف وثنا کی ہے کہ اس سے بڑھکر ممکن نہیں، یہاں تک کہ خود مولوی شبلی صاحب نے بھی موازنہ دبیر و انیس میں انہیں اتنا نہیں سراہا۔ اکثر لوگوں کو جنکی نظر ظاہر ہیں ہے اور سطح ہی پہ رہتی ہے، مولانا حالی سے یہ شکایت ہے کہ لکھنؤ کی شاعری کی مذمت کی ہے۔ حالانکہ مولانا نے کہیں اپنے دیوان میں لکھنؤ کی شاعری پر بحث نہیں کی عام شاعری پر، یا اُردو شاعری کے نشوونما اور اس کے مختلف اصناف پر بحث کرتے ہوئے تمثیلاً بعض اشعار یا کتب کا ذکر آگیا ہے اور اس میں دلی لکھنؤ والے دونوں ہیں، اس پہ سے لوگوں نے ایسا گمان کر لیا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مقدمہ دیوان حالی میں کوئی خاص لحاظ اس کا نہیں کیا گیا۔ اصل بات یہ ہے کہ ہمارے اہل وطن اپنی اور اپنے یار دوستوں یا عزیزوں یا بزرگوں کی کتاب پر تقریظ سننے کے شائق ہیں، تنقید کے روادار نہیں۔ مولانا حالی نے جو شاعری پر مقدمہ لکھا ہے وہ صرف ان کے دیوان کا مقدمہ نہیں، بلکہ اُردو میں فن تنقید کا پہلا مقدمہ ہے اس میں جو بعض ایسی رایوں کا اظہار کیا ہے، جو صرف ذوق سلیم اور عالی دماغ کا نتیجہ ہو سکتی ہیں تو لوگوں کے عام (بلکہ عامیانہ) خیالات کو صدمہ پہنچا اور وہ بُت جنہیں وہ مدت سے پوجتے چلے آرہے تھے یکایک متزلزل ہو گئے اور ڈھ گئے زیادہ تر یہ خیال گلزار نسیم کی نکتہ چینی سے پیدا ہو گیا ہے مولانا نے اس پر خواہ مخواہ اس لئے نکتہ چینی نہیں کی کہ وہ ایک لکھنوی کی لکھی ہوئی ہے، بلکہ درحقیقت وہ اس رتبہ کی مستحق نہیں ہے جو لوگوں نے

نا سمجھی سے اُسے دے رکھا ہے، مجھے تو اُلٹی یہ شکایت ہے کہ مولانا نے تنقید کا حق ادا نہیں کیا، صرف چند ایسی غلطیوں کی طرف اشارہ کر دیا ہے جو اگرچہ صریح اور بین ہیں مگر اس قدر۔ اور ایسی نہیں کہ جس سے اُس کی پوری قلعی کھل جائے حقیقت یہ ہے کہ اس مثنوی کو اُردو زبان سے کچھ تعلق ہی نہیں۔ مولانا کا اگر اس میں قصور ہے تو صرف اتنا کہ اُنھوں نے دن کو دن اور رات کو رات کہدیا ہے۔ اب ہم خواجہ اثر کی مثنوی کے طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

اول تو اِس مثنوی کی تعریف سب کرتے چلے آتے ہیں چنانچہ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ سا سخن فہم اپنے تذکرہ گلشن بےخار میں لکھتا ہے:

"مثنوی ایشان شہرت تمام دارد کہ بنائے آن
برمحاورہ بحث اوست ازیں جہت مرغوب عام"

مولوی محمد حسین آزاد آب حیات میں کہتے ہیں کہ

"ایک مثنوی خواب و خیال اُن کی مشہور ہے اور
بہت اچھی لکھی ہے"

دوسرے اُن کے کلام سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کیونکہ اس میں درد، زبان کی صفائی شستگی اور لطافت بدرجہ کمال موجود ہے اور یہ سب باتیں مثنوی کے لیے خاص طور پر مناسب ہیں، مگر صاحب تذکرہ نے غضب یہ کیا ہے کہ مثنوی کا وہ حصہ منتخب کیا، جس سے کسی طرح

صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ سراپا کا مضمون اس قدر مبتذل ہے کہ اس میں کوئی نیا مضمون پیدا کرنا یا اُس میں زبان کی فصاحت و سلاست دکھانا بہت مشکل ہے، اور چوں کہ اس مثنوی کی تعریف زیادہ تر زبان کی ہے اس لئے صرف سراپا کے چند اشعار پر سے حکم لگانا درست نہیں ہے۔ صاحب تذکرہ نے اپنے اس ذوق کا ثبوت اور بھی ایک آدھ جگہ دیا ہے، مثلاً جوشش کے کلام کو پسند نہیں کرتا، مگر انتخابی اشعار بہت اچھے ہیں، اسی طرح مصحفی کی تعریف کی ہے لیکن انتخاب اس قدر خراب دیا ہے کہ اس سے کسی طرح یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ کوئی اچھا شاعر ہے۔ لیکن اس کا کیا جواب ہے کہ جو شعر خواجہ اثر کا بہ تبدیل لفظ "شوق" نے اپنا کر لیا ہے یعنے۔

اثر — ہاتھا پائی میں ہانپتے جانا — کھلتے جانے میں ڈھانپتے جانا

شوق — ہاتھا پائی میں ہانپتے جانا — چھوٹے کپڑوں کو ڈھانپتے جانا

اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ایسا شعر یا خواجہ اثر کہہ سکتے تھے یا اُن کے بعد نواب مرزا شوق۔ اگر یہ شعر اُن کا ہے تو یہ کہنے کی پوری وجہ ہے کہ شوق کی نظر سے یہ مثنوی گذری ہے، تو اس طرز کا اثر ضرور اس پر پڑا ہوگا مولنا حالی فرماتے ہیں۔

خواب و خیال کے اکثر مصرعے اور شعر تھوڑے تفاوت سے بہارِ عشق میں موجود ہیں۔

یہ ایک مزید ثبوت ہے۔

دوسرے یہ بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ وہ مثنوی اُس زمانے میں

لکھی گئی جب کہ اُردو میں غالباً کوئی مثنوی نہ تھی باوجود اس کے مولانا حالی نے صاف لکھ دیا ہے۔

"اس میں شک نہیں کہ موجودہ حالت میں خواب و خیال کو بہار عشق سے کچھ نسبت نہیں ہو سکتی۔"

اخیر اس میں تو ظاہرا ایک حد تک کچھ گنجائش بھی نظر آتی ہے، مگر ہمیں افسوس ہے کہ مولوی شبلی صاحب نے اس سے بڑھکر ایک ریمارک مولنا حالی کی تنقید گلزار نسیم کے متعلق ایک خط میں لکھ دیا تھا جو پنڈت چکبست صاحب نے اپنے دیباچہ گلزار نسیم میں بطور رسند کے درج فرمایا ہے۔ تعجب ہے کہ ایک ایسے فاضل محقق اور صاحب ذوق کے قلم سے ایسے الفاظ نکلیں جو تحقیق اور ذوق سلیم سے کوسوں دور ہیں اور خصوصاً ایسی کتاب کی نسبت جو قطع نظر اس کے کہ اس میں زبان کا لطف نام کو نہیں، سینکڑوں لفظی اور معنوی غلطیوں سے پُر ہے، ہم اس موقع پر زیادہ بحث کرنا نہیں چاہتے، اور اس بحث کے لئے بھی ناظرین سے معافی چاہتے ہیں، موقع آپڑا تھا اس لئے یہ چند الفاظ لکھے گئے۔

۶۔ چھٹے صاحب تذکرہ نے بعض مقامات پر پردے ہی پردے میں خوب چوٹیں کی ہیں جس میں تعصب کی جھلک نظر آتی ہے مثلاً شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی نسبت لکھا ہے کہ

---

[1] صاحب تذکرہ شاہ ولی اللہ اشتیاق کے حالات اس نہج سے لکھے ہیں جس سے یہ دھوکا ہوا کہ اس کی مراد دلی کے نامور محدث شاہ ولی اللہؒ سے ہے۔ اب تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ

"قرۃ العین فی ابطال شہادت الحسین، اور جنت العالیہ
فی مناقب المعاویہ۔ اُن کی تصانیف سے ہیں۔"
حالانکہ ان مباحث میں ان کی کوئی تصنیف نہیں ہے۔ نہ شہادت
حسنین کا ابطال کیا ہے نہ مناقب معاویہ میں کوئی کتاب لکھی ہے، یہ محض
اتہام ہے، اِس کے بعد یہ کہہ کر کہ یہ والد ہیں شاہ عبدالعزیز کے خوب ہجو
ملیح کی ہے اور آخر میں یہ لکھا ہے۔"
"کیوں نہ ہو آخر کیسے باپ کا بیٹا ہے، فی الواقع کہ عالی
مقداروں کے عالی مقدار ہی ہوتے ہیں اور نابکاروں
کے نابکار بقول شاعر کے۔"

خیبر کے بچے میں غرض شیر سے افزودہ ہے، بھونک میں کتے کی بلی کی سگی ہوجو دہے

یا منظہر جانِ جاناں کے حالات میں لکھتے ہیں۔
"سنہ ۱۱۹۲ھ تھے کہ اس روشن ساز سال صدیقی نے اور اس مصقلہ
پرداز احکام فاروقی نے اس آئینہ زنگار آلود دنیا سے منہ پھیر لیا، اور سفر
خلفائے راشدین کی منازل کے طریق پر کیا۔"

بقیہ حاشیہ صفحہ (۹۰):۔ یہ شاہ ولی اللہ ایک دوسرے صاحب ہیں جو حضرت مجدد الف ثانی
کی اولاد سے تھے۔ دلی میں رہتے تھے اور متوکل درویش تھے۔ اُن کی جن تصانیف کا ذکر اس
تذکرہ میں کیا گیا ہے اُن کا کہیں پتہ نہیں لگتا۔ (ملاحظہ ہو نکات الشعرا صفحہ ۶ مطبوعہ انجمن
ترقی اردو)۔

یا تانا شاہ کے حالات میں مؤلف عالمگیر کی نسبت یوں گوہر فشانی کرتا ہے کہ

"خلد مکاں نے استیصال بادشاہان دکن کا جو اس محنت سے کیا، اور مکہ مسجد کو کھدوا کے وہ کچھ مظلمہ اپنی گردن پر لیا۔ خدا جانے اس حرکت کا کیا مفاد ہے"

مکہ مسجد کا کھدوانا نرا بہتان اور صریح جھوٹ ہے، تعجب ہے کہ مؤلف نے جو خود حیدرآباد میں رہا ہے، اس کذب کا لکھنا کیوں کر گوارا کیا ہمیں شاید ناظرین کو یہ اطمینان دلانے کی ضرورت نہیں کہ مکہ مسجد موجود ہے اور اب تک نظر بد سے محفوظ ہے۔ لیکن قطع نظر ان امور کے وہ بعض وقت سچ کہنے سے بھی درگذر نہیں کرتا، مثلاً نواب آصف الدولہ کے حالات میں، ان کی داد دہش اور مروت کی بے انتہا بخشی کی ہے لیکن آخر میں صاف لکھ دیا ہے۔

"افسوس یہ ہے کہ فوج اور ملک کے طرف سے غفلت تھی، نائبوں کے ہاتھ میں اصالتاً ملک کا سرانجام رکھا، آپ سیر و شکار سے کام رکھا، مشیر کوئی لائق اور کام کا نہ پایا اس واسطے ساتھ عزم کے رتبہ نام کا نہ پایا"

یا سراج الدین علی خاں آرزو نے، جو نکتہ چینی شیخ علی حزیں کے کلام پر کی ہے اس کی نسبت لکھتے ہیں کہ

"عوام کی طبیعت تو ان اعتراضوں سے البتہ تشویش
میں پڑتی ہے، نہیں صاف نزاع معلوم ہوتی ہے،
جب باریک بینوں کی نگاہ اُس سے جا لڑتی ہے۔"

اِس تذکرے کے پڑھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اکثر شاعر اور خصوصاً نامور اور مشہور اساتذہ سب کے سب دلّی کے تھے۔ دلّی کو جہاں یہ فخر ہے کہ اُردو نے اِس میں جنم لیا وہاں اس کا یہ فخر بھی بجا ہے کہ جتنے اعلیٰ شاعر ہوئے ہیں وہ یہیں کے تھے۔ اگر تاریخ پر نظر ڈالی جائے، یہ شہر بھی عجیب و غریب نظر آتا ہے، زمانہ قدیم سے محسود آفاق اور مرجع خلایق رہا کبھی راجاؤں اور مہاراجاؤں کی راجدھانی، کبھی سلاطین اسلام کا دارالخلافت کبھی طغیانی کی بدولت بگڑ کر خراب ہوا اور رفتہ رفتہ پھر آباد رہا کبھی معرکہ جنگ و جدل وقتل عام ہے اور کبھی دن عید اور رات شب برات ہے، کبھی تخت گاہ شاہان اور مرجع کمال ہے اور کبھی ایک مطلق العنان سوار کی لٹک سے خاصہ کھنڈر ہے، کبھی مورد بلیات و آفات ہے اور کبھی منزلِ حسنات و برکات۔ غرض یہ نگری یوں ہی اُجڑتی اور بستی، بگڑتی اور بنتی رہی، مگر باوجود اس کے اس کے حسن عالم افروز میں نئی ادا پیدا ہوتی رہی، اور ہر حادثے کے بعد فوراً سنبھل گئی لیکن آخر زمانے میں جب سلطنت مغلیہ میں انحطاط اور زوال کی علامات پیدا ہو گئیں تو دو ایک دھچکے ایسے لگے کہ پھر پنپنا محال ہو گیا۔

سب سے اول نادر شاہ کے حملے کا ایسا تھپیڑا لگا کہ اُس نے تباہی

تو دیا۔ اس کے سترہ برس بعد ہی احمد شاہ درانی کی چڑھائی ہوئی، پھر مرہٹوں نے وہ اودھم مچائی کہ رہا سہا سب خاک میں ملا دیا۔ اب تک جو باکمال دلی میں پڑے وضعداری نباہ رہے تھے، اِن حادثوں کے بعد وہ بھی نہ ٹک سکے، سوائے ایک میر درد کے جن کی نسبت صاحب تذکرہ لکھتے ہیں۔

جن ایام میں معمورہ شاہجہاں آباد کا اور ہر ایک کوچہ اُس خجستہ بنیاد کا، مجمع اہل کمال سے اور کثرت منتخبان عدیم المثال سے، رشک ہفت اقلیم اور غیرت جنت النعیم تھا، تو معمورے پر شہر کے عرصہ ربع مسکون کا تنگ اور اس خراب آباد کو تشبیہ سے ہفت اقلیم کے ننگ تھا جب کہ متواتر نزولِ آفات کے باعث اور مکرر ورودِ بلیات کے سبب خراب ہوا اور مصدر عقوبت و عذاب ہوا تو ہر ایک گوشہ نشین نے اور ہر ایک صابر زاویہ گزیں نے اور ہر ایک تونگر مالدار نے اور ہر امیر عالی مقدار نے فرار کو غنیمت جانا اور بھاگے اُدھر کو جدھر پایا ٹھکانا، مگر وہ سید والا تبار کہ نام نامی اس کا خواجہ میر تھا، اس قطب آسمان استقلال نے خیال بھی جگہ سے سرکنے کا نہ کیا، متحمل بلاؤں کے اور حامل جفاؤں کے ہوئے اور شاہجہاں آباد کو

چھوڑ کر ایک قدم راہ اپنے کنجِ عزلت سے نہ گئے۔"

ایسے وقت شاعر بیچارے توکس گنتی میں ہیں، بڑے بڑے وضعدار وں اور متوکلوں کی ٹھیک تحمل باقی ہے۔ دلی کے اُجڑنے کے بعد لکھنو آباد نظر آتا تھا۔ اقبال نے کچھ دنوں سے اس کا ساتھ دیا، اب لے دے کے صرف یہی ایک ٹھکانا اور آسرا مسلمانوں کا رہ گیا تھا، آصف الدولہ سالکہ لٹ نواب تھا اہل کمال کی قدر ہونے لگی، پھر تو جو اُٹھا وہیں پہنچا اور پہنچ کر وہیں کا ہو رہا۔ غالباً سب سے پہلے نادر شاہ کی تباہی کے بعد سراج الدین علی خاں آرزو پہنچے اس کے بعد سودا تشریف لے گئے سودا کے انتقال کے بعد میر تقی نے ۱۱۹۶ھ میں دلی سے لکھنو کوچ فرمایا۔ میر صاحب کے جاتے ہی دلی سونی ہو گئی اور میر حسن، میر سوز، جراءت، سب لکھنو میں جا بسے اور دلی کی رونق لکھنو میں آگئی۔ اس طرح لکھنو کی شاعری کی ابتدا ہوئی، اب یہ امر کہ لکھنو کی سوسائٹی کا اردو زبان اور اردو شاعری پر کیا اثر ہوا اس وقت ہماری بحث سے خارج ہے۔ مجھے خیال تھا کہ اس تذکرے سے میر انشاء اللہ خاں کے متعلق کوئی بات معلوم ہو گی اور کم سے کم اس قصے کی تحقیق ہو جائے گی جو شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد نے ان کے اخیر زندگی کے متعلق لکھا ہے۔ مگر یہ تذکرہ ۱۲۱۵ھ میں لکھا گیا، اور ۱۲۱۵ھ تک میر انشاء اللہ خاں، میرزا سلیمان شکوہ کے ہاں ملازم تھے یا اسی سال نواب سعادت علی خاں کے ہاں رسائی ہوئی، کیوں کہ میرزا سلیمان شکوہ اس سال (۱۲۱۵ھ) لکھنو سے واپس دلی چلے گئے۔ یہ واقعہ آزاد نے سعادت یار خاں رنگین

کی زبانی بیان کیا ہے، صرف یہ لکھ کر تمام واقعہ بیان کر دیا ہے کہ سعادت یار خاں رنگین کہا کرتے تھے" مگر یہ نہ معلوم ہوا کس سے کہتے تھے اور آزاد نے کس سے سنا۔ آب حیات میں بعض بعض جگہ وہ مجالس رنگین کا حوالہ دیتے ہیں، مگر مجالس رنگین میں اس واقعہ کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ اتفاق سے مجالس رنگین بھی ۱۲۱۵ھ میں لکھی گئی۔ میر انشاء اللہ خاں اور سعادت یار خاں رنگین دونوں مرزا سلیمان شکوہ کے ہاں ملازم تھے اور چونکہ یہ واقعہ بہت بعد کا ہے اس لئے یوں بھی اس میں نہیں ہو سکتا تھا۔ اچھا ہوتا اگر مولوی محمد حسین آزاد اس روایت کا سلسلہ بیان کر دیتے۔

مؤلف نے اپنے دیباچہ میں بیان کیا ہے۔

"یہ کتاب ہم نے دو حصوں میں لکھی ہے، یہ پہلا حصہ ہے جس میں سلاطین نامدار امرائے عالی مقدار اور شعرائے صاحب وقار کے حالات لکھے گئے ہیں دوسری جلد میں غیر مشہور شعراء کا تذکرہ ہوگا"

اس دوسری جلد کے متعلق ہمیں کوئی اطلاع نہیں کہ لکھی گئی تھی یا نہیں۔ مؤلف نے شعراء کا کلام جو بطور انتخاب کے درج کیا ہے اس میں اتنا تصرف کیا گیا ہے کہ جن لوگوں کے کلام چھپ چکے ہیں ان کے انتخابی کلام کو پبلشر نے کم کر دیا ہے، صرف اعلیٰ درجہ کے اشعار رکھے ہیں، مگر جن شعراء کا کلام نہیں چھپا اُن کے کلام کو بجنسہ ویسا ہی رہنے دیا ہے خود مؤلف نے اپنے کلام سے صفحہ کے صفحے رنگ دئیے تھے اس میں بھی انتخاب

کر دیا گیا ہے۔

اب مجھے اس تذکرے کے متعلق اس قدر اور کہنا باقی ہے کہ اِس کے طبع ہونے سے اُردو لٹریچر میں ایک قابل قدر اضافہ ہوگا اور جو لوگ اُردو زبان کی ترقی کے خواہاں ہیں وہ ضرور اس کی اشاعت میں کوشش فرمائیں گے۔

اکتوبر ۱۹۰۶ء

مدرسہ آصفیہ حیدرآباد دکن

مقدمہ مآثر الکرام

(مصنفہ حسان الہند مولانا غلام علی آزاد بلگرامی)

حسان الہند[1] مولانا غلام علی آزاد بلگرامی اِن علمائے ہند میں سے ہیں جن کا نام اِس ملک میں ہمیشہ یاد رہے گا وہ نرے ملا ہی نہ تھے بلکہ ادیب و شاعر مورخ و محقق بھی تھے اور ان کی تالیفات و تصنیفات خود اس امر کی شاہد ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ہندوستان کے عہد اسلامی میں ایسی ایسی تاریخیں لکھی گئی ہیں کہ جنکی نظیر فارسی زبان میں نہیں لیکن مغلیہ سلطنت کے انحطاط کے ساتھ صحیح فن تاریخ نویسی میں انحطاط شروع ہوگیا تھا، البتہ مولانا غلام علی آزاد نے اس فن کی لاج رکھ لی اور آخر وقت میں بھی ذوق صحیح کی داد دی۔ ان کی تصانیف میں سے زیادہ تر فن تاریخ کی اس شاخ کے متعلق ہیں جسے فن اسماء الرجال کہتے ہیں اور آزاد نے اِس بات[2] پر فخر ظاہر کیا ہے کہ ہندوستان میں پہلے وہی ہیں جنہوں نے

---

[1] حسان الہند میر غلام علی آزاد بن سید نوح بلگرامی یکشنبہ سنہ ۱۱۱۶ھ میں ۲۵ ماہ صفر قصبہ بلگرام میں پیدا ہوئے اور سنہ ۱۲۰۰ھ میں بمقام روضہ جو خلد آباد اورنگ آباد دکن میں ایک مشہور مقام ہے چوراسی سال کی عمر میں وفات پائی۔

اِس فن پر قلم اُٹھایا ہے۔ اگرچہ ان سے پہلے صاحب تاریخ نظامی، ملا عبدالقادر بدایونی اور علامہ ابوالفضل اپنی اپنی تاریخوں میں اپنے اپنے عہد کے امراء و علماء، کملاء کے حالات لکھ چکے ہیں، البتہ یہ ضرور ہے کہ مولانا آزاد نے اِسمیں خاص اہتمام کیا ہے اور اِس فن کی طرف خاص توجہ کی ہے۔ اُن لوگوں نے اپنے عہد کے مشاہیر کے حالات اپنی تاریخوں میں ضمیمے کے طور پر لکھے تھے آزاد نے اسے الگ فن قرار دیکر مختلف رسالے لکھے ہیں[۱]۔

ماثر الکرام جو اب پہلی بار مولوی عبداللہ خاں کی سعی سے طبع ہوئی ہے اسی فن سے متعلق ہے۔ یہ کتاب عموماً ہندوستان اور خصوصاً فقرا و علمائے بلگرام کے حالات میں ہے۔ آزاد نے اس کتاب کی تالیف سے نہ صرف

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴۹ — سلے۔ وپیش ازین احدے آستین سعی باین درجہ نہ شکستہ و کمر خدمت بزرگان صنف وملت بایں جد وجہد نہ بستہ (دیکھو دیباچہ کتاب)

[۱] سرو آزاد شعرا کا تذکرہ۔ ید بیضا۔ شعرا کا تذکرہ۔ خزانہ عامرہ: ان شعرا کے حالات میں جن کو دربار شاہی سے صلے ملے ہیں۔ روضۃ الاولیاء صوفیہ کے حالات میں۔ سبحۃ المرجان علماء کے تذکرہ میں۔ ماثر الکرام؛ علماء و صوفیہ کے حالات میں، نیز نواب صمصام الدولہ شاہ نواز خاں کی بے نظیر تالیف ماثر الکرام کی تکمیل و تہذیب میں جو سعی آزاد نے کی وہ بھی بہت قابل قدر ہے دیکھو دیباچہ ماثر الامرا۔ نیز آزاد کے اُن خطوط سے جو مولوی سید احمد صاحب زید بلگرامی مرحوم کے پاس تھے یہ امر ظاہر ہے۔

اپنے وطن کا حق ادا کیا بلکہ فن رجال میں ایک قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ بلگرام ایک مردم خیز بستی ہے۔ اور اس معدن علم و فضل سے ایسے ایسے بے بہا لعل نکلے ہیں جن کے نام اِس سرزمین میں ہمیشہ روشن رہیں گے اور خوشی کی بات ہے کہ یہ فضیلت اسے اس وقت تک حاصل ہے۔ یوں بھی قصبات اور شہروں کی حالت میں بہت تفاوت ہے، آب و ہوا کی خوبی اور صفائی اخلاق کی سادگی و بے ریائی تکلفات اور تصنع سے بری مسابقہ اور منافسہ کی کشمکش سے محفوظ مسلک کی پختگی، یہ اور بعض اور وجوہ ایسے ہیں کہ جن کے سبب اہل قصبات کے جسم و دماغ اہل شہر کی نسبت زیادہ صحیح ہوتے ہیں۔ اگرچہ شہر کی ترغیبات ان میں سے اکثر کو اسی منڈے میں کھینچ لے جاتی ہیں جہاں چند نسلوں کے بعد ان میں انحطاط شروع ہو جاتا ہے۔ اگر علماء و فضلاء و دیگر مشاہیر کی فہرست پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اہل قصبات کا ملک پر بہت بڑا احسان ہے۔

کاش مولانا آزاد کی طرح دوسرے اہل قصبات بھی اس بات کا خیال رکھتے اور اپنے اپنے قصبے کے علماء و فضلاء و صوفیا و دیگر مشاہیر کے حالات قلم بند کر ڈالتے تو ہندوستان کی تاریخ کو اس سے بہت بڑی مدد ملتی۔ ہندوستان میں بکثرت ایسے قصبات[1] ہیں کہ اگر وہاں کے حالات یا تاریخ لکھی جائے تو ایسی مفید معلومات

---

[1] مثلاً پانی پت۔ بدایون۔ خیر آباد۔ امیٹھی۔ موہان۔ سرہند۔ سہالی وغیرہ وغیرہ۔

اس سے حاصل ہو سکتے ہیں جس کا بڑی بڑی مبسوط تاریخوں میں پتہ نہیں۔ اس کتاب کے لکھنے میں مولانا نے خاص محنت کی ہے اور صرف کتب تاریخ متداولہ ہی تک تلاش و جستجو کو محدود نہیں رکھا بلکہ "اہالی و حوالی شہر" سے بھی حالات دریافت کئے اور نیز "مجلات شرعیہ" سے جو بزرگوں کی یادگار سے باقی تھے استفادہ کیا۔

یہ کتاب اول بلگرام میں لکھنی شروع کی تھی لیکن درمیان میں یعنی ۱۱۵۱ھ میں حج کے قصد سے مکہ چلے گئے زیارت حرمین شریفین سے واپس ہو کر دکن میں قیام کیا اور وہیں نامکمل مسودہ منگوا کر اختتام کو پہنچایا۔ تاریخ اختتام کتاب "ختامہ مسک" سے نکلتی ہے۔

افسوس ہے کہ مولانا آزاد نے اس کتاب میں کسی قدر اختصار کو مدنظر رکھا ہے اگر وہ اس زمانہ کی صحبتوں اور معاشرت اور طریقہ تعلیم و تعلم پر ذرا اور وسیع نظر ڈالتے تو یہ کتاب بہت زیادہ دلچسپ اور مفید ہو جاتی۔ لیکن تاہم جو کچھ انہوں نے کیا ہے وہ بہت قابل قدر اور نیز قابل تقلید ہے۔ زمانہ حال و گذشتہ کے حالات اور خصوصاً ان لوگوں کے تذکرے جو اس کارزار حیات میں جہاں قدم قدم پر ٹھوکر لگنے کا اندیشہ ہے اپنی ہمت اور ریاضت سعی اور مشقت سے پایہ کمال کو پہنچے ہیں انسان کے اخلاق پر عجیب و غریب اثر ڈالتے ہیں جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ طلبہ تحصیل علم کے شوق میں بے زاد و راہ شہر بشہر پھرتے ہیں کھانے کی پرواہ ہے نہ کپڑے کی فکر مگر تحصیل علم کی دھن میں

ہمنوا ان سلے کہ گئے عین سرچشمہ پر پہنچتے اور سیراب ہو کر واپس آتے ہیں اور اس کے بعد جو کچھ حاصل کیا ہے اس سے دوسروں کو فیض پہونچاتے ہیں اور یہی نہیں بلکہ اسے ثواب کا کام خیال کرتے ہیں اور اس سے بھی بڑھکر یہ کہ اگر وہ کسی شاہی خدمت وغیرہ پر مامور ہو گئے ہیں تو بھی فرصت کے وقت سلسلہ درس و تدریس جاری ہے اور اس کے ساتھ ہی تالیف بھی ہوتی رہتی ہے۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں اور آجکل کی حالت پر نظر ڈالتے ہیں جبکہ علم کا چرچا گھر گھر ہے تو ہمیں ایک عجیب فرق نظر آتا ہے محنت اور ریاضت اب بھی غالباً اتنی ہی کرنی پڑتی ہے لیکن تحصیل علم کی وہ چینک اور وہ دھن جو پہلے لوگوں میں تھی آجکل اس کے مقابلہ میں کم ہے اس کی زیادہ تر وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ پہلے حصول علم میں آزادی تھی اور آجکل یونیورسٹی کی پابندیوں نے ایسا جکڑ دیا ہے کہ اگر کچھ شوق ہوتا بھی ہے تو دب دبا جاتا ہے۔ دوسری ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ آجکل علم زیادہ تر حصول ملازمت سرکاری کے لئے حاصل کیا جاتا ہے، علم کو علم کی خاطر شاذونادر ہی کوئی پڑھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حالانکہ آجکل طلبہ کی کثرت ہے مگر حقیقی علم یا علم کا حقیقی شوق کم ہے۔ اور اگر ہے بھی تو اس کی چنداں قدر نہیں۔ کون ہے جس کے دل میں قاضی عبد المقتدر کے تذکرے کے پڑھنے سے جو اسی کتاب میں ہے جوش اور ولولہ پیدا نہ ہوگا۔ لکھا ہے کہ سلطان محمد بن تغلق شاہ نے مولانا معین الدین عمرانی دہلوی کو ولایت فارس میں قاضی یحییٰ کے پاس بھیجا اور یہ عرض کرائی کہ آپ ہندوستان

تشریف لے چلیں اور متن مواقف کو سلطان محمد کے نام سے معنون فرمائیں سلطان ابو اسحاق والی شیراز کو جو یہ معلوم ہوا تو دوڑا ہوا آیا اور کہا کہ یہ سلطنت حاضر ہے اسے لے لیجئے اور جو خدمت آپ فرمائیں اس کے بجالانے کو میں حاضر ہوں مگر للہ آپ یہاں سے نہ جائیے۔ ایسی قدردانی کی نظیر مشکل سے ملیگی اور شاید یہ شخصی سلطنت ہی میں ممکن ہے۔ غالباً شخصی سلطنت کے نام سے ناظرین کے کان کھڑے ہونگے لیکن اصل یہ ہے کہ حکومت کی کوئی صورت بری نہیں بشرطیکہ صحیح اُصول کو پامال نہ کیا جائے لیکن اگر صحیح اُصول پر نظر نہیں تو حکومت کی ہر صورت خواہ قیاسی طور سے کیسی ہی اعلیٰ کیوں نہ ہو مذموم ہے۔

حصول علم کے شوق میں ایک اور بات بھی مضمر ہے جو سب سے زیادہ قابل قدر ہے۔ انسان کو انسان بنانے والی یعنی اسکا کیرکٹر سنوارنے والی جو شئے ہے وہ شوق و سعی اور ریاضت و محنت ہے، خصوصاً جب کہ مدعا حصول اغراض نفسانی نہ ہو۔ ان لوگوں کے کیرکٹر میں ایک خاص بات پیدا ہو جاتی ہے اور یہ صرف اُنہیں لوگوں میں پائی جاتی ہے جن کے دلوں میں کسی اعلیٰ مقصد کے حاصل کرنے کی لو لگی ہوتی ہے اور جو اِس دُھن میں دن کو دن سمجھتے ہیں اور نہ رات کو رات، مصیبت کو مصیبت خیال کرتے ہیں نہ راحت کو راحت، مگر راہِ طلب میں برابر قدم بڑھائے ہوئے چلے جاتے ہیں اور گو آخر میں گوہر مقصد ہاتھ آئے یا نہ آئے مگر ایک ایسی چیز ہاتھ لگ جاتی ہے جو اس سے زیادہ نایاب اور اُس سے

کہیں بیش بہا ہے یعنی انسانیت یا دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ صفائی باطن۔ کون ہے کہ جس کے دل پر شاہ رحمت اللہ بلگرامی قدس سرہٗ کے تذکرے کے پڑھنے سے جو اس کتاب میں درج ہے ایک خاص اثر یا ایک خاص کیفیت طاری نہ ہوگی۔ ان کے دوسرے حالات کے ضمن میں مولنا آزاد لکھتے ہیں کہ اون کے ایک عزیز کی زبانی منقول ہے کہ میں اور شاہ رحمت اللہ صاحب قدس سرہٗ قصبہ سانڈی سے بلگرام جارہے تھے دیکھتے کیا ہیں کہ سانڈی کے باغستان میں کسی نے چور کو مار کر درخت سے لٹکا دیا ہے یہ دیکھتے ہی شاہ صاحب نے فرمایا ذرا ٹھیرو اور آگے بڑھکر چور کے پاؤں چوم لئے میں نے پوچھا حضرت یہ کیا ہے! فرمایا کہ اس چور نے اپنے شیوہ کو پایۂ کمال تک پہونچا دیا خدا تعالیٰ ہر شخص کو اپنی اپنی راہ میں اسی طرح ثابت قدم رکھے۔

ایسے بزرگوں کے تذکرے جنہوں نے اپنے تن دھن من کو تحصیل علم، تزکیہ نفس یا رضاجوئی باری تعالیٰ میں وقف کر دیا تھا اس زمانہ کے لئے جبکہ ہر طرف سے مادیت کا شور دنیا دنیا کی پکار اور پیٹ کی دہائی سنائی دیتی ہے بہت کارآمد اور مفید ثابت ہوں گے۔ پند و نصائح اور اخلاقی کتب اس قدر مفید نہیں ہوتیں جسقدر ان لوگوں کے تذکرے جو خود پاکیزہ اخلاق کے نمونے تھے۔ وہ صرف باتیں ہیں اور یہ کام، وہ صرف مردہ الفاظ ہیں اور یہ زندہ اعمال۔ لہذا اس کے اُس کے اثر میں بہت بڑا فرق ہے

مولنا آزاد نے اپنے وطن کے علاوہ اپنے صوبہ کی بھی بہت

کچھ تعریف کی ہے اور ان کی تعریف بجا ہے۔ درحقیقت جیسا کہ اُنہوں نے لکھا ہے پورب قدیم الایام سے معدن علم وعلما رہا ہے، علم وفضل کے چرچے اب تک وہاں جاری ہیں۔ ترویج علم کے لئے سلاطین و حکام کی طرف سے وظائف وزمین و مدد معاش مقرر تھی اور اس غرض کے لئے مساجد مدارس، خانقاہیں بنوائی جاتی تھیں، طلبہ دور دور سے آتے تھے اور صاحب توفیق ان کی خاطر تواضع اور خدمت کو سعادت عظمیٰ سمجھتے تھے آزاد نے لکھا ہے کہ شاہجہاں کا یہ قول تھا کہ "پورب شیراز مملکت ماست" لیکن سلطنت مغلیہ کے زوال کے ساتھ ہی مدارس اور خانقاہوں پر اوس پڑ گئی، درس وتدریس کا بازار سرد پڑ گیا اور وہ جوش دھیمے ہو گئے۔ ہندوستان میں پہلے عام طور پر تعلیم کا یہی طریقہ تھا جس کے نشان اب بھی کہیں کہیں نظر آتے ہیں اب نیا دور شروع ہوا ہے اور زمانے نے دوسرا رنگ بدلا ہے اور مشرق کی ہر چیز میں مغرب کا جلوہ نظر آرہا ہے۔

لیکن جہاں ہمیں اس زمانے کے علمی ذوق وشوق کو دیکھکر مسرت ہوتی ہے وہاں ایک بات کا افسوس بھی ہوتا ہے۔ اُس زمانہ کے نصاب تعلیم پر جب نظر ڈالی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ جو حلقہ کہ کچھ عرصے پہلے علمانے کھینچ دیا تھا اس سے باہر قدم رکھنا اُنہیں قسم تھا۔ فقہ وحدیث و تفسیر منطق وفلسفہ وعلم کلام پر سارا زور تھا، ساری طباعی اور ذہانت اسی پر ختم تھی یہاں تک کہ کتابیں بھی زمانہ دراز سے ایک ہی چلے آتی تھیں اور انہیں پر حاشیہ اور شرح پر شرح اضافہ ہوتی

جاتی تھی۔ علوم طبیعیات کا تو کیا ذکر ہے تاریخ و جغرافیہ بھی جس میں مسلمانوں نے خاص امتیاز حاصل کیا تھا خارج از بحث تھا۔ غرض صدہا سال سے ہمارے ہاں کی تعلیم حالت جمود میں تھی سالہا سال کی بربادی اور تباہی کے بعد اب کہیں جا کے ہمارے علمار کی آنکھیں کھلی ہیں اور آنکھیں کیا کھلی ہیں دعا دینی چاہیئے اس باہمت اور عالی دماغ شخص کو جس نے اس زمانے میں مسلمانوں کے سر سے بہت سی بلاؤں کو ٹالا اور مسلمانوں کو ان کی نازک اور پرخطر حالت سے آگاہ و خبردار کیا۔ یہ اوس کا طفیل نہیں تو اور کیا ہے کہ اسی کے صحبت یافتہ اور اسی کے دار العلوم کے تربیت یافتہ ایک بزرگ عالم نے قدیم سلسلہ تعلیم میں انقلاب پیدا کرنے کا بیڑا اُٹھایا ہے۔ چنانچہ اس کے لئے سامان مہیا ہوتے جاتے ہیں خدا اس کی ہمت میں برکت اور اس کے مقصد میں کامیابی عطا فرمائے اس کام میں کامیابی یقینی ہے۔ کیونکہ یورپین السنہ و علوم سے جو نفرت مسلمانوں کے دل میں تھی وہ مرحوم ریفارمر بڑی جانکاہی سے رفع کر گیا ہے اور وہ طوفان بے تمیزی جو اُس وقت برپا ہو گیا تھا اب فرو ہو گیا ہے اور راستہ خس و خاشاک اور جھاڑ جھنکاڑ سے صاف ہے اور لوگ اس تغیر کے لئے آمادہ ہیں۔ عام لوگ تو اسے دینی کام خیال کر کے اس کی امداد باعث ثواب جانتے ہیں اور انگریزی تعلیم یافتہ یا دوسرے لوگ جو زمانہ کی ضروریات سے واقف ہو چلے ہیں اس کی اہمیت کو مانکر اس کے ساتھ ہیں۔ کیا تعجب ہے کہ اس تحریک کا یہ نتیجہ ہو کہ علوم شرقیہ و مغربیہ کو سمو کر ایک نیا کورس تیار کیا جائے

جو ہماری ضروریات اور حالت کے زیادہ مناسب اور زیادہ کارآمد ہو۔ البتہ اس قدر افسوس ہے کہ ہمارے علما نے واجب التعظیم محرک کے ہاتھ بٹانے میں بہت کم مددوی ہے بلکہ جنہیں اندرونی حالات سے واقفیت ہے وہ جانتے ہیں کہ بہ نسبت علما کے غریب دنیاداروں سے زیادہ امداد ملی ہے اور انہیں کے سہارے پر اب تک سارا کام چل رہا ہے۔

ایک بات تاریخی حیثیت سے اس تذکرہ میں خاص طور پر قابل لحاظ ہے وہ یہ کہ اون علما، وفضلائے بلگرام میں سے جن کا اس میں ذکر ہے ایک بھی اہل تشیع میں سے نہیں۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیعہ مذہب نے وہاں بعد کے زمانہ میں رواج پایا۔ اور اگر ان علما میں سے بعض کی اولاد اب بھی وہاں باقی ہے اور وہ شیعہ مذہب پر ہے یا ان کے نسب ناموں میں اُن علما، کے نام نکلیں تو ہمارا یہ خیال اور بھی قوی ہوجائیگا۔ یہ امر واقعی ہے کہ اودھ کی سلطنت نے خاص کر آس پاس کے اضلاع و قصبات پر اور بعض اوقات دور دراز کے مقامات پر بھی مذہبی لحاظ سے خاص اثر ڈالا ہے چنانچہ جونپور و دیگر مضافات لکھنو وغیرہ کے حالات پر نظر ڈالنے سے یہ امر پایۂ تیقن کو پہونچ جاتا ہے۔ جب مذہب کی پشتی پر حکومت ہوتی ہے تو حالت اندیشناک ہوجاتی ہے میرا اِس سے ہرگز یہ مطلب نہیں کہ سلطنت اودھ نے مذہب کے معاملہ میں کبھی جبر و تعدی سے کام لیا۔ بلکہ بات یہ ہے کہ جاہ طلبی اکثر لوگوں کی نیت کو جو اعتقاد کے

کچے ہوتے ہیں ڈانواں ڈول کر دیتی ہے۔ ایسا ہر جگہ موجود ہے اور یہی اودھ کے اکثر مقامات میں ہوا اور قصبہ بلگرام بھی اس اثر سے نہ بچا۔ معلوم ہوتا ہے کہ آزاد کے زمانے میں اہل تشیع وہاں نہ تھے اور اگر تھے تو خال خال لیکن بعد کے زمانہ میں حکومت کے اثر سے اس کا قدم وہاں پہونچا ہے۔

آزاد نے حسب عادت میر سید محمد الترمذی کے تذکرہ میں شیخ محب اللہ الہ آبادی کی کتاب تسویہ کا اچٹتا ہوا سا ذکر کر دیا ہے۔ لیکن اس کتاب کا واقعہ بڑا دلچسپ ہے اور اس لئے ہم اُسے یہاں کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کرنا چاہتے ہیں۔ اس سے ایک تو یہ معلوم ہوگا کہ بادشاہ اورنگ زیب انار اللہ برہانہٗ کا جزئیات پر بھی ایسی ہی نظر تھی جیسی کلیات پر۔ دوسرے یہ معلوم ہوگا کہ بعض باخدا لوگ ایسے بھی موجود تھے کہ وہ اورنگ زیب جیسے سخت گیر اور پر جلال شہنشاہ کی پرواہ نہیں کرتے تھے تیسرے اس سے دینیات کے ایک معرکۃ الآرا مسئلہ پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

رسالہ تسویہ شیخ محب اللہ الہ آبادی کی تصنیف سے ہے جو ایک درویش اور صوفی تھے اس میں علاوہ اور امور کے جبرئیل و وحی کی حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

جبرئیل محمد در ذات محمد بود صلے اللہ علیہ وسلم

وہمچنیں جبرئیل با ہر پیغمبرے در ذات وے بود

وآں قوت باطنی ایشاں بود کہ در غلبہ آں قوت

وحی ایشان نازل می گردید وہمدا جبرئیل با ہر پیغمبرے

بزبان وے سخن گفتہ؟

جب یہ رسالہ (جو عربی زبان میں ہے) شاہ اورنگ زیب کی نظر پڑا تو انکار عظیم کیا۔ شیخ اس زمانہ میں رحلت کر گئے تھے لیکن اُن کے مریدوں میں سے دو شخص پائے تخت میں موجود تھے، ایک میر سید محمد جو ملازم شاہی اور امرائے دربار میں سے تھے، دوسرے شیخ محمدی جو لباس درویشی و زہد میں تھے۔ اول بادشاہ نے میر سید محمد سے تسویہ کی اس عبارت کی شرح دریافت کی۔ سید نے شیخ کی مریدی سے انکار کر دیا۔ بعد ازاں شیخ محمدی کے پاس پیغام بھیجا کہ اگر تمہیں شیخ کی مریدی کا اقرار ہے تو احکام شریف سے اس رسالہ کے مقدمات کو مطابق کر کے بتاؤ اور اگر مطابق نہیں کر سکتے تو اُس کی مریدی سے استغفار کرو اور کتاب کو آگ میں ڈالدو۔ شیخ محمدی نے جواب دیا کہ نہ مجھے اُن کی مریدی سے انکار ہے نہ استغفار کی ضرورت۔ لیکن جس مقام سے شیخ نے گفتگو کی ہے مجھے وہاں تک رسائی حاصل نہیں ہے جس وقت میں اِس رتبہ کو پہونچ جاؤنگا تو آپ کی درخواست کے بموجب اس کی شرح لکھ بھیجونگا اور اگر بادشاہ نے اِس رسالہ کا جلانا ٹھان لیا ہے تو اس فقیر متوکل کے گھر سے کہیں زیادہ شاہی مطبخ میں آگ موجود ہے حکم دیا جائے کہ یہ رسالہ اور اس کی جس قدر نقلیں دستیاب ہوں آگ میں جھونک دی جائیں۔ بادشاہ اِس جواب کو سنکر ساکت رہ گئے[1]۔

---

[1] مراۃ الخیال (تذکرہ محمد بیگ) النسخہ قلمی کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن صفحہ ۱۹۶ نیز ملاحظہ

اس کے پڑھنے کے بعد ہمیں خیال ہوتا ہے کہ اگر سید احمد خاں مرحوم نے ملائکہ وغیرہ کی نسبت اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا تو کون سی ایسی خطا کی۔ ایک آبلہ فریب عالم نما مولوی اپنی تفسیر قرآن میں جس میں اس نے عوام اور جہال کے خوش کرنے کا بہت کچھ سامان جمع کیا ہے لکھتا ہے کہ سر سید نے یہ خیالات برہمو سماج سے لئے اور اپنی نیک نیتی سے ضمناً اس عامیانہ خیال کو بھی تحریر میں لایا ہے کہ سر سید نے انگریزوں کو اطمینان دلایا کہ میں مسلمانوں کو نہ صرف مطیع سرکار بناتا ہوں بلکہ اُن کے مذہب کی بیخ و بنیاد بھی کھوکھلی کئے دیتا ہوں۔ افسوس اس زمانہ کے مولوی کو اتنا بھی معلوم نہ تھا کہ سلف صالحین میں سے بعض نامور بزرگ اور شیوخ اِن مسائل پر اِس قسم کے خیالات صاف و صریح الفاظ میں بیان کر چکے ہیں چنانچہ مولانا بحر العلوم فرماتے ہیں۔

جبریل کہ مشہور رسل علیہم اسلام است و وحی
از جانب حق می رساند آن حقیقت جبرئیلیہ است
است کہ توتے از قواے رسل بود متصور شدہ در عالم
مثال بصورتے کہ مکنون بود در رسل مشہود می شود
و مرسل می گردد و پیغام حق می رساند پس رسل مستفیض
از خود اند نہ از دیگرے [1]

بقیہ حاشیہ صفحہ (۱۶۰) مآثر الامرا جلد سوم صفحہ (۶۰۶) مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کلکتہ
[1] سوانح مولانا روم مولفہ شبلی نعمانی صفحہ (۱۲۶)

اسی طرح مولانا روم اور شیخ اکبر محی الدین ابن عربی بھی یہی عقیدہ رکھتے تھے۔

اس کتاب کی فصل ثانی کے دیباچہ میں جس میں علم پر بحث ہے آزاد نے ایک مہمل اور غلط قصہ مسلمانوں کے ہاتھ سے ایران کے کتب خانوں کے جلانے کا بھی لکھدیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ جب سعد بن وقاص نے ملک فارس کو فتح کیا اور وہاں فلسفہ کی بے شمار کتابیں ہاتھ لگیں تو انہوں نے امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ انہیں کیا کیا جائے انہوں نے جواب دیا کہ اگر ان میں ہدایت ہے تو خدا نے ہمیں بھی اس سے ہدایت دی ہے اور اگر ضلالت ہے تو خدا ہمارے لئے کافی ہے انہیں پانی یا آگ میں ڈالدو۔

اول تو اس میں ایک صریح تاریخی غلطی یہ ہے کہ سعد بن وقاص نے ملک ایران کو فتح نہیں کیا اور یہی غلطی مشہور مورخ ابن خلدون نے کی ہے[1]۔ غالباً مولانا آزاد کا ماخذ بھی ابن خلدون ہے کیونکہ بعینہ یہی الفاظ اس میں ہیں۔ دوسرے مسلمانوں نے جب ایران کو فتح کیا تو وہاں اسقدر کتب خانے کہاں تھے، علم کا چرچا ایران سے بہت زمانہ پہلے سے اٹھ چکا تھا یہاں تک کہ جب سکندر نے ایران فتح کیا تو اس وقت بھی کتب خانوں کا نام و نشان نہ تھا۔

البتہ یہ قصہ اسکندریہ کے متعلق متعدد تاریخوں میں بیان کیا گیا ہے

---

[1] دیکھو مقدمہ ابن خلدون صفحہ (۴۸۰)

اور ابن خلدون نے اور بعد میں آزاد نے غلطی سے اِس قصے کو ایران سے منسوب کیا ہے لیکن شمس العلما مولٰنا شبلی اِس کی تردید نہایت تحقیق و تنقید کے ساتھ کر چکے ہیں اور اب اُس کے متعلق کچھ لکھنا بے سود ہے تاہم ایک دو باتیں اِس کے متعلق کہنا ضروری معلوم ہوتی ہیں۔ مولٰنا نے بڑی شد و مد اور تحقیق سے یہ امر ثابت کیا ہے کہ اِس قصہ کا ماخذ ابو الفرج ہے سب سے اول اسی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے اور اس سے دوسروں نے نقل کیا[1]۔ لیکن ایک بات کھٹکتی ہے وہ یہ کہ ابو الفرج[2] سے قبل عبد اللطیف بغدادی اپنے رسالہ افادۃ الاعتبار میں ضمناً اس واقعہ کی طرف اِشارہ کر چکا ہے۔ مولٰنا نے نہایت سختی سے جھنجلا کر اس کی تردید کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ عبد اللطیف بغدادی نے اِس کا ذکر مورخانہ حیثیت سے نہیں کیا بلکہ ضمناً تذکرہ کیا ہے اور بعض یوروپین مورخوں کا یہ بیان ہے کہ سب سے اول عبد اللطیف نے اس کو اپنی کتاب میں لکھا ہے اون کا بڑی حقارت سے ذکر کیا ہے اور ان پر فریب دہی اور تدلیس کا الزام لگایا ہے میں یہ مانتا ہوں کہ عبد اللطیف نے مورخانہ حیثیت سے اس کا ذکر نہیں کیا اور یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ "بذکر" کے تحت میں اس کو لکھا ہے، اِس کا بھی اعتراف ہے کہ اس کے ساتھ

---

[1] رسایل شبلی (کتب خانہ اسکندریہ) صفحہ ۱۲۱ و ۱۲۲۔ [2] یوحنا ابو الفرج ۱۲۲۶ء مسعدۃ ۶۲۳ ہجری۔ موافق الدین عبد اللطیف بن یوسف بغدادی پیدایش ۵۵۷ھ وفات ۱۲ محرم ۶۲۹ھ

جس قدر واقعات بیان ہوئے ہیں وہ سب بازاری گپیں[1] ہیں لیکن اِس کا کیا علاج کہ یہ واقعہ عبداللطیف کی کتاب میں ابوالفرج سے قبل مذکور ہے اور کم سے کم "یذکر" کے لفظ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ واقعہ عبداللطیف کے زمانہ میں لوگوں کی زبان زد ضرور تھا اور بلاشبہ ابوالفرج سے قبل مشہور تھا۔ البتہ اِس میں شک نہیں کہ جس شان سے اور نمک مرچ لگا کر اس نے بیان کیا ہے اس سے پہلے کسی نے بیان نہیں کیا اور اس سے بعد کے مورخین نے بے سوچے سمجھے نقل کر کے سب جگہ پھیلا دیا۔ لیکن اِس کا پتہ لگانا ابھی باقی ہے کہ یہ واقعہ مشہور کیسے ہوا اور ابوالفرج سے پہلے اِس کا چرچا کیسے تھا۔ غالباً باہمی عناد اور تعصب اس قصہ کی ایجاد کا باعث ہوا ہے۔ مفتوح قوم فاتح قوم پر اکثر ایسے الزام بعد میں قایم کر دیا کرتی ہے اِن میں سے ایک یہ بھی ہے جس کی کوئی تاریخی شہادت نہیں ہے۔ علاوہ اِس کے مولنا شبلی نے اِس رسالہ میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ سوائے عبداللطیف ابوالفرج، مقریزی اور حاجی خلیفہ کے کسی اور کتاب میں اِس قصہ کا ذکر نہیں۔ اور اِسی کے ساتھ متعدد کتابیں جو مصر و اسکندریہ کے حالات میں لکھی گئی ہیں نام بنام گنوائی ہیں کہ انہیں سے کسی میں اِس کا حوالہ نہیں۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے انہیں کتابوں میں سے ایک تاریخ الحکما[2] القفطی ہے جس میں یہ قصہ منقول ہے غالباً یہ کتاب

---

[1] رسائل شبلی (کتب خانہ اسکندریہ) صفحہ ۱۳۸ و ۱۳۹۔ [2] تاریخ الحکما جمال الدین ابوالحسن علی بن یوسف القفطی مطبوعہ لیپ سک ۱۳۲۰ھ صفحہ ۳۵۵-۳۵۶۔

حال ہی میں چھپی ہے اور اس لئے مولانا کی نظر سے نہیں گذری تھی۔ اس کے علاوہ دوسری کتاب مفتاح السعادۃ[1] ہے جو ایک ترکی عالم و فاضل طاش کبری زادہ (پیدائش ۹۰۱ھ وفات ۹۶۸ھ) کی تصنیف سے ہے افسوس کہ یہ بیش بہا کتاب اب تک طبع نہیں ہوئی لیکن ان کتابوں میں اس قصہ کا ہونا نہ ہونا برابر ہے کیوں کہ ان دونوں صاحبوں نے بغیر کسی تحقیق کے ابوالفرج سے لفظ بہ لفظ نقل کرلیا ہے یا ممکن ہے کہ طاش کبری زادہ نے قفطی سے نقل کیا ہو۔ عبارت سب کی ایک ہے۔

خاک بلگرام میں ایک اور ایسا جید فاضل ہو گذرا ہے جسے فخر علمائے ہند کہنا بجا ہوگا علمائے ہند کے حالات میں کوئی کتاب اس وقت تک کامل نہیں ہوسکتی جب تک کہ اس میں علامہ سید مرتضیٰ صاحب تاج العلوم کا تذکرہ نہ ہو۔ یہ آزاد بلگرامی کے ہمعصر تھے۔ ہمارے دل نے ہرگز یہ گوارا نہ کیا کہ یہ کتاب جو علمائے ہند اور خصوصاً علمائے بلگرام کا تذکرہ ہے اس فاضل بے عدیل کے حالات سے خالی رہے لہذا یہ تذکرہ آخر کتاب میں اضافہ کر دیا گیا ہے جس سے اس شخص کے تبحر اور کمالات علمی کا حال معلوم ہوگا۔

---

[1] نسخۂ کتب خانۂ آصفیہ صفحہ ۴۴۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ مخزن نکات

شیخ محمد قیام الدین (قائم) چاند پور ضلع بجنور کے رہنے والے تھے۔ ان کا نام مختلف تذکرہ نویسوں نے کسی قدر اختلاف سے لکھا ہے۔ مثلاً میر صاحب اپنی (نکات الشعرا) میں اور میر حسن اپنے تذکرے میں محمد قائم لکھتے ہیں۔ علی ابراہیم اور 'لطف' نے بھی اسی کی تقلید کی ہے۔ مصحفی نے قیام الدین علی لکھا ہے۔ کردیزی بھی محمد قائم ہی لکھتا ہے۔ کمال اور گارساں دتاسی قائم الدین بتاتے ہیں۔ لیکن اصل نام محمد قیام الدین ہی ہے جیسا کہ خود انہوں نے اس تذکرے کے شروع میں لکھا ہے۔ میر صاحب اور مصحفی ان سے ذاتی طور پر واقف تھے۔

اگرچہ قائمؔ چاند پور کے رہنے والے تھے لیکن ملازمت کے سلسلے میں ”بدو شعور“ سے اُن کا رہنا دلی میں ہوا۔ شاہ عالم بادشاہ کے عہد میں وہ شاہی توپ خانے کے داروغہ ہو گئے۔ چنانچہ یہ تذکرہ بھی اُسی زمانے میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ جب کہ اُن کا قیام دلی میں تھا جب وہ دلی پہنچے ہیں تو میر تقی، خواجہ میر درد، سودا وغیرہ جیسے باکمال اُستاد وہاں موجود تھے اور اُردو شاعری شباب پر تھی۔ کہتے ہیں کہ ابتدا میں خواجہ میر درد سے اصلاح لی مگر کچھ دنوں بعد مرزا رفیع السودا کے تلمذ کا شرف حاصل کیا۔ آزاد آبِ حیات میں لکھتے ہیں کہ ” یہ اول شاہ ہدایت کے شاگرد ہوئے، اُن سے ایسی بگڑی کہ ہجو کہی۔ تعجب یہ ہے کہ شاہ موصوف باوجودیکہ حد سے زیادہ خاکساری طبیعت میں رکھتے تھے مگر انہوں نے بھی ایک قطعہ اُن کے حق میں کہا۔ پھر خواجہ میر درد کے شاگرد ہوئے، اُن کے حق میں بھی کہہ سُن کے الگ ہوئے پھر مرزا کی خدمت میں آئے اور اُن سے پھرے مرزا تو مرزا تھے، انہوں نے سیدھا کیا“ اگرچہ اس تذکرے میں انہوں نے میاں ہدایت اللہ ”ہدایت“ اور خواجہ میر درد دونوں کی بہت تعریف کی ہے اور کہیں ملال کا اظہار نہیں کیا، لیکن اپنی شاگردی اور مشورے کا بھی ذکر نہیں کیا۔ البتہ اُن کا دیوان دیکھنے پر ایک غزل میں یہ اشعار نظر آئے جن سے آزاد کے قول کی تصدیق ہوتی ہے

حضرت درد کی خدمت میں عصیرا ۔ ۔ ۔ نے[1] عرض کی یوں کہ

---

[1] اصل نسخے میں اسی طرح لکھا ہے۔ یہاں کوئی نقطہ رہ گیا ہے۔

اے استاد زماں سنتے ہو امر ہو وے تو ہدایت کو کروں
میں سیدھا واں سے ارشاد ہوا یہ کہ میاں سنتے ہو راست
ہوتے ہیں کسو سے بھی کبھی کج طینت تیر بنتی ہے کہیں
شاخ کماں سنتے ہو۔

مرزا کے حال میں بھی اگرچہ اپنی شاگردی کا اشارہ نہیں کرتے مگر ذکر اس طرح سے کیا ہے جو ایک سعادت مند شاگرد کے شایاں ہے۔ اور اپنی غزل کے ایک مقطع میں تو صاف صاف اس کا اقرار کیا ہے :-

(قائم) یہ فیض حضرت (سودا) سے ہے ورنہ میں
طرحی غزل سے (میر) کے آتا تھا بر کہیں

لیکن کچھ عرصے بعد جب امور سلطنت میں اختلال پیدا ہوا اور امن و امان اور فارغ البالی جاتی رہی تو وہ باکمال بھی جن کی بدولت دلی دلی تھی، ایک ایک کرکے رخصت ہونے لگے اور وہ صحبتیں جو شعر وسخن کی جان تھیں، خواب وخیال ہوگئیں۔ قائم بھی دل برداشتہ ہوکر وطن چلے آئے اور کچھ دنوں ٹانڈے میں نواب محمد یار خاں کی سرکار میں بسر کی۔ مصحفی بھی اُن دنوں اسی سرکار کے متوسل تھے۔ دونوں کی ملاقات یہیں ہوئی۔ مصحفی لکھتے ہیں کہ اُس وقت وہ لباس درویشی میں تھے نواب بڑی فیاضی سے اہل علم کی سرپرستی کرتے تھے اور شعر وسخن سے خاص ذوق رکھتے تھے چنانچہ قائم نے اپنی غزل کے ایک مقطع

میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے:۔

تجھ کو قائم رکھے اللہ بہت سا اے امیر
مجتمع سایہ میں ہیں جس کے سخنداں اتنے

امیر، نواب محمد یار خاں کا تخلص تھا۔ تین ماہ سے زیادہ نہ رہنے پائے تھے کہ یہاں وہی انقلاب رونما ہوا۔ جو ہندوستان میں اس وقت ہر جگہ بپا تھا۔ قائم مجبور ہو کر رام پور چلے گئے اور نواب فیض اللہ خاں والی رام پور کے بیٹے احمد یار خاں نے اُن کی کچھ تنخواہ مقرر کر دی اور فوجی خدمت انجام دیتے رہے۔ لیکن اس تنخواہ میں ان کی بسر نہ ہوتی تھی۔ جب زیادہ پریشان ہوئے تو لکھنو پہنچے اور راجہ ٹکیت رائے سے اپنے وطن کے عامل کے نام شقے اور پروانے حاصل کئے تاکہ اپنی قدیمی ملک اور یومیہ بحال کرائیں۔ اس میں انہیں کامیابی ہوئی مگر رام پور پہنچتے ہی اجل نے آلیا اور ۱۲۰۸ھ میں انتقال کر گئے۔

ان کے سنہ وفات میں بہت اختلاف ہے۔ مصحفی نے وفات کا کوئی سنہ نہیں لکھا صرف اتنا لکھا ہے کہ رام پور سے انتقال کی خبر پہنچی۔ مصحفی کا تذکرہ ۱۲۰۷ - ۱۲۰۸ھ میں لکھا گیا ہے۔ علی ابراہیم (اور لطف) فیلن اور کریم الدین نے ۱۲۱۰ھ بتایا ہے۔ "شیفتہ" اور بعض اور تذکرہ نویسوں نے بھی اسی کو نقل کر دیا ہے کارسان دتاسی نے ۱۲۲۳ھ لکھا ہے۔ جرأت نے "قائم" کے انتقال کی تاریخ اس شعر سے نکالی ہے:۔

جرأت نے کہی یہ رو کے تاریخ وفات　　　یکتائی کے ساتھ
"قائم" بنیاد شعرِ ہندی نہ رہی۔　　　کیا کہیے اب آہ
اس مصرع سے ۱۲۰۸ھ ہی نکلتے ہیں اور یہی صحیح ہے۔

"قائم" کی شاعری کی سب تذکرہ نویسوں نے تعریف کی ہے اور اکثر نے میر و مرزا کے بعد اُس کو مانا ہے۔ بعض تو اُسے "سودا" سے بھی بڑھ کر مانتے ہیں۔ مصحفی لکھتے ہیں:۔

"در پختگئی کلام و چستی مصراع غزل ور و یہ قصیدہ و مثنوی وغیرہ موافق رواج زمانہ دوش بدوش استاد راہ می رود، بلکہ در بعضے مقام غلبہ می جوید"۔

علی ابراہیم یا لطف کہتے ہیں:۔

"سچ تو یہ ہے کہ بعد سودا اور میر کے کسی ریختہ گو کی نظم کا نہیں یہ اسلوب ہے، راقم آثم کو تو طور گویائی کا اس سخن آفریں کے نہایت مرغوب ہے"۔

آزاد کی رائے ہے کہ

"ان کا دیوان ہرگز میر و مرزا کے دیوان سے نیچے نہیں رکھ سکتے مگر کیا کیجئے کہ قبول عام کچھ اور شئے ہے، شہرت نہ پائی"۔

میر حسن فرماتے ہیں کہ۔

"طرز بش بطرز طالب آملی می ماند مثنوی ہا بسیار گفتہ

دبسے درہائے معانی سفتہ کہ کسے کم گفتہ"

کریم الدین د فیلن کی رائے ہے کہ

"عجب طرح کا شاعر خوش گفتار، بلند مرتبہ، موزوں طبع، عالی یقدار ہے کہ اس کی برابری اچھے اچھے شاعر نہیں کر سکتے......... بعض بعض آدمی جو کہ اس کو سودا، سے بہتر کہتے ہیں، حق یہ ہے کہ سچے ہیں اور بعضے کم مایہ او بے استعداد جو اس کو برابر سودا کے گنتے ہیں۔ خیال سودا اور دیوانگی کا کرتے ہیں"۔

بخلاف اس کے شیفتہ کی رائے میں انہیں سودا کا ہم پلہ سمجھنا سودا ہے۔ البتہ وہ اُن کے قطعات و رباعیات کی بہت تعریف کرتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ قائم بہت بڑا شاعر ہے، لیکن اُسے میر و مرزا کا ہم رتبہ کہنا سراسر نا انصافی ہے۔ اس کا کلام ہر صنعت میں موجود ہے۔ غزل، رباعی، قطعہ، مثنوی، قصیدہ، ترکیب بند، تاریخ سب کچھ کہا ہے۔ ہجو کہنے اور فحش بکنے میں وہ اپنے استاد کے ہم پلہ ہے۔ متعدد مثنویاں لکھی ہیں جن میں بعض قصے سلیقے سے نظم کئے ہیں، قصیدوں میں بھی زور پایا جاتا ہے۔

اکثر تذکرہ نویسوں نے اُن کے تذکرہ شعرا کا ذکر کیا ہے، جو اب تک نایاب تھا اور اب شائع کیا جاتا ہے۔ قائم کا دعویٰ ہے کہ

اس سے قبل کوئی تذکرہ شعرائے ریختہ کے بیان میں نہیں لکھا گیا۔ یہ دعویٰ صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ اس سے دو چار سال قبل میر تقی میر اور علی الحسینی الکردیزی نے اپنے تذکرے لکھے تھے معلوم ہوتا ہے کہ قائم کو ان تذکروں کی اطلاع نہ تھی۔ لیکن ڈاکٹر شبز نگر کا یہ کہنا کہ قائم نے جو اقتباسات ریختے کے شاعروں کے دئے ہیں وہ وہی ہیں جو کردیزی کے تذکرے میں پائے جاتے ہیں، صحیح نہیں ہے۔ دونوں تذکرے ہمارے سامنے ہیں اشعار کے انتخابات اور حالات دونوں مختلف ہیں۔

خواجہ اکرم نے اس تذکرے کے لئے ایک قطعہ تاریخی لکھا تھا۔ جس میں مادہ تاریخ "مخزن نکات" تھا، قائم کو یہ مادہ پسند آیا اور تذکرے کا یہی نام رکھ دیا۔ اس سے سنہ تالیف ۱۱۶۸ھ نکلتا ہے۔ اس میں قائم سمیت ۱۱۴ شعرا کا تذکرہ ہے۔ اگرچہ یہ تذکرہ مختصر ہے، مگر بعض حالات کے لحاظ سے بہت قابل قدر ہے۔ قائم نے اُسے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ طبقہ اول میں متقدمین کا، طبقہ دوم میں متوسطین کا اور طبقہ سوم میں متاخرین کا ذکر ہے۔ اگرچہ میر تقی میر نے بھی اپنے تذکرہ نکات شعرا میں دکن کے شعرا کا ذکر کیا ہے، لیکن قائم نے اس کا زیادہ اہتمام کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ۔

"باید دانست کہ چوں فن ریختہ درآں وقت از محل اعتبار ساقط بود بنائے علیہ ہیچ کس بر توغل آں اقدام نمی نمود،

ایں دو چار سہ بیت کذائی کہ بنام اساتذہ معتبر مرقوم است اغلب کہ منشائے نظمش ہزلے بیش نباشد، امابعد ازیں بسمت بلاد دکن در عہد عبداللہ قطب شاہ کہ باسخنوراں بہ محبت و مواسا پیش می آمد، ریختہ گفتن بر زبانِ دکھنی بسیار رواج گرفت"۔

اگرچہ عبداللہ قطب شاہ کے عہد سے اس کی ابتدا قرار دینا صحیح نہیں کیونکہ اس سے قبل سلطان قلی قطب شاہ اور محمد قلی قطب شاہ خود بڑے شاعر گزرے ہیں، تاہم "قائم" نے دکھنی ریختے کو خاص اہمیت دی ہے۔ اگرچہ وہ اس شاعری کے زیادہ قائل نہ تھے، چنانچہ ان کا شعر مشہور ہے:۔

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ
ایک بات لچر سی بزبانِ دکنی تھی

قائم نے طبقۂ اول کی ابتدا شیخ سعدی شیرازی سے کی ہے اور لکھا ہے کہ اس پر جمہور کا اتفاق ہے۔ کہ جب شیخ سعدی گجرات میں تشریف لائے اور جیسا کہ بوستان' میں مذکور ہے سومنات کی مجاوری یہاں زبان سے واقفیت حاصل کر کے ایک دو غزلیں ریختے میں لکھیں۔ اگرچہ یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن سعدی کے نام سے جو ایک مشہور غزل فارسی اردو کی ملی جلی چلی آ رہی ہے، اس کی نسبت عام طور پر یہ خیال تھا کہ شیخ سعدی شیرازی کی تصنیف ہے میر صاحب نے

اپنے تذکرے میں اس خیال کی تردید کی ہے۔ سعدی کے بعد امیر خسرو کا ذکر کیا ہے اور پھر دوسرے قدیم شعرا کا۔

ہر طبقے کے شروع میں اس طبقے کے شعرا کی خصوصیات کا مختصر ذکر کر دیا ہے اور ان کی رائے اس بارے میں بہت خوب اور صائب ہے۔ بعض بعض شعرا کے کلام کے متعلق بھی رائے کا اظہار کیا ہے۔ لیکن یہ بہت کم ہے۔ اس خصوص میں میر صاحب کے تذکرے کو فوقیت حاصل ہے۔ بیان صاف اور سیدھا ہے عبارت آرائی اور تشبیہ و استعارہ سے کم کام لیا ہے۔ تذکرے کے آخر میں قائم نے اپنا ذکر بھی مختصر طور پر کیا ہے۔ جس میں وہ لکھتے ہیں کہ "ہرچند از باشندگان قصبہ چاندپور است اما از بدو شعور تا ایں حال بتوسل نوکری بادشاہی بدار الخلافت شاہجہاں آباد گزرانده"۔ اس سے زیادہ اس تذکرے میں اُن کے حالات کے متعلق کچھ نہیں ملتا۔ اس سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ دہلی سے رخصت ہونے سے قبل ہی یہ تذکرہ تحریر میں آ گیا تھا کیونکہ اُس کے بعد ہی وہ لکھتے ہیں کہ شاہی انتظام میں خلل آجانے کی وجہ سے میں نے سفر کا ارادہ مصمم کر لیا تھا، لہذا فرصت کو غنیمت سمجھ کر ان حالات کو قلم بند کرنا شروع کر دیا۔

قائم کی شاعری کے ساتھ یہ تذکرہ بھی بلاشبہ قابل قدر ہے اور اس سے اردو شعرا کے حالات اور کلام کے متعلق بصیرت حاصل ہوتی ہے۔

قائم نے اپنے تذکرے کے ساتھ اپنے کلام کا انتخاب بھی دیا ہے۔

لیکن یہ انتخاب بہت ہی کم ہے اور وہ بھی الف کے چند شعر ہیں۔ اس لئے ہم یہاں اس کے کلام سے کچھ اور اشعار بھی درج کرتے ہیں تاکہ سخن فہم اُس کے کلام کی خوبی کا اندازہ کرسکیں۔

لیکن انتخاب سے قبل ایک بات میں اور کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ بعض نظمیں سودا اور قائم دونوں کے کلیات میں مشترک پائی جاتی ہیں۔ مثلاً موسم سرما کے ہجو میں جو مثنوی ہے اور جس کا مطلع یہ ہے :۔

سردی اب کے برس ہے اتنی شدید
صبح نکلے ہے کانپتا خورشید

دونوں کے کلیات میں بے کم و کاست درج ہے۔ لیکن نظم غالباً سودا کی ہے۔ کیونکہ اسی کے ساتھ کی دوسری مثنوی موسم گرما کے ہجو میں موجود ہے۔ لیکن میرحسن کے تذکرے کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسے قائم ہی کی مثنوی خیال کرتے ہیں۔ ایک اور طویل عشقیہ مثنوی جس کا پہلا شعر یہ ہے :۔

الٰہی شعلہ زن کو آتش دل   تب دل دے بقدر خواہش دل

لطف یہ ہے کہ مثنویوں کے آخر میں سودا کے کلیات میں سودا کا اور قائم کے کلیات میں قائم کا تخلص موجود ہے۔ اس سے صحیح فیصلہ کرنا اور بھی دشوار ہوجاتا ہے۔ مگر ہمارا قیاس یہ ہے کہ یہ مثنوی قائم ہی کی ہے جو غلطی سے سودا کے کلیات میں درج ہوگئی ہے۔ اسی طرح

اور کئی مثنویاں جن میں چھوٹے چھوٹے قصے اور حکایتیں منظوم کی ہیں۔ دونوں کے کلام میں مشترک پائی جاتی ہیں۔

انتخاب

قائم کے پہلے تین شعر عام طور پر مشہور ہیں اور بہت مقبول ہوئے ہیں:۔

درد دل کچھ کہا نہیں جاتا — آہ چپ بھی رہا نہیں جاتا

کعبہ[1] اگرچہ ٹوٹا تو کیا جائے غم ہے شیخ — کچھ قصر دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا

قسمت کو دیکھ ٹوٹی ہے جا کر کہاں کمند
کچھ دور اپنے ہاتھ سے جب بام رہ گیا
نے تجھ پہ وہ بہار رہی اور نہ یہاں وہ دل
کہنے کو نیک و بد کے ایک الزام رہ گیا

اٹھ جائے گر یہ بیچ سے پردہ حجاب کا
دریا ہی پھر تو نام ہے ہر ایک حباب کا
کیوں چھوڑتے ہو دردِ تہ جام سے کشو
ذرہ ہے یہ بھی آخر اسی آفتاب کا

---

[1] (ن) ٹوٹا جو کعبہ کون سی یہ

ایسی ہوا ہیں پاس نہ ساقی نہ جام ہے
رونا بجا ہے حال پہ تیرے سحاب کا
اس دشت پر سراب میں بھٹکے بہت حیف
دیکھا تو دو قدم پہ ٹھکانا تھا آب کا

پھر کے جو وہ شوخ نظر کر گیا — تیر سا کچھ دل سے گزر کر گیا
خاک سا ڈھیر سر راہ ہوں میں — قافلۂ عمر سفر کر گیا
چھپ کے ترے کوچے سے گزرا ہوں لیک — نالہ ایک عالم کو خبر کر گیا
تا بفلک نالہ تو پہنچا تھا رات — میں ہی کچھ اللہ کا ڈر کر گیا
پوچھ نہ قائم کٹی کیونکر عمر — جوں ہوا ایک چند بسر کر گیا

فلک جو دے تو خدائی تو لے نہ اب قائم
وہ دن گئے کہ ارادہ تھا بادشاہی کا

بے دماغی سے نہ اس تک دل رنجور گیا — مرتبہ عشق کا یہاں حسن سے بھی دور گیا

برنگ طائر نو ہم اسیر اے صیاد
وہ ہیں کہ جن کا گلوں بیچ آشیانا تھا
معاملہ یہ ہے دل کا اسے کہے گا وہ کیا
پیامبر کے ہیں آپ ساتھ جانا تھا
یہ سچ کہ جھوٹ ہے دعوائے دوستی لیکن
کبھی ہمیں بھی تو اک بار آزمانا تھا

رہبر فرقہ اسلام رہا ساری عمر — حیف پر یہ ہے میں آپ مسلماں نہوا
دیکھ مجھکو کہ سلیماں کا دیا زور مجھے — ایک چیونٹی سے پہ پیروست گریباں نہوا
تھا گل تازہ میں پر حیف بخت بد سے — زینت گوشۂ دستارِ عزیزاں نہوا

ظالم تو میری سادہ دلی پر تو رحم کر
روٹھا تھا تجھ سے آپ ہی اور آپ ہی من گیا

کچھ آج دل پہ یہ وحشت کا رنگ ہی صیاد
ترے قفس سے چمن مجھ پہ تنگ ہی صیاد
گرفتہ طبع جو مجھسا چھٹا قفس سے تو کیا
رہائی جس کی اسیری کا ننگ ہے صیاد
نہ گل بجا نہ بلبل چمن میں نغمہ سرا
مری خلاصی میں اب کیا درنگ ہی صیاد
قفس کی تنگی سے میں ہی نہ تنگ ہوں قائمؔ
مری بھی تنگیٔ حالت سے تنگ ہی صیاد

کی کس کی نگاہوں نے یہ تاثیر ہوا پر
چلتی ہے جو یہ برق سی شمشیر ہوا پر
جی میں ہی میاں آج نگہ کی تری تڑپھن

کیجے قلم برق سے تحریر ہوا پر
مت قصر کو ہستی کے گرا دیکھ کہ غافل
مانند حباب اُس کی ہے تعمیر ہوا پر
کب بند ہوں برنگ تعلق میں سبک روح
کھنچتی ہی کوئی رنگ سے تصویر ہوا پر

بے شغل نہ زندگی بسر کر | گر اشک نہیں تو آہ سر کر
دے طول امل نہ وقت پیری | ہوئی صبح فنا نہ مختصر کر
کچھ طرفہ مرض ہے زندگی بھی | اس سے جو کوئی جیا سو مر کر

نہیں کہتا میں دل ترک تمنا | پہ جتنی ہو سکے اتنی ہوس کر
فریب باغباں پہ ہو کے غافل | نہ اے بلبل اکٹھے خار و خس کر
بہار عمر ہے قائم کوئی دن | اسے جوں گل پیارے کاٹ ہنس کر

ہے بے اثر ایسی ہی جو اپنی کشش دل
جی لے ہی کے چھوڑے گی یہ ایک دن خلش دل
تھا ہنو مجھے آمد میں کوئی اس کی کہ ناگاہ
لے جائے نہ گھر سے کہیں باہر طپش دل
زہر آب و ہلاہل سے جو کچھ کام نہ نکلا

دے کر کے ہیں کی خون جگر پرورش دل
کس طرح کوئی گزرے ترے رہ سے پیارے
ہر گام پہ اس کوچے میں ہے جیقلش دل
ہاتھوں سے دل و دیدہ کے آیا ہوں بہت تنگ
آنکھوں کو روؤں یا میں کروں سرزنش دل

اب کے جو یہاں سے جائیں گے ہم
پھر تجھکو نہ منہ دکھائیں گے ہم
مشکل ہے نہ آنا تجھ گلی سیں
پر یہ بھی سہی نہ آئیں گے ہم
جو آگے کہا کئے ہیں تجھ سے
سو اب کے وہ کر دکھائیں گے ہم
ایسا ہی جو دل نہ رہ سکے گا
ٹک دور سے دیکھ جائیں گے ہم
آزردہ ہو غیر سے لڑو یہاں
اس عہد سے پر نہ آئیں گے ہم
گر زیست ہی تجھ تلک تو پھر کیا
صدقے ترے مر ہی جائیں گے ہم
جوں چاہئے چاہ کا سرشتہ
جیتے ہیں تو کر دکھائیں گے ہم
اس پر بھی اگر ملیں گے تو خیر
قائمؔ ہی نہ پھر کہائیں گے ہم

قائمؔ جگر ہر رونے کی یہ حالت تباہ
اس صحن گلستاں کے وہ ہیں دل فگار ہم
کھٹکا صبا کے پاؤں کا سن کر برنگ بو
آغوش گل میں ہوتے تھے نت بیقرار ہم

کیا جانتے تھے ہم کہ یہ ایک دن بہے گی باد
اس مرتبہ کو ہوئیں گے بے اقتدار ہم



میرا سا لب و لہجہ کہاں مرغ چمن میں
گل کتروں ہوں سو رنگ کے میں طرز سخن میں
غربت میں مرا حال جو دیکھے ہے تو قاصد
زنہار نہ کہیو اسے یاران وطن میں



ایک جا گر یہ نہیں ہے مجھے آرام کہیں
ہے عجب حال مرا صبح کہیں شام کہیں
پائے دیوار سے پھر میری طرح وہ نہ اٹھا
جس نے دیکھا تجھے یک بار سر بام کہیں
عذر تقصیر بھی چاہوں گا میں اس سے اے دل
ٹک تو خاموش ہو دینے سے وہ دشنام کہیں
عزم کعبے کا تو قائم تو کیا ہے لیکن
رہن سے کیجو نہ واں جامۂ احرام کہیں



ایک آب و تاب مہ و آفتاب رکھتے ہیں
یہ رو کشی کی تری کب وہ تاب رکھتے ہیں

زبانِ عشق شکایت سے لال ہے ورنہ
ہم ایک گلے کے ترے سو جواب رکھتے ہیں

حسنِ معنی چاہیے تزئینِ ظاہر ہیچ ہے
کیا کرے اس گل کو لے کے کوئی کہ جس میں بو نہیں
مدتوں اہلِ حرم پر حکمرانی کی ہے یاں
کیا ہوا گر بت کدے میں آج ہم کو رو نہیں
خوبرو دو دن کسی کے ساتھ کر لیں اختلاط
پر جو یہ چاہو کہ یہ ہوویں کسو کے سو نہیں
وضعِ دوراں کو خوشامد دوست ہے قائمؔ تو ہو
ہر کس و ناکس سے دب چلنا یہ اپنی خو نہیں

ہم سے بھی اس قدر رعنا ہے لے سرو غلط
تو بھی ہر چند ہے موزوں پہ یہ انداز کہاں
دل سے رخصت ہو بس اب آرزوئے گلگشت کہ آہ
تابِ رفتار کدھر طاقتِ پرواز کہاں
ہمتِ عشق نہ ہو حسنِ خط و خال میں بند
صید ہر مور و مگس ہوتے ہیں شہباز کہاں
قائمؔ اس باغ میں بلبل تو بہت ہیں لیکن

دل کھلے نالے سے جس کے وہ ہم آواز کہاں

غیر اس کے کہ خوب روئیے اور | غم دل کا کوئی علاج نہیں
اب بھی قیمت ہے دل کی گوشۂ چشم | اتنی یہ جنس بے رواج نہیں
گرم حرارت تو اے طبیب کہ یہ | دل کا دھڑکا ہے اختلاج نہیں
دو جہاں بھی ملے تو بس ہی ہیں | یہاں کچھ اتنی تو احتیاج نہیں

مجلس مے سے مشابہ ہے خرابات جہاں
جان کر یہاں جو نہو مست وہ ہشیار نہیں
مے کی توبہ کو مدت ہوئی قائم لیکن
بے طلب اب بھی جو مل جائے تو انکار نہیں

جو کوئی در پہ ترے بیٹھے ہیں | دونوں عالم سے پھرے بیٹھے ہیں
جوں نم اشک تو کس سے ہے خفا | یہاں کوئی پل میں گرے بیٹھے ہیں
درد دل کیونکر کہوں میں اس سے | ہر طرف لوگ گھرے بیٹھے ہیں

کہاں کا غرۂ شوال کیسا عشرۂ ذی حج کا
ہمیں ہاتھ آئے مے جس دن ہم اس دن عید کرتے ہیں
مزاج خس ہے اہل عشق کا جلنے کے عالم میں

جلاتا ہے جو اُن کو اس کی یہ تائید کرتے ہیں
یہ کاسہ سر تلے رکھے جو میخانوں میں سوتے ہیں
جسے چاہیں اُسے اک جام میں جمشید کرتے ہیں
جنہیں کچھ سلسلہ میں عشق کے تحقیق حاصل ہے
وہ کب مجنوں سے گمراہ کی تقلید کرتے ہیں
نہ جانے کہئے کس قالب میں قائم درد دل اُن سے
نہیں بنتی زباں سے دل میں جو تمہید کرتے ہیں

نہ دل بھرا ہی نہ اب نم رہا ہے آنکھوں میں
کبھو جو روئے ہیں خوں جم رہا ہے آنکھوں میں
میں مرچکا ہوں پہ تیرے ہی دیکھنے کے لئے
حباب وار تنک دم رہا ہے آنکھوں میں
وہ محو ہوں کہ مثال حباب آئینہ
جگر سے اشک نکل تھم رہا ہے آنکھوں میں

جوں شمع دم صبح میں یہاں سے سفری ہوں
ٹک منتظر جنبش باد سحری ہوں
جاتا ہوں میں جیدھر کو وہ منہ پھیرے ہی تجھ سے
گویا کہ میں گرد قدم رہ گذری ہوں

نے گریۂ شب ہوں میں نہ آہ سحری ہوں
جوں بانگ جرس نیم نفس بے اثری ہوں
دیکھا نہ ہیں جز سایۂ بازوئے شکستہ
حیراں زدہ جوں حسرت بے بال و پری ہوں
میں پیرہن اپنے میں سماتا نہیں جوں گل
جس وقت سے آمادہ پئے جامہ دری ہوں
سو خضر سے کم حوصلہ وہاں جی سے گئے ہیں
جس دشت خطرناک کا میں رہگذری ہوں
جوں سرو رکھا سنگ جفا سے مجھے آزاد
مرہون تیرا جی سے میں اے بے ثمری ہوں

خوش رہ اے دل اگر تو شاد نہیں
یہاں کی شادی پہ اعتماد نہیں
تا کجا امتحان صبر کہ شوخ
دل ہے آخر یہ کچھ جماد نہیں
سچ ہیں سارے کمال حضرت شیخ
لیک دل کو کچھ اعتقاد نہیں
میں کہا عہد کیا کیا تھا رات
ہنس کے کہنے لگا کہ یاد نہیں
ہو جے کس سے داد خواہ بتاں
اس ستم کی جہاں میں داد نہیں
یار اگر چاہتا ہے دے قائمؔ
جان کچھ دل سے تو زیاد نہیں

جوں شیشہ بھرا ہوں مے سے لیکن
مستی سے میں اپنی بے خبر ہوں

جو کہئے سو یہاں سے ہے فروتر کیا جانے میں کس مقام پر ہوں

کونسا دن کہ مجھے اس سے ملاقات نہیں
لیک جی چاہے ہے جوں ملنے کو وہ بات نہیں

ہوس ہے عشق کی اہل ہوا کو ہم تو میاں
سنے سے نام محبت کا زرد ہوتے ہیں

عبث ہیں ناصحا ہم سے زنخو درفتوں کی تدبیریں
رکے ہیں بحر کب گو موج سے ہوں لاکھ زنجیریں
ہماری آہ سے آگے تو پتھر موم ہوتے تھے
یہ کیا جانے وہ اب کیدھر گئیں نالے کی تاثیریں
گریباں کی تو "قائم" مدتوں دھجیئیں اڑائی ہیں
یہ خاطر جمع اس دن ہوئے جب سینے کو ہم چیریں

آوے خزاں چمن کی طرف گر میں رو کروں
غنچہ کرے گلوں کو صبا گر میں بو کروں
"قائم" یہ جی میں ہے کہ تقلید سے شیخ کی
اب کے جو میں نماز کروں بے وضو کروں

یوہیں رنجش ہو اور گلا بھی یوہیں
ہو جے ہر بات پر خفا بھی یوہیں

کچھ نہ ہم کو ہی بھا گیا یہ طور
واقعی یہ کہ ہے مزا بھی یوہیں

صید کنجشک سے نہ ہاتھ اُٹھا
آ کے پھنس جائے ہی ہما بھی یوہیں

کیوں نہ روؤں میں دیکھ خندۂ گل
کہ ہنسے تھا وہ بے وفا بھی یوہیں

نگاہوں سے نگاہیں سامنے ہوتے ہی جب لڑیاں
یکایک کھل گئیں دونوں طرف سے دل کی پھر کلیاں[1]

کمال جگ میں سزاوار ناز ہے یہ سچ
یہ ناز کرنے کو انساں میں کچھ کمال بھی ہو

عاشق نہ تھا میں بلبل کچھ گل کے رنگ و بو کا
ایک انس ہو گیا تھا اس گلستاں سے مجھ کو

ٹک تو خاموش رکھو منہ میں زباں سنتے ہو
اپنی ہی کہتے ہو میری بھی میاں سنتے ہو

سنگ کو آب کریں پل میں ہماری باتیں
لیکن افسوس یہی ہے کہ کہاں سنتے ہو

---

[1] (ن) گل چھڑیاں۔

خشک و تر پھونکتی پھرتی ہے سو آتش عشق
بچیو اس آنچ سے اے پیر و جواں سنتے ہو

کچھ لکھوں سوز دل اپنے سے اُسے اے قاصد
جائے کاغذ ہو اگر بال و پر پروانہ
شمع تک جاتے تو دیکھا تھا میں اس کو قائمؔ
پھر نہ معلوم ہوئی کچھ خبر پروانہ
قائمؔ سمجھ کے بولیو تو آپ کے حضور
پیارے معاملت ہے سخن آشنا کے ساتھ

یک شب دیکھی چمن نے وہ زلف
لاکھوں دیکھے روز سیاہ
اتنی تو مت ہو جلد نسیم
ہم بھی چمن تک ہیں ہمراہ
کوندی ہے دل پر برق سی آج
پیش نظر ہے کس کی نگاہ
وعدہ کر کے رات کا تم
خوب ہی آئے واہ جی واہ
قائمؔ سے کوئی ہوئے خفا
بندۂ خادم دولت خواہ

شیخ جی آیا نہ مسجد میں وہ کافر ورنہ ہم
پوچھتے تم سے کہ اب وہ پارسائی کیا ہوئی
رو دیئے اس غم کدہ میں آج کس کس کو یہاں

دیکھتے نظروں کے اپنے اک خدائی کیا ہوئی
گو کسی حالت میں ہو میں سمجھوں ہوں تجھے
ہے تو تو، وہی پہ تیری کبریائی کیا ہوئی

جوں موج میرا قافلہ غافل ہے سفر سے
کیا جانے کہاں جائے گا آیا ہے کدھر سے
کس رات میں جوں گل نہ ہوا غرق لہو میں
کس دن نہ بھری گود میری لخت جگر سے
وہ خار بیتیمی زدہ اس دشت میں ہیں ہول
پالا ہے جسے آبلہ نے خون جگر سے

دسبدم اس بخشش بیجا کو کیا کہتے ہیں شوخ
دل دیا تجکو تو ہم نے کچھ گنہگاری نہ کی

اگرچہ صبح تلک ہم گرم سخن
پہ کہہ سکا نہ کچھ اس سے میں بات مطلب کی
سوائے دل شکنی سب مباح ہے یہاں شیخ
خبر نہیں تجھے رندوں کے دین و مذہب کی
سوال بوسہ جو قائم کیا میں شب تو کہا

کہ کیجیے چھیڑ کہیں اور جا کے اس غضب کی
دم قدم تک سے ہمارے ہی جنوں کی رونق
اب بھی کوچوں میں کہیں شور و فغاں سنتے ہو
میں کہا تخلیق تمہاری جو کمر کہتے ہیں
تم بھی اس کا کہیں کچھ ذکر و بیاں سنتے ہو
ہنس کے یوں کہنے لگا غیر اگر ہے یوں بات
ہوئے گی وہ بھی ہاں جیسی کہ وہاں سنتے ہو
نے مجھے چاہتا ہوں نہ وصل حبیب کو
یارب کہیں ہو صبر دل ناشکیب کو
ہے بھی تو آدمی میں کہ جن سے ہی تم کو ربط
کیا شکوہ تم سے ہم رو دیے اپنے نصیب کو

بھول کر بھی وہ نہیں یاد سے جاتا اپنی
جان کر یاد سے جس نے کہ بھلایا مجھ کو
کچھ تو مخفی بات خلل کی کہ شب اس نے محرم
غیر کے آتے ہی مجلس سے اٹھایا مجھ کو

جی میں جھلیں تھیں جو کچھ سو گئیں وہ یار کے ساتھ
سر ٹپکنا ہی پڑا اب در و دیوار کے ساتھ
"کہ ہمیں خار تھے آنکھوں میں سبھوں کے سو چلے۔

بلبلو خوش رہو اب تم گل و گلزار کے ساتھ
میں دوانا ہوں سدا کا مجھے مت قید کرو
جی نکل جائے گا زنجیر کی جھنکار کے ساتھ
یارو کہتے تھے جو تم لالہ و گل ہے سو کہاں
سر ٹپکنے تو نہ آیا تھا میں کہسار کے ساتھ
ہائے صیاد یہ انصاف سے تیرے ہے بعید
یہاں تلک کیجئے ستم اپنے گرفتار کے ساتھ
گرچہ بلبل ہوں میں "قائم" و لے اس باغ کے بیچ
فرق کوئی نہ کرے گل کو جہاں خار کے ساتھ

آج اگر بزم میں ہے کچھ اثر پروانہ
اٹھتے ہیں ہائے لگن چند پر پروانہ
آتش عشق میں جلنا نہیں کار آساں
ہر مگس سے نہ طلب کر جگر پروانہ
وضع پر اپنے ہیں یہاں شادی و غم ہر اک کا
شام ماتم سے ہے کیا کم سحر پروانہ

ہم نشیں ذکر یار کر کچھ آج
اس حکایت سے جی بہلتا ہے
دل مژہ تک پہنچ چکا جوں اشک
اب سنبھالے سے کب سنبھلتا ہے
آج قائم کے شعر ہم نے سنے
ہاں اک انداز تو نکلتا ہے

جوں طفل سرشک ارغوانی
پامال ہوئی مری جوانی
ہر سانس گراں ہے تن پہ میرے
اللہ رے ضعف ناتوانی

دو چیز ہیں یادگارِ دوراں — تیرا ستم اپنی جانفشانی
ہے رشک مجھے پیامبر تک — گو تجھ سے کہے مری زبانی

وہ دن گئے کہ لوہو آتا تھا چشمِ تر سے
اب لختِ دل ہے کوئی یا پارۂ جگر ہے
غافل قدم کو اپنے رکھو سنبھال کر یہاں
ہر سنگِ رہگزر کا دکانِ شیشہ گر ہے

کب نالہ بلائے جاں نہیں ہے — کب آفتِ دل فغاں نہیں ہے
کب چشم پہ ناگوار نہیں خواب — کب دل پہ نفس گراں نہیں ہے
ہے کونسا دم کہ تازہ نوحہ — سر جوشِ لب و دہاں نہیں ہے
کس دن نہ دل برنگِ اخگر — صد آتشِ غم نہاں نہیں ہے
کب رات ہوئی کہ چشمِ تر سے — جو نالۂ دل رواں نہیں ہے
سب کچھ ہے جو چاہیے مگر صبر — اک جنس ہر دو کہ یہاں نہیں ہے
بس تا بکجا اٹھائیں یہ غم — کیا ہم ہیں تو ہم میں جاں نہیں ہے
کہتا میں نہیں کہ ظلم ہے بد — یہ خوب ترے مہرباں نہیں ہے
سو بات کہوں پر اس کے آگے — گویا منہ میں زباں نہیں ہے
قائم سا عزیز خوار ہو حیف — کوئی ہند میں قدرداں نہیں ہے

پھرے زمانہ جہاں تک ہی ہم سے یا نہ پھرے
کسی کے پھرنے نہ پھرنے سے کیا خدا نہ پھرے
فلک رلائے تو ہے ہم کو لیک یہ ڈر ہے
کہ بلبلہ سا کہیں آپ ہی بہا نہ پھرے
ہزار حیف کہ گلچیں ہے اس جگہ گستاخ
میں جس چمن میں یہ چاہوں تھا یہاں صبا نہ پھرے

تھی خیر یہی کہ رات پیارے
تم غیر کی گفتگو نہ سمجھے
سمجھو گے ہمارے بعد ہم کو
پر حیف کہ روبرو نہ سمجھے
ایک عرض تو تھی پر اس سے پیارے
کیا کہیے جو بات سنتا کو نہ سمجھے
قسمت کہ وہ چارہ گر اپنا
جو زخم سے تا رفو نہ سمجھے
سو حرف ہیں خامشی میں لیکن
اس بات کو ہرزہ گو نہ سمجھے
شایان چمن نہیں وہ بلبل
ہر گل کا جو رنگ و بو نہ سمجھے
سمجھا رہے ہم تو تجھکو "قائم"
پر کہیئے کیا جو تو نہ سمجھے

قطعات و رباعیات کی اگرچہ شیفتہ نے تعریف کی ہے لیکن وہ ایسے زیادہ تعریف کے قابل نہیں، اُن میں زیادہ تر لفظوں کے ہیر پھیر اور تلازمے سے مضمون پیدا کئے ہیں۔ نمونے کے طور پر ایک قطعہ اور ایک رباعی درج کی جاتی ہے۔

رباعی

قائم جو تو نواب سے دکھ پایا ہے کہہ بھڑوے کو جو زباں پر آیا ہے
سر نہیں کھایا کہ رہیگا خاموش کھایا ہے اگر تو تو نمک کھایا ہے

قطعہ

اندازہ نگاہ رکھ سخن میں یعنے جو کہے ہے نیک کہہ تو
دو گوش ترے ہیں اور زباں یک تا دو نہ سنے نہ ایک کہہ تو

عبدالحق
سکریٹری انجمن ترقی اردو
اورنگ آباد (دکن)

مقدمہ چمنستان شعرا

رائے لچھمی نرائن متخلص شفیق ؔ صاحب کے والد رائے منسا رام نواب نظام الملک آصفجاہ مرحوم کے عہد میں پیشکار صدارت شش صوبہ دکن تھے[۱] رائے منسا رام اپنی ایک کتاب[۲] کے شروع میں لکھتے ہیں کہ "بندہ عقیدت شناس منسا رام آصفجاہی ابن بھوانی داس غازی الدین خانی نبیرۂ بال کشن عابد خانی نے تخمیناً مدت پچاس سال اس سرکار دولت مدار میں اپنی زندگی بڑی اچھی طرح بسر کی، صدارت کل کی خدمت انجام دی اور مورد عاطفت و شفقت رہا"

شفیق ؔ کھتری قوم سے تھے اور ان کے بزرگ لاہور کے رہنے والے تھے۔ ان کے دادا بھوانی داس لشکر عالمگیری کے ہمراہ دکن میں آئے اور اورنگ آباد میں سکونت پذیر ہو گئے۔ رائے منسا رام کو صغرسنی ہی میں یتیمی کا داغ نصیب ہوا۔ سن شعور کو پہنچکر ایسی لیاقت حاصل کی کہ نواب مغفرت مآب آصفجاہ اول کے عہد میں پیشکار صدارت صوبہ جات دکن کی خدمت پر فائز ہو گئے۔ منسا رام چار پشت سے

[۱] شام غریبان باب آخر [۲] مآثر نظامی

خاندان آصفجاہ کے نمک خوار تھے۔

راے منسا رام محض دفتر کے پیشکار یا سررشتہ دار ہی نہ تھے بلکہ تاریخ و انشا کا بھی ذوق رکھتے تھے اور صاحب تالیف و تصنیف ہوئے ہیں۔ ایک کتاب اُن کی مآثر نظامی ہے۔ یہ کتاب اُنھوں نے اس زمانے میں لکھی تھی جب ناموافق حالات کی وجہ سے خانہ نشین ہو گئے تھے۔ اس کتاب میں نواب نظام الملک آصفجاہ اول کے حالات ہیں۔ ابتدا میں ان کے بزرگوں کا بھی تذکرہ آگیا ہے۔ یہ حالات کچھ تو مصنف کے چشم دید ہیں اور بعضے ایسے ہیں جو ثقات سے معلوم ہوئے اور بعض حالات خود نواب آصفجاہ مرحوم کی زبان مبارک سے سننے میں آئے۔ یہ کتاب ۱۲۰۰ھ میں مرتب ہوئی اور جب انیس سال کی گمنامی اور گوشہ نشینی کے بعد حضرت مرشد زادۂ آفاق مہین پور خلافت و ریاست ... نواب عالیجاہ بہادر اسار جنگ" نے یاد فرمایا تو یہ رسالہ بطور تحفہ حضور میں پیش کیا۔ انکی دوسری تالیف "قانون دربار آصفی" ہے یہ کتاب بھی زمانۂ گوشہ نشینی کی لکھی ہوئی ہے سنہ تالیف ۱۱۷۵ھ ہے۔ اس میں ضوابط دربار کے علاوہ بعض بعض بڑے کام کی باتیں بھی آگئی ہیں مؤلف نے آخر میں لکھا ہے کہ یہ کتاب میں نے دو روز میں لکھی۔

اس سے یہ معلوم ہوگا کہ شفیق، ایسے گھرانے میں پیدا ہوئے تھے جہاں علمی چرچا تھا اور خود ان کے والد صاحب تالیف و تصنیف تھے۔ شفیق کی ولادت ۱۱۵۸ھ میں ہوئی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ شمالی

ہندوستان سے لیکر دکن تک ریختہ گوئی کی گرم بازاری ہے اور منجملہ دوسرے شہروں کے اورنگ آباد بھی مرکز شعر و سخن بنا ہوا ہے اگرچہ اس وقت ذرائع آمد و رفت کی یہ آسانیاں نہ تھیں جو اس وقت ہیں لیکن اس پر بھی شمال کے اساتذہ کا تازہ کلام یہاں پہنچتا رہتا ہے اور بڑے اشتیاق سے پڑھا جاتا ہے اور مشہور خاص و عام ہو جاتا ہے۔ جس سے صاحب ذوق لوگوں کے دلوں میں نئی نئی امنگیں پیدا ہوتی ہیں اور وہ ان باکمال اساتذہ کی تتبع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

"شفیق" کی تعلیم رواج زمانہ کے مطابق فارسی، عربی، صرف و نحو انشا وغیرہ میں ہوئی اور جیسا کہ خود انھوں نے اس تذکرے میں لکھا ہے، شیخ عبدالقادر صاحب سے کتب متعارفہ کی سند حاصل کی۔ بدو سن شعور ہی سے ان میں شعر و سخن کا ذوق پیدا ہو گیا تھا اور گیارہ سال کی عمر سے شعر کہنے لگے تھے۔ میر غلام علی "آزاد" بلگرامی جن کا شمار ہندوستان کے جیّد علماء میں ہے اور جو فن شعرگوئی اور تاریخ میں ید طولیٰ رکھتے تھے، دکن ہی میں تھے، "شفیق" کو ان سے تلمذ کا شرف حاصل ہوا۔ لکھتے ہیں کہ "میر عبدالقادر مہربان نے جو حضرت "آزاد" کے تلامذہ میں سے تھے، مجھے "صاحب" تخلص عنایت فرمایا۔ غزلیات کا دیوان جس میں تقریباً دو ہزار بیت تھے، مرتب کیا لیکن جب ذرا استعداد بڑھی اور اصطلاح شعرا اور قواعد شعرا میں مہارت حاصل ہوئی تو اسے تقویم پارینہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ اب کہ میری عمر اٹھارا سال کی ہے مجھ

یہ معلوم ہوا کہ ایک صاحب میر محمد مسیح کا تخلص فارسی میں 'صاحب' ہے تو میں نے "میر صاحب وقبلہ" (آزاد بلگرامی) سے تخلص کی التجا کی۔ آپ نے ازراہ شفقت "شفیق" تخلص عطا فرمایا۔ چونکہ میرے ریختے عوام وخاص میں مشہور ہو چکے تھے۔ اس لئے ریختے میں "صاحب" ہی تخلص رہنے دیا اور جن بحروں میں "شفیق" نہیں کھپ سکتا وہاں ناچار "صاحب" ہی رکھنا پڑا۔ اس نئے تخلص کی خوشی اور شکریے میں وہ ایک قطعہ موزوں کرتے ہیں اور "تخلص نوی" اس کی تاریخ نکالتے ہیں۔ مہربان 'شفیق' کے خاص دوستوں میں سے تھے۔ ان کے حالات میں ان کی بہت تعریف کی ہے۔

میر غلام علی آزاد، ۱۱۵۲ھ ۱۷۳۹ء میں اورنگ آباد وارد ہوئے اور بابا شاہ مسافر کے تکیہ میں قیام کیا اور سات سال یہیں بسر کر دئے آزاد کی عمر کے اڑتالیس سال دکن ہی میں گزرے اور یہیں وفات پائی اور خلد آباد میں پیوند زمین ہوئے۔ آپ کی فیض صحبت سے دکن کے اکثر باکمال مستفیض ہوئے۔ انہیں میں شفیق تھے۔ شفیق کو آزاد سے کمال عقیدت مندی تھی اور جہاں کہیں ان کے تالیفات میں آزاد کا نام آیا ہے تو ان کا ذکر بڑے ادب واحترام اور خلوص وارادت سے کرتے ہیں اور ہر جگہ انھیں "میر صاحب قبلہ" "پیر ومرشد" یا "قبلہ وکعبہ برحق" اور اپنے آپ کو "غلام" لکھتے ہیں۔ (غالباً اس میں آزاد کے لفظ کی رعایت بھی ملحوظ ہے) گل رعنا میں آزاد کا تذکرہ تفصیل سے لکھا ہے۔ اپنے کلام میں جابجا حضرت کے کمال اور اپنے تعلقات وعنایات کا ذکر کیا ہے،

ایک پر زور قصیدہ ان کی مدح میں لکھا ہے۔

للہ الحمد صبا مژدہ عشرت لائی | کہ بہار اب کے تجمل سے چمن میں آئی
شاہ گل تخت چمن پر ہے بصد زینت و ناز | سرو شمشاہ ہیں استادہ وہاں مجرائی

بہاریہ تشبیب کے بعد گریز کی ہے :-

طبع حضرت سے اگر وام کرے رنگینی | اب جو کرتی ہے بہار ایسی چمن آرائی
یعنی وہ حضرت آزاد کہ خورشید و قمر | آستاں اُسکی پہ رکھتے ہیں جبیں فرسائی
قبلۂ ہر دو جہاں، مرشد ارباب سلوک | ختم ہے ذات مبارک پہ کرم فرمائی
علم منقول میں اُسکو دم عیسیٰ ہیگا | علم معقول میں اُسکو ہے ید بیضائی
قمریان عرب اس کی ہیں ثنا خوانی میں | عندلیبان عجم کی ہے سخن پیرائی
بسکہ رکھتا ہے سخن ہیچ و شیریں کاری | ہند کے طوطیوں کو اُس سے ہے شکر خائی
نگہ لطف مرے پر ہے ہمیشہ بندہ دل | مجھ کو زیبا ہے غلامی اسے ہے آقائی

اس کے بعد دعا ہے اور دعا کے بعد یہ مقطع ہے۔

فارسی شعر کہو مدح میں اُسکی صاحب | کہ ملے تجھکو خطاب ملک الشعرائی

اسی طرح ایک پوری غزل آزاد کی شان میں کہی ہے۔ غزل کیا ہے گویا اپنے پیر و مرشد کی شان میں چھوٹا سا قصیدہ ہے :-

سرور ہر دو جہاں آزاد ہے | والئی کون و مکاں آزاد ہے
کنت کنزاً کے معانی پر خبر | واقف سر نہاں آزاد ہے
مرکز ادوار چرخ چنبری | قطب الاقطاب زماں آزاد ہے
اسم اعظم ہے زباں زد اسکے تئیں | جسکے تئیں ورد زباں آزاد ہے

خورد و بزرگ کے تئیں یہاں ہے رسوخ — مرشد پیر و جواں آزاد ہے
ایک دم میں دین و دنیا بخش دے — جس کے اوپر مہرباں آزاد ہے
دل سے اب صاحب ہوا ہے گا غلام — بادشاہ انس و جاں آزاد ہے

کہاں تک لکھوں "شفیق" کی عقیدت کے اظہار کے لئے یہ بہت کافی ہے۔

حضرت آزاد کا ذوق سخن محتاج بیان نہیں، ایسے صاحب ذوق اور باکمال لوگ کم ہوتے ہیں ان کا کلام اور ان کی تصنیفات اس کی شاہد ہیں اس کے ساتھ تاریخ و سیرت کا ذوق بھی اعلیٰ درجے کا تھا۔ ان کے تذکرے اس فن کے بہترین نمونے ہیں مآثر الامرا جو تاریخی لحاظ سے بے مثل کتاب ہے، انھیں کے فیض اثر کا نتیجہ ہے بلکہ بہت کچھ حضرت آزاد، ہی کے قلم کی ممنون ہے۔ ادب میں ان کی نظر بہت وسیع تھی اور تحقیق و تلاش میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ اچھا استاد دنیا کی بہترین نعمتوں میں سے ہے شفیق بڑا خوش قسمت تھا کہ اسے آزاد، سا استاد ملا۔ اس نے بھی استاد کے قدم بقدم چلنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ شاعر تو وہ لڑکپن سے تھا، فارسی اور اردو دونوں میں اس کا کلام موجود ہے اگرچہ کمیاب ہے۔ اسکے علاوہ اس کی تصنیفات و تالیفات دو قسم کی ہیں۔ ایک تو شعرا کے تذکرے اور دوسری تاریخی کتابیں یہاں ان تالیفات* کا مختصر سا ذکر کیا جاتا ہے۔

* اس مقدمہ میں رائے منسارام اور شفیق کی تالیفات کا ذکر آیا ہے ان میں سے تین شگرف حالات حیدرآباد ریو کی فہرست سے ماخوذ ہے، باقی کتابیں میرے پاس موجود ہیں۔

تاریخ
حقیقتہائے ہندوستان

"شفیق" اس کتاب کی حقیقت دیباچے میں اس طرح لکھتے ہیں کہ "راقم کے والد رائے منسارام نے جو چار پشت سے نمک خوار خاندان آصفیہ ہیں ۱۲۰۴ھ میں اورنگ آباد سے فردوں کے چند طبلق میرے پاس حیدرآباد بھیجے یہ میرے جدّ ماجد کے لکھے ہوئے تھے، جو سرکار حضرت کلاں علیہ المغفرۃ والرضوان میں خدمت مستوفی گری اور پیشکاری صدارت امکنہ ہندوستان پر فائز تھے، یہہ فردیں نواب مغفرت مآب نظام الملک کے دستخط سے مزیّن تھیں لیکن ان میں سے بعض بوسیدہ ہوگئی تھیں اور اکثر کرم خوردہ تھیں۔ ان فردوں میں قدیم زمانہ کے مختلف سنین سے ۱۱۳۹ف تک کے داخل و مخارج جمعیت سپاہ وغیرہ کا حساب بطور سیاق و اصطلاح اہل جرائد میں درج تھے ان سب کو سادہ عبارت میں تحریر کیا اور رقمی اعداد کو الفاظ میں لکھا اور اسکے علاوہ دوسری معلومات بھی فراہم کرکے مناسب مقامات پر اضافہ کیں۔

یہ کتاب "شفیق" نے اس وقت کے رزیڈنٹ اور اپنے سرپرست کپتان ولیم ہیٹرک کے لئے تالیف کی۔ کتاب کے نام سے اس کا سنہ تالیف (۱۲۰۴ھ) نکلتا ہے، اس میں چار مقالے ہیں۔

مقالہ اوّل میں دفتر قدیمہ کی فردوں کی کیفیت ہے۔

مقالۂ دوم میں صوبہ ہائے ہندوستان کا حال ہے۔

مقالہ سوم میں صوبجات دکن کا ذکر ہے۔

مقالہ چہارم میں مسلمان سلاطین ہند کا مختصر حال سلطان معزالدین سام سے لیکر شاہ عالم بادشاہ تک ہے۔

یہ کتاب اچھی ضخیم ہے اور اس میں ہر سرکار پرگنہ اور رحویلی کے مداخل اہمیت اور فاصلہ درج ہے ضمنی طور پر مختصر تاریخی واقعات بھی آگئے ہیں۔ غرض یہ کتاب اپنی نوعیت کے لحاظ سے بہت قابل قدر ہے۔

تمیق شگرف

یہ بھی دکن کی تاریخ کے متعلق ہے۔ مختلف صوبوں کے جغرافی اور تاریخی حال اور اعداد و شمار ہیں۔ اس کے بعد سلاطین بہمنیہ کا ذکر ہے جو تاریخ فرشتہ سے ماخوذ ہے سلطنت بہمنیہ کے زوال پر جو حکومتیں قائم ہوئیں (یعنی عادل شاہی، عماد شاہی، قطب شاہی، برید شاہی، اور خاندیس کے فاروقی سلاطین) ان کا مختصر حال ہے۔ آخر میں سلاطین تیموریہ کا ذکر سنہ ۱۲۰۰ تک ہے۔ یہ نام بھی تاریخی ہے جس سے سنہ تالیف ۱۲۰۰ ہجری نکلتا ہے۔ یہ کتاب حیدرآباد کے رزیڈنٹ مسٹر رچرڈ جانسن کے نام معنون ہے۔

مآثر آصفی

یہ خاندان آصفجاہ کی تاریخ ہے، یعنے خواجہ عابد (نظام الملک آصفجاہ اول کے دادا) سے لیکر آصفجاہ ثانی تک کے حالات ہیں، مرہٹوں نے جو ہندوستان پر حملہ کیا تھا اس کا بھی ذکر ہے نیز اس زمانہ کے امرا وادہ

راجاؤں کے حالات بھی لکھے ہیں۔ کتاب ۱۲۰۳ھ میں تالیف ہوئی۔

بساط الغنائم

یہ مرہٹوں کی تاریخ ہے۔ یہ کتاب اس نے سرجان ملکم کی فرمائش سے لکھی، جو اس وقت حیدر آباد میں تھے، اس میں مرہٹوں کی تاریخ ابتداء سے مؤلف کے وقت تک کی ہے اس کا ایک حصہ شفیق نے کسی مرہٹی تاریخ سے ترجمہ کیا ہے۔ نام تاریخی ہے جس سے ۱۲۱۵ھ نکلتا ہے۔

حالات حیدر آباد

اس میں بلدہ حیدر آباد کی مساجد، محلات، و باغات اور شہر کی مختصر تاریخ ہے اور بیدر اور ورنگل کے حالات بھی درج ہیں۔ یہ کتاب بھی ۱۲۱۴ھ کی تالیف ہے۔

تذکرے

شام غریباں

یہ تذکرہ ان ایرانی شعراء کا ہے جو کسی نہ کسی وجہ سے ہندوستان میں وارد ہوئے۔ نام بھی مضمون کی مناسبت سے رکھا ہے۔ اگرچہ حالات بہت مختصر ہیں، مگر کتاب دلچسپ ہے اور اشعار کا انتخاب خوب ہے۔ لطائف و ظرائف سے خالی نہیں۔ بعض بعض جگہ اشعار کے متعلق خاص نکات بھی بیان کر دیے ہیں۔

گل رعنا

یہ ہندوستان کے فارسی گو شعرا کا تذکرہ ہے اس میں وہ ایرانی نژاد بھی ہیں جن کے باپ دادا ہندوستان میں آئے اور یہیں رہ گئے اور ہندی نژاد بھی اس میں دو فصلیں ہیں ایک میں "شعرائے اسلاسیاں" کا اور دوسری میں "نکتہ پردازان اصناسیاں" کا تذکرہ ہے۔ یہ تذکرہ "شام غریباں" سے بہت بڑا ہے اور اکثر حالات بھی مفصل بیان کئے ہیں۔ اپنے استاد "آزاد بلگرامی" کا تذکرہ تفصیل سے لکھا ہے۔ اکبر کا حال کوئی ۶۴ صفحوں میں ہے مگر سب ملا عبدالقادر بدایونی کی تاریخ سے ماخوذ ہے۔ افسوس کہ "شفیق" نے اس میں تحقیق سے مطلق کام نہیں لیا۔ وہ اس مورخ کے ادعائے راست گوئی کو اس کے جذبات تعصب، حسد و رشک سے جدا نہ کر سکے۔ علامہ فیضی کے حالات بھی بلا کم و کاست بدایونی سے نقل کر دئے ہیں۔ شفیق بدایونی کو بالکل نہیں سمجھے۔

"شام غریباں" کے مقابلہ میں اس تذکرے میں تاریخی واقعات اور لطائف و ظرائف بھی زیادہ ہیں۔ بعض بعض مقامات پر اشعار کی شرح بھی کر دی ہے اور ان کے نکات بھی بتا دئے ہیں۔ مثلاً میر محمد افضل الہ آبادی "ثابت" کے ایک قصیدے میں کثرت سے طبی تلمیحات و اصطلاحات ہیں۔ اسکے اشعار نقل کر کے ان تمام تلمیحات و اصطلاحات کی شرح لکھی ہے۔ اسی شاعر کا ایک دوسرا معرکے کا قصیدہ ہے، اس کا انتخاب درج کیا ہے اور اس کے مشکل مقامات کا حل بھی لکھ دیا ہے۔ یہ تذکرہ ہر لحاظ سے قابل قدر ہے۔

چمنستانِ شعرا

یہ ریختہ گو شعرا کا تذکرہ ہے "شفیق" لکھتے ہیں کہ "جب ہندوستان سے تازہ تازہ میر محمد تقی "میر" اور فتح علی خاں کے تذکرے پہنچے تو سارے عالم میں غلغلہ پڑ گیا اور اشعار ہند کے اشتیاق میں ایک دنیا تہ و بالا ہو گئی، کیونکہ اہل دکن کو ان اشعار کا بہم پہونچنا دشوار ہے۔ اس لئے میری فکر ناقص میں یہ بات آئی کہ ان دونوں تذکروں کے اشعار اور دوسرے جواہر پارے ان کے ساتھ ملا کر ایک سفینہ تیار کروں۔ اس تقریب سے بعض احباب سخن داں کے حالات و کلام کے جمع کرنے کا موقع بھی مل جائے گا۔ دوست احباب نے بھی اسکی تائید کی بلکہ اصرار کیا اور میں اس کتاب کے لکھنے پر آمادہ ہو گیا۔"

"شفیق" نے اس تذکرے کی ترتیب میں عجیب جدت دکھائی ہے اب تک جتنے فارسی اردو کے تذکرے لکھے گئے ہیں (سوائے میر صاحب کے تذکرے کے، جس میں کوئی ترتیب نہیں) ان میں ناموں کی (یعنے تخلصوں کی) ترتیب حروف تہجی کے لحاظ سے ہے، لیکن "شفیق" نے اس تذکرے کی ترتیب حروف ابجد یعنے حساب جمل کے لحاظ سے رکھی ہے اس میں کوئی خاص خوبی نہیں معلوم ہوتی، نہ خود مؤلف نے اس کی کوئی وجہ بتائی ہے۔ سوائے اسکے کہ جوانی کی ترنگ کہا جائے اور کیا کہہ سکتے ہیں۔

جوانی کا زمانہ ہے، عبارت میں رنگینی پائی جاتی ہے، بعض اوقات

تشبیہات و استعارات میں باتیں کرتے ہیں۔ جہاں کہیں موقع ملتا ہے شاعر کے تخلص یا اس کے پیشے وغیرہ کی مناسبت سے اسی قسم کے الفاظ اور تشبیہات میں اس کا حال لکھنا شروع کر دیتے ہیں (مثلاً ملاحظہ ہوں۔ آشنا، آوارہ، بہار، داود، خاکسار، زکی، محمد علی حشمت، مخلص، ناطق وغیرہ کے حالات) لیکن عبارت گنجلک نہیں، بیان صاف اور شستہ ہے اور زبان پر قدرت ہے۔ کہیں کہیں میر صاحب (میر تقی) کی طرح اصلاح بھی دے دیتے ہیں۔ یا شعر میں کوئی کنایہ یا خاص نکتہ ہوتا ہے تو اسکی طرف بھی اشارہ کر دیتے ہیں، جس سے شفیق کی سخن فہمی اور سخن سنجی کا اندازہ ہوتا ہے۔

اگرچہ شفیق، نے اپنے تذکرے کی بنیاد میر صاحب اور فتح علی کے تذکروں پر رکھی ہے لیکن انکے علاوہ جہاں جہاں سے جو جو حالات مل گئے ہیں حوالے کے ساتھ ان کا بھی اضافہ کر دیا ہے۔ چنانچہ کتاب کے مطالعہ میں بعض جگہ شاہ عبدالحکیم حاکم کے تذکرہ مردم دیدہ، اور تذکرہ مجمع النفائس، تالیف سراج الدین خاں آرزو، سرو آزاد، اور حاجی علی اکبر رمال اور رضا خاں انوار کی بیاضوں کا حوالہ ملے گا۔

بعض اوقات اشعار کے متعلق مغالطہ ہو جاتا ہے اور یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض اشعار خصوصاً مشہور اشعار مختلف شعراء کے کلام میں پائے جاتے ہیں، شفیق نے اس باب میں بڑی احتیاط اور تحقیق سے کام لیا ہے جن اشعار کا پتا نہیں چلا وہ تذکرے کے آخر میں جمع کر دئے ہیں کہ ان کا پتا چلانا دشوار ہے، خصوصاً اہل دکن کے لئے کیونکہ ایک ہی تخلص کے کئی کئی شاعر

ہیں۔ ہندوستان سے اشعار اکثر صرف تخلص کے ساتھ آتے ہیں اور نادان پڑھنے والے سب کو خلط ملط کر دیتے ہیں اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ شعر حقیقت میں اس کا ہے۔

شفیق، ہر شاعر کے تذکرے میں انصاف کو ملحوظ رکھتا ہے اور کبھی کسی پر ناگوار نکتہ چینی نہیں کرتا چنانچہ یقین، کے بیان میں خود لکھتا ہے کہ جب کسی شاعر کے کلام میں کوئی ثقیل مصرع نظر پڑا تو خود ایک دوسرا مصرع لکھ دیا ہے اور ساتھ ہی یہ کہہ دیا ہے کہ یہ مصرع بھی خوب معلوم ہوتا ہے۔ اپنے مصرع کو ترجیح نہیں دی، بلکہ پڑھنے والے کی پسند پر چھوڑ دیا ہے۔

لیکن یقین کا تذکرہ مستثنیٰ سمجھنا چاہیئے۔ اس میں اس نے اس قدر مبالغے بلکہ غلو سے کام لیا ہے کہ خلاف عادت شفیق، کو اپنی طبیعت پر قابو نہیں رہا، وہ اسے اردو کا سب سے بہتر شاعر خیال کرتا ہے اور ہندوستان میں کسی کو اس کی ٹکر کا نہیں سمجھتا۔ کہتا ہے کہ اگرچہ مرزا سودا کا غزل، رباعی، مخمس، مثنوی، قصیدے، قطعہ بند وغیرہ میں بڑا رتبہ ہے اور وہ بہت عالی تلاشی کرتے ہیں۔ لیکن یقین، کے ریختہ میں کچھ اور ہی فصاحت و ملاحت ہے۔

اگر ہزار برس تک یہ میرزا سودا، کرے جو فکر تتبع یقیں کا از دل و جاں
کہے گا معنی باریک خوب و شیریں تر ولے نزاکت و یہ لطف و یہ قبول کہاں

وہ یکتائے عصر اور یگانۂ زمانہ ہے اور ایسا معنیٰ آفریں اور نکتہ رس دنیا میں پیدا نہیں ہوا"۔ میر صاحب نے اپنے تذکرے میں جو یقین، پر طعن و تعریض کی ہے اور اسے متبذل بند کہا ہے اور سرقہ کا الزام لگایا ہے تو۔

اس پر شفیقؔ آپے سے باہر ہو جاتا ہے اور میر صاحب کو خوب سخت سست کہتا ہے، سوداؔ نے جو میر صاحب کی ہجو کہی تھی اسے نقل کرکے اس کی داد دیتا ہے۔ اسکے بعد توارد و سرقہ پر بحث کی ہے، دوسرے علما کے اقوال نقل کئے ہیں اور خود اپنا قطعہ بھی جو اس مضمون پر لکھا ہے نقل کیا ہے غرض میر صاحب کے خلاف خوب زہر اُگلا ہے اور خود میر صاحب کے ذکر میں بھی ان کی حرف گیری پر چوٹ کی ہے۔

غرض یقینؔ کی شاعری کا بہت بڑا مداح اور معتقد ہے اور اسکی تقلید کو فخر سمجھتا ہے۔ اپنے کلام میں کہیں کہیں اس کا اشارہ کیا ہے مثلاً ایک غزل کا مقطع ہے:۔

دیوان یقینؔ خوش خط صاحب نے لکھایا ہے　　اوراق طلائی پہ کھینچی ہیں کی تحریریں

یقینؔ کا تذکرہ اور کلام تقریباً ۱۴ صفحوں میں درج ہے۔ اسی سے قیاس ہو سکتا ہے کہ وہ اس شاعر کو کیا سمجھتا تھا۔

حاجی میر علی اکبر رمال حاجی، سے شفیقؔ نے رمل وغیرہ کی تحصیل کی تھی۔ حاجی کے تذکرے میں خود بھی اپنے اظہار کمال کے لئے ایک زائچہ دیا ہے جس سے عام ناظرین کو کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی ہے ایک نوجوان طالب علم کا شوق نمود و نمائش سمجھنا چاہیئے۔

شفیقؔ کا تذکرہ میر صاحب اور فتح علی کے تذکروں سے بڑا ہے اور بہت سے ایسے شعرا کا تذکرہ درج ہے جو ان دونوں میں نہیں پایا جاتا بہت سے ایسے ہیں جو شفیقؔ کے ہم عصر ہیں اور جن سے اُسکی ذاتی ملاقات

ہے اور خود ان شاعروں سے ان کا منتخب کلام لیکر درج تذکرہ کیا ہے۔ ایسے حالات خاص طور پر قابل اعتبار ہیں۔

سب سے قابل تعریف بات یہ ہے کہ شفیق نے یہ تذکرہ (۱۸) برس کی عمر میں لکھنا شروع کیا اور بغیر کسی کی مدد کے بہت تھوڑے عرصہ میں ختم کر دیا۔ اس عمر میں ایسی اچھی کتاب کا تالیف کرنا اعجاز سے کم نہیں۔ اس سے شفیق کی غیر معمولی ذہانت اور لیاقت معلوم ہوتی ہے۔ کتاب کا نام "چمنستانِ شعرا" تاریخی ہے اور اس سے ۱۱۷۵ھ سن تالیف نکلتا ہے

جہاں تک تحقیق کیا گیا، اس تذکرے کا صرف ایک ہی نسخہ ہے، جو کتب خانۂ آصفیہ سرکار عالی حیدر آباد میں ہے اور یہ بھی کرم خوردہ، فرسودہ اور مشکوک ہے۔ یہ اسی نسخہ کی نقل ہے۔ اس کی تصحیح میں بیحد دقت اٹھانی پڑی، بعض عبارتیں اصل کتب سے جو اس کا ماخذ ہیں، صحیح کرنی پڑیں، کہیں قیاس سے کام لینا پڑا اور بعض بعض مقام پر کچھ الفاظ جو کتاب کے ازلی دشمن کیڑے چٹ کر گئے ہیں، ویسے ہی چھوڑنے پڑے اور ان کی جگہ نقطے دے دئیے ہیں، بہت سے اشعار جو تذکرے میں مشکوک یا کرم خوردہ تھے، شعرا کے اصل دیوانوں سے تلاش کر کے لکھے گئے بعض الفاظ جو مشتبہ تھے اور ان کی صحت نہ ہو سکی، ان کے سامنے استفہام کی علامت لکھ دی گئی ہے۔ اس کے بعد بھی ممکن ہے کہ غلطیاں رہ گئی ہوں؟ اگر دوبارہ اشاعت کی نوبت آئی تو جہاں تک ممکن ہوگا اصلاح کی کوشش کیجائیگی۔

ایک کام اسکی ترتیب میں اور کیا گیا ہے، جسے غالباً ناظرین

پسند فرمائیں گے، یعنے "تحفۃ الشعرا" تالیف افضل بیگ خاں قاقشال اورنگ آبادی (سنہ تالیف ۱۱۶۵ھ) سے ان ریختہ گو شعرا کا حال اور کلام جو شفیق کے ہاں بھی پائے جاتے ہیں حاشئے میں درج کردیا ہے۔ جن جن شاعروں کا اس میں اردو کلام نہیں وہاں صرف حالات ہی لکھ دیئے گئے ہیں اور جہاں حالات میں کوئی نئی بات نہیں ہے وہاں صرف کلام پر اکتفا کیا گیا ہے۔ مشترک کلام ہر جگہ خارج کردیا گیا ہے۔ بعض شاعر ایسے بھی ہیں، جن کا ذکر "چمنستان" میں نہیں ہے، ان کا حال اور کلام ہر حرف کے آخر میں درج کردیا گیا ہے۔ اس سے پڑھنے والوں کو ضرور بصیرت ہوگی اور وہ "تحفۃ الشعرا" کے مطالعہ سے مستغنی ہوجائیں گے۔ یہ تذکرہ "چمنستان" سے پہلے کا لکھا ہوا ہے۔ اصل میں یہ فارسی گو شعرا کا تذکرہ ہے، اس میں ضمناً ایسے شعرا بھی آگئے ہیں جو اردو میں بھی شعر کہتے تھے۔ بعض شعرا کے حالات اس میں کسی قدر تفصیل سے لکھے ہیں۔

شفیق کا کلام

شفیق کے اردو کلیات کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پرگو شاعر تھا۔ زبان پر قدرت تھی اور شاعری کے نکات سے خوب واقف تھا۔ اور اس کا کلام شعر کی تقریباً ہر صنف میں موجود ہے۔ اگرچہ وہ اردو کا اعلیٰ درجہ کا شاعر نہیں ہے مگر اوسط درجہ کے شعرا میں اس کا پایہ بہت بلند ہے۔ غزلوں کے علاوہ قصیدوں اور مثنویوں میں خوب زور دکھایا ہے۔ شہر آشوب واسوخت، مخمس، مثلث، رباعیاں اور تضمینیں بھی لکھی ہیں۔ ان نظموں

سے کہیں کہیں شفیقؔ کے ذاتی حالات کا پتا چلتا ہے۔ مثلاً شفیقؔ نواب نظام علیخاں آصف جاہ ثانی کے فرزند میر احمد علیخاں عالیجاہ کے متوسلین میں تھے یہ بڑے قدر داں اور مہذب رئیس تھے اور شفیقؔ کو انہیں کی سرکار سے تعلق تھا۔ ان کی مدح میں اس نے کئی قصیدے لکھے ہیں۔ چنانچہ ایک قصیدے میں صاف صاف نام اور پتا بتا دیا ہے:۔

یک زبردست ہے مرا والی
یک قوی دل مرا ہے پشت پناہ
حق و باطل ہے سامنے جس کے
یوں عیاں جس طرح سفید و سیاہ
یعنے نواب میر احمد خاں
اسدالملک حضرت عالیجاہ
باپ جس کا نظام دولت و دیں
جد ہے جس کا جناب آصف جاہ

ایک دوسرے قصیدے میں لکھتے ہیں:۔

جناب پاک یعنے میر احمد خاں عالیجاہ
کہ جس کی عمر و دولت کا نگہبان ایزد سبحاں

آگے چلکر سفر میں رہنے کی صعوبت اور اپنے ضعف کی شکایت کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انکی ملازمت ایسی تھی جس میں دورہ کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ کہتے ہیں:۔

مگر فضل خداوندی مری اب دستگیری کر
نشست شہر فرماوے عنایت کر کے نیم ناں

آخر میں اپنے لڑکے کے لئے درخواست کی ہے:۔

مدد چرخ اب مرا دستخط ہوئے اس بندہ زادے کو
تعین ہو ڈیوڑھی کا بلدہ کی جبتک کہ ہے ناداں

ایک اور قصیدے میں بھی اپنے آقا کا نام اور خطاب کا ذکر کیا ہے

چراغ دودہ حیدر جناب میر احمد خاں
کہ جس کے عہد کے تیئیں چرخ بریں سے ذوالفقار آئے
وہ اسد الملک اسد اللہ اس کا بانہہ بل ہے
کہ جسکی دھاک سے شیروں کو تب بے اختیار آئے
نظام الدولہ آصف جاہ کا فرزند ارشد ہے
کہ دولت جسکے در پہ جبہ سا امیدوار آئے

ایک صاحب مسمی شفیق کو بے حد الفت تھی اور اکثر غزلوں میں انتہائے محبت سے "میرا میاں" میرا میاں کر کے اسے یاد کیا ہے بعض غزلیں کی غزلیں اسکی یاد میں ("میرا میاں" کی ردیف میں) لکھ ڈالی ہیں ایک قصیدہ بھی اسی ردیف میں لکھا ہے اور بڑے شوق اور محبت سے اس کا ذکر کیا ہے جسکے دو چار شعر یہ ہیں:۔

ہے مرا ایمان و جاں میرا میاں
مجھ کو ہے ورد زباں میرا میاں ۔

انتظاری کی نہیں طاقت مجھے
جلد آ سے میاں میرا میاں
گل ملے بلبل کو اور قمری کو سرو
میرے تئیں میرا میاں میرا میاں

ایک غزل میں معمے کی طرز میں نام بھی بتا گئے ہیں اور وہ نام "شکر میاں" ہے۔

"ذکا" (سید امتیاز خاں) سے بھی اپنی عقیدت کا بار بار اظہار کیا ہے
عقیدت ہے "ذکا" سے میرے تئیں از بسکہ اے صاحب
مجھے ورد زباں ہر رات دن یا پیر یا ہادی

ایک دوسری غزل کے مقطع میں کہتے ہیں :-
یک آن جدائی نہ ہو صاحب سے "ذکا" کو
اللہ کرے میری جو نیت ہے بر آوے

رشفیق کو ادبی تحقیق و نکات سے خاص ذوق تھا۔ توارد پر جو بحث اس نے کی ہے اور ایک غزل کے ضمن میں جو قطعہ توارد پر لکھا ہے وہ سب اس تذکرے میں موجود ہے۔ اردو کلیات میں ایک قصیدہ نظر پڑا جس کا مطلع یہ ہے :-
ساقی اس ابر مشک فام کو دیکھ
اس طرف دیکھ مے کے جام کو دیکھ

کچھ شعر لکھنے کے بعد گریز کی ہے اور الفاظ کے متحرک و ساکن

ہونے کی بحث کا ذکر کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ایک ہمعصر "مقتول" نے ان کے ایک لفظ پر اعتراض کیا تھا۔ اس کا جواب دیا ہے۔

"شفیق" نے ختم (بسکون تا) کو ختم (بہ فتح تا) لکھ دیا تھا۔ معترض کی تردید اور اپنی تائید میں یہ اشعار لکھے ہیں:

گر ختم کہوے ختم کو "صاحب"
ہے روا حرکت مقام کو دیکھ
ریختے کی زباں میں یہ غلطی
ابتدا سے ہے انتظام کو دیکھ
آبرو زلف کو زلف بولا
اور الفاظ نا تمام کو دیکھ
نقل ہے وقت مغرب اعظم شاہ
یوں کہا اپنے ایک غلام کو دیکھ
ہووے "اسواری" اس گھڑی تیار
سیر چاہے ہے جی یہ شام کو دیکھ
مولوی جیون استاد شاہ
تب کہے یوں تو اس پیام کو دیکھ
لفظ اسواری نہیں سواری ہے
کچھ تو اس صحت کلام کو دیکھ
شاہ نے تب تو یہ جواب دیا

میری طرزِ سخن بمتام کو دیکھ
یہ عبارت کہاں ہند ہی میں
اس میں جائز ہے تو نظام کو دیکھ

شفیق کی یہ رائے بالکل صحیح ہے کہ عربی کے جو لفظ عام طور پر اردو میں بہ تبدیل حرکت وغیرہ بولے جاتے ہیں اور جو زبان زد خاص و عام ہو گئے ہیں وہ اسی طرح فصیح ہیں خواہ وہ اصل لغت کے اعتبار سے غیر صحیح کیوں نہ ہوں ہر زبان کا یہ قاعدہ ہے کہ جب اس میں دوسری زبانوں کے الفاظ داخل ہوتے ہیں تو لہجے کے تغیر سے کچھ نہ کچھ تبدیلی ضرور ہو جاتی ہے۔

علاوہ غزلوں اور قصیدوں کے شفیق کا زور کلام دیکھنا ہو تو ان کی مثنوی "تصویر جاناں" دیکھنی چاہیئے جو رسالہ "تجلی" حیدرآباد دکن میں شائع ہو چکی ہے۔ اس میں بڑا زور سراپا کے بیان میں دکھایا ہے۔ اگرچہ یہ مضمون بہت پامال ہو اور ہمیشہ بھونڈا اور بے مزہ ہو کر رہ جاتا ہے اور یہی حال اس مثنوی کے سراپا کا بھی ہے، تاہم اس سے شفیق کی قادر کلامی کا اندازہ ہوتا ہے۔

اگر کوئی شفیق کے نام اور حال سے واقف نہ ہو اور اس کا کلام پڑھے تو کبھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کا لکھنے والا ہندو ہے وہ تمام بزرگان دین اسلام کا ذکر اسی ادب، احترام اور عقیدت سے کرتا ہے، جیسے کوئی سچا اور پکا مسلمان۔ اور یہ کوئی تصنع سے نہیں بلکہ درحقیقت دل سے اور عقیدت سے ہے۔ معراج کے بیان میں جو مثنوی لکھی ہے اور جو "اردو"

میں شائع ہو چکی ہے اسے دیکھئے، کوئی مسلمان اس سے بڑھ کر کیا لکھے گا اردو کلیات میں ان کے متعدد قصیدے حضرت علی کی شان میں ہیں۔ امام آخرالزماں کی منقبت میں کئی قصیدے ہیں۔ ایک قصیدہ حضرت غوث الاعظم جیلانی کی مدح میں ہے۔ ایک حضرت گیسو دراز بندہ نواز کی تعریف میں۔ علاوہ ان قصائد کے ان کے تمام کلام میں جہاں کہیں مسلمانوں کے بزرگوں اور اولیا کا ذکر آتا ہے تو وہ ان کا نام اور ذکر اس عقیدت اور ارادت سے کرتا ہے جیسے مسلمان۔ اس کے کلام میں اسلامی تلمیحات کثرت سے آتی ہیں، برخلاف اس کے ہندو دیوتاؤں وغیرہ کا ذکر شاذ ہی کہیں آیا ہو تو آیا ہو۔ یہ تعلیم، صحبت، ماحول اور اس زمانہ کے اقتضا، کا اثر تھا۔ آج کل کے لوگوں کو شاید یہ چیزیں پڑھ کر حیرت ہو، لیکن یہ اس زمانہ کی یادگاریں ہیں، جب ہندو مسلمان بھائی بھائی کی طرح رہتے سہتے تھے اور کسی کو کسی سے پرخاش نہ تھی۔ یہ خوش حالی امن و آزادی اور ترقی کی شان تھی۔ جب افلاس کا منحوس قدم آیا تو جہالت، تنگ دلی تعصب اور ناعاقبت اندیشی نے ایسا اندھا کر دیا کہ وہ اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی مارنے لگے ایک دن آئیگا کہ وہ اپنے کئے پر پچھتائیں گے اور گلے مل مل کر اپنے آنسوؤں سے اس داغ کو دھوئیں گے۔

"شفیق" نے "حسب حال زمانہ" کے عنوان سے ایک شہر آشوب بھی لکھا ہے، جس کے ابتدائی چند شعر یہ ہیں:-

ایک دن دل نے کہا مجھ سے کہ صاحب سن ادھر

کیوں ریاست دن بدن ایسی ذلیل اور ہے بتر
اس دکن کے بیچ چھ صوبوں کے چھ تھے بادشاہ
عادل اور فیاض، صاحب عزم اور صاحب ہنر
ان کی دولت میں مرفہ اور سبھی خوش حال تھے
کیا رعیت، کیا سپاہی، کیا امیر نامور
آسماں وہی ہے اور وہی زمیں خلقت ہے وو
پھر ہوئی کس واسطے یہ زندگانی مختصر
شامت نیت ہے یا تدبیر میں ہے کچھ قصور
تب تو دشواری پڑی ہے ہر کسی کو اس قدر

زمانہ کی یہہ شکایت ہر عہد میں رہی ہے اور رہیگی آسمان نے ہزاروں رنگ بدلے، دنیا نے سینکڑوں پلٹے کھائے، ۔ مگر انسان کی شکایت کم نہ ہوئی۔ بے عیب نہ کوئی کتاب ہے نہ کوئی آدمی، نہ کوئی نظام ہے اور نہ کوئی زمانہ۔ یہہ نقص کسی نہ کسی صورت میں رہتی دنیا تک رہیگا۔ بلاشبہہ انسان کے کمال کی آزمائش اسی میں ہے ۔

مُقدمہ ذکرِ میرؔ

میر تقی میرؔ اردو کے ان چند مسلم اساتذہ میں سے ہیں جن پر اردو ادب کو ہمیشہ ناز رہے گا۔ اہلِ ذوق میر صاحب کے کلام کو سر اور آنکھوں سے لگاتے ہیں اور پڑھ پڑھ کے سر دھنتے ہیں۔ جب تک یہ زبان دنیا میں قایم ہے یہ ذوق کبھی کم نہ ہو گا۔ میر صاحب خود بھی اسے سمجھتے تھے، کیا کہہ گئے ہیں:۔

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز
تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

یہ مضمون شاعرانہ تعلّی نہیں، حقیقت حال ہے جس سے کسی کو انکار نہیں

اردو ادب کے شائقین میں کون ایسا ہوگا جو اُس باکمال شاعر
کے حالات سُننے کا مشتاق نہ ہوگا، جس نے اردو شاعری کو (غزل کی
حیثیت سے) انتہائے کمال تک پہنچا دیا تھا اور جس کے بعد اُسے
پھر یہ رُتبہ کبھی نصیب نہ ہوا۔ پھر حالات خود اُس کے اپنے لکھے ہوئے،
آپ بیتی میں جو مزہ ہے وہ جگ بیتی (تاریخ) میں کہاں۔ مورّخ
ہزار بے لاگ ہو اور تحقیق و تلاش میں سر مارے، آپ بیتی کے
لکھنے والے کو نہیں پہنچ سکتا۔ بعض اوقات اس کے ایک بے ساختہ
جملے سے وہ اسرار حل ہو جاتے ہیں جو مدتوں تاریخوں کی ورق گردانی
کے بعد بھی میسر نہیں ہوتے۔ اگر ہر شخص جس نے دنیا دیکھی بھالی ہے اور
کچھ کیا بھی ہے اپنی بیتی آپ لکھ جایا کرے تو ادب کے خزانہ میں ۱۱۹ھ
یہ جواہرات انمول ہوں۔ ذکرِ میر ایسا ہی انمول موتی ہے۔

اردو میں شعرا کے تذکروں کی کچھ کمی نہیں، اور کونسا تذکرہ
ہے جس نے میر صاحب کا ذکر نہ کیا ہو اور اُن کی تعریف کے
پل نہ باندھے ہوں مگر حالات کے نام سے وہی چند باتیں ہیں جن سے
نہ دل سیر ہوتا ہے اور نہ تحقیق کی پیاس بجھتی ہے۔ بعض ان میں
سے میر صاحب کے ہم عصر اور جان پہچان والے بھی ہیں اور بعض
اُن کے معتقد بھی، لیکن وہ کلام کی تعریف کو حالات کی تحقیق پر زیادہ
ترجیح دیتے ہیں۔ اُن کے خیال سے یہ ہے بھی صحیح، آدمی فانی
ہے کلام باقی ہے۔ مگر کلام کو آدمی سے جو تعلق ہے وہ کیونکر جدا

ہو سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ میر صاحب کے متعلق بہت سی سُنی سُنائی غلط سلط روایتیں چلی آتی ہیں جن کے پرکھنے کی کوئی کسوٹی نہ تھی اب ذکرِ میر کی بدولت بہت سی باتیں جو اندھیرے میں تھیں اُجالے میں آگئیں۔

جیسا کہ اُس زمانے میں رواج تھا، میر صاحب نے یہ کتاب فارسی میں لکھی ہے۔ ان کا تذکرہ نکات الشعرا فارسی ہی میں ہے لیکن ذکرِ میر کی زبان زیادہ رنگین، شیریں اور فصیح ہے، کہیں کہیں مسجّع (موزوں و) اور مقفّی ہوگئی ہے مگر سادگی اور بے ساختہ پن اس کا اصلی حسن ہے جو شروع سے آخر تک جلوہ نما ہے۔ جگہ جگہ اپنے والد اور دوسرے بزرگوں کے قول یا اُن کی پند و موعظۃ یا گفتگو جو سراسر حقانیت اور (متصوف) اخلاق سے مملو ہے ایسی پاکیزہ زبان میں اور ایسے موثر طریقے سے بیان کی ہے کہ کتاب میں خاص لطف پیدا ہو گیا ہے۔

میر صاحب کو (جیسا کہ کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہوگا) لڑکپین ہی میں یتیمی کا داغ سہنا پڑا اور ظالم پیٹ اُنھیں وطن سے دلّی کھینچ (کھرشاہ کا د) لایا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ سلطنت مغلیہ کے اقبال کا آفتاب گہنا رہا تھا۔ اور عقل و ہمت اور اخلاق و استقلال اہلِ ملک سے رخصت ہو چکے تھے۔

دلّی اگرچہ ہندوستان کی جان اور سلطنت مغلیہ کی راجدھانی تھی مگر ہر طرف سے آفات کا نشانہ تھی۔ اس کی حالت اس عورت کی سی

بیوہ - سلطنت
شوہر - بادشاہ

تھی جو بیوہ تو نہیں پر بیواؤں سے کہیں دکھیاری ہے۔ اولوالعزم تیمور اور بابر کی اولاد اُن کے شہورِ آفاق تخت پر بے جان تصویر کی طرح دھری تھی؛ اقبال جواب دے چکا تھا، ادبار و انحطاط کے سامان ہو چکے تھے اور سیاہ رُو زوال گرد و پیش منڈلا رہا تھا؛ بادشاہ سلامت دست نگر اور امیر اُمرا منفعل اور پریشان تھے۔ سب سے اول نادر شاہ کا حملہ ہوا (۸۰ کروڑ کا نجی حملہ کیا تھا خدا کا قہر تھا۔ نادر کی بے پناہ تلوار اور اس کے سپاہیوں کی (لوٹ) ہوس ناک غارت گری نے دلی کو نوچ کھسوٹ کے ویران و برباد کر دیا تھا۔ ابھی یہ کچھ سنبھلنے ہی پائی تھی کہ چند سال بعد احمد شاہ درانی کی چڑھائی ہوئی۔ پھر مرہٹوں، جاٹوں، روہیلوں نے وہ ادھم مچائی کہ رہی سہی بات بھی جاتی رہی۔ غرض ہر طرف خود غرضی، خانہ جنگی، طوائف الملوکی اور ابتری کا منظر نظر آتا تھا۔ یہ حالات میر صاحب نے اپنی آنکھوں دیکھے اور دیکھے ہی نہیں، اُن کے چرکے سہے اور اُن انقلابات کی بدولت ناکام شاعر کی قسمت کی طرح ٹھوکریں کھاتے پھرے۔ یہ دلی کے اقبال کی شام تھی جس کی سحر اب تک طلوع نہیں ہوئی۔*

میر صاحب نے ان تباہیوں اور بربادیوں اور آپس کی خانہ جنگیوں اور خود غرضیوں کے منظر اپنی آنکھوں دیکھے، ان میں شریک رہے، ان کے زخم کھائے اور پھر انہیں اپنی آپ بیتی میں ایسے پُر درد الفاظ میں

* مقدمہ انتخاب کلام میر از مہتمم

بیان کیا ہے کہ آنکھوں کے سامنے اپنے اعمال کا نقشہ پھر جاتا ہے میر صاحب نے ان تمام واقعات اور حالات کو بڑی صحت اور خوبی سے لکھا ہے اور اُس زمانے کی تاریخ کے لئے یہ کتاب بھی ایک حیثیت رکھتی ہے بعض مقامات پر وہ مورخ کی حیثیت سے رائے بھی دیتے ہیں۔ مثلاً پانی پت کی آخری جنگ میں مرہٹوں کے طریقہ جنگ کے متعلق فرماتے ہیں "حقیقت ہر دو لشکر آنکہ اگر دکھنیاں بجنگ گریز کہ طور قدیم آنہا بود می جنگیدند، اغلب کہ غالب می گردیدند"۔ ہم اس جگہ تاریخی حالات و واقعات پر کچھ لکھنا نہیں چاہتے، جن لوگوں کو مغلیہ سلطنت کے آخری ایام کی تاریخ کا شوق ہے اُن کے لئے یہ حصہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ یہاں ہم صرف یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس کتاب سے ہمیں میر صاحب کی زندگی کے متعلق کیا کیا نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں اور کون کون سی غلط فہمیاں رفع ہوتی ہیں۔

۱۔ آبِ حیات میں نیز گلزارِ ابراہیم میں میر صاحب کے والد کا نام میر عبداللہ لکھا ہے۔ میر صاحب اس کتاب میں ہر جگہ میر علی متقی لکھتے ہیں اور کہیں ایک مقام پر بھی میر عبداللہ نہیں آیا۔ والد کی عادات خصائل، اشغال و افکار، اخلاق و اطوار کو بڑی خوبی سے لکھا ہے اور سب کچھ بے کم و کاست بیان کر دیا ہے۔ چنانچہ ان کا ذکر کرتے کرتے لکھتے ہیں "جوان صالحے عاشق پیشہ بود، دل گرمی داشت، بخطاب علی متقی امتیاز یافت"۔ اس جملے میں خطاب کے لفظ سے کچھ شبہ ہوتا ہے کہ شاید اصلی نام کچھ اور ہو۔ ساری کتاب میں کہیں اس کا اشارہ تک

نہیں کہ سوائے اس کے اُن کا کوئی اور نام بھی تھا، جہاں کہیں انھوں نے والد کا ذکر کیا ہے تو علی متقی یا درویش کے نام سے کیا ہے۔ سید امان اللہ میر صاحب کے والد کے مرید خاص تھے اور گھر بار چھوڑ کر مرشد ہی کے قدموں میں آ پڑے تھے۔ میر صاحب کے بچپن کا زمانہ انھیں کے پاس گزرا، وہ انھیں ہر جگہ عم بزرگوار لکھتے ہیں، وہ ایک درویش سے ملنے جاتے ہیں، میر صاحب بھی اُن کے ساتھ ہیں۔ درویش پوچھتا ہے کہ یہ کس کا لڑکا ہے؟ سید امان اللہ جواب دیتے ہیں "فرزند علی متقی" اس طرح باپ کے مرنے کے بعد جب پہلی بار دلّی گئے اور خواجہ محمد باسط نے انھیں نواب صمصام الدولہ امیر الامرا کے ہاں پیش کیا اور امیر الامرا نے دریافت کیا کہ یہ کس کا لڑکا ہے تو وہاں بھی یہی نام بتایا اور وہ فوراً پہچان گئے۔ اُن کے والد کا ایک پیر بھائی ایک مدت کے بعد اُن سے ملنے آتا ہے، وہ پوچھتے ہیں کہ کیسا آنا ہوا تو وہ کہتا ہے کہ پیر میرے خواب میں آئے اور فرمانے لگے "...... اللہ بچا برخوردن تو با علی متقی ضرور" غرض ان کے والد کا نام کتاب میں بارہا آیا ہے، میر صاحب کی زبان سے ہو یا کسی دوسرے کی زبان سے، لیکن ہر جگہ علی متقی ہی لکھا ہے۔ اس سے وثوق ہوتا ہے کہ یقین کا اصلی نام یہی تھا۔

۲۔ بعض لوگوں نے اُن کی سیادت میں بھی شبہ کیا ہے جس کا ذکر آب حیات میں مذکور ہے۔ آزاد نے یہ قصہ تذکرۂ شورش (غلام حسین) سے نقل کیا ہے جس نے سب سے پہلے یہ افترا باندھا ہے۔ لیکن میر صاحب نے

اس کتاب میں ہر مقام پر اپنے والد کے نام کے ساتھ "میر" کا لفظ لکھا ہے اور اپنے والد اور دوسروں کی زبانی اپنا نام بھی میر محمد تقی لکھتے ہیں۔ یہ محض غلط ہے کہ جب انھوں نے میر تخلص کیا تو اُن کے والد نے منع کیا کہ ایسا نہ کرو، ایک دن خواہ مخواہ سید ہو جاؤ گے۔ والد کی وفات کے وقت اُن کی عمر دس گیارہ سال سے زیادہ نہ تھی، اس وقت نہ شعر کہتے تھے اور نہ شعر گوئی کا خیال تھا۔ شعر کا ذوق دلی میں آکر پیدا ہوا۔ یہیں انھوں نے تحصیل علم کی، یہیں شعر کہنا سیکھا اور یہیں اُن کے کلام کو شہرت و قبولیت حاصل ہوئی اور آخر دم تک دلی ہی کو یاد کرتے رہے۔

۲۔ یہ ممکن نہیں کہ میر صاحب کا ذکر ہو اور خان آرزو (سراج الدین علی خان) کا نام نہ آئے۔ خان آرزو فارسی کے بڑے استاد اور محقق اور شاعر تھے، کبھی کبھی ریختے میں بھی کچھ کہہ لیتے تھے۔ آزاد نے لکھا ہے کہ میر صاحب پہلی بیوی سے تھے اور جب وہ مر گئیں تو اُن کے والد نے خان آرزو کی ہمشیرہ سے شادی کی۔ لیکن میر صاحب کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے بڑے بھائی خان آرزو کے حقیقی بھانجے تھے اور میر صاحب اور اُن کے چھوٹے بھائی دوسری بیوی سے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ میر علی متقی کی پہلی بیوی خان آرزو کی بہن تھیں۔ بہر حال اس میں شک نہیں کہ خان آرزو میر صاحب کے سوتیلے ماموں ہوتے ہیں۔ تمام تذکروں میں یہ لکھا ہے کہ انھوں نے باپ کے مرنے کے بعد خان آرزو ہی کی آغوش شفقت میں پرورش پائی اور انہیں کے فیض تربیت نے علمی استعداد اور

شاعر کا ذوق حاصل کیا۔ جب میر صاحب کا تذکرہ نکات الشعرا* چھپ کر شائع ہوا تو اس بیان پر تصدیق کی مہر لگ گئی۔ اس کتاب میں میر صاحب نے خان آرزو کا بڑے ادب سے ذکر کیا ہے اور اُن کے کمال اور سخن فہمی کی بیحد تعریف کی ہے اور مرزا معز (فطرت، موسوی خاں) کے حال میں انھیں "استاد و پیر و مرشد بندہ" لکھا ہے۔ ان شواہد کو دیکھتے ہوئے آزاد کا یہ قول نہایت ناگوار گزرتا ہے کہ "خانصاحب حنفی مذہب تھے میر صاحب شیعہ، اس پر نازک مزاجی غضب! غرض کسی مسئلے پر بگڑ کر الگ ہو گئے +" قیاس یہی ہوا کہ یہ بھی آزاد کا ایک چٹکلا ہے جو حسب عادت لطف داستان اور رنگینیٔ بیان کی خاطر لکھ گئے ہیں۔ لیکن جب یہ کتاب (ذکر میر) ہماری نظر سے گزری تو معلوم ہوا کہ آزاد بڑی پتے کی بات لکھ گئے ہیں۔ میر صاحب خان آرزو کے دل آزار برتاؤ اور بے مروتی کے نہایت شاکی ہیں۔ ایک تو لڑکپن اور نا تجربہ کاری، دوسرے یتیمی کا تازہ تازہ داغ، پھر غریب الوطنی اور بے روزگاری، اُس پر بے مروت بھائی اور سنگ دل ماموں کا یہ سلوک، میر صاحب کی زندگی تلخ ہو گئی غیور تو وہ بچپن ہی سے تھے، جیسا کہ خود ان کے والد ‡ نے اس کا اعتراف

---

* یہ تذکرہ انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔

+ آب حیات، تذکرۂ میر۔

‡ دیکھو صفحہ ۵۹۔

کیا ہے، اُن کے دل پر اس کا ایسا اثر ہوا کہ نوبت جنون تک پہنچ گئی۔

اب قابلِ غور یہ ہے کہ میر صاحب کے ان دو بیانات میں اس قدر تفاوت اور تضاد کیوں ہے حالانکہ نکات الشعراء بھی دلّی ہی میں لکھا گیا اور ذکرِ میر بھی وہیں شروع کی اور سوائے آخر کے کچھ اوراق کے (جس کی صراحت آگے چل کر کی جائے گی) ساری کتاب وہیں لکھی۔ بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ تذکرہ میر صاحب کے خیال میں ایک ایسی چیز تھی جو مقبول ہونے والی تھی اور چونکہ اس قسم کا یہ پہلا تذکرہ تھا (جیسا کہ میر صاحب نے خود تحریر فرمایا ہے) اس لئے یقین تھا کہ لوگ اسے شوق سے پڑھیں گے اور ہر کس و ناکس کے ہاتھ میں جائے گا انھوں نے اس ناگوار اور بدنما ذاتی اور خانگی قضیے کو چھیڑنا مصلحت نہ سمجھا اور تقاضائے غیرت نے بھی مناسب خیال کیا کہ اس پر پردہ ڈال دیا جائے، لیکن جب وہ آپ بیتی لکھنے بیٹھے تو رہا نہ گیا، ساری رام کہانی کہہ سنائی اور سچ بھی ہے وہ آپ بیتی ہی کیا جس میں بُری بھلی جو کچھ بھی گزری ہو صاف صاف نہ لکھ دی جائے اب وہ واردات قلب ہو یا حالات و واقعات اپنے ہوں یا دوسرے کے، جو کچھ آنکھوں نے دیکھا یا دل پر گزرا سب ہی لکھنا پڑتا ہے اور یہ خیال بھی نہ تھا کہ یہ کتاب کبھی دوسرے ہاتھوں میں جائیگی یا مقبول ہوگی اور حقیقت بھی یہی ہے، آج تک یہ کتاب گمنامی میں

رہی، یہ محض اتفاق ہے کہ آج اس کی اشاعت کا موقع نکل آیا ورنہ جہاں اور بہت سے جواہر پارے خاک میں مل گئے یہ بھی کیڑے مکوڑوں یا کسی عطار کی پڑیوں کی نذر ہو جاتی۔

اس کتاب سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ جو مشہور چلا آتا ہے آرزو خان صاحب میر صاحب کے استاد تھے صحیح نہیں ہے۔ ہاں وہ اتنی بات کے قصوروار ضرور ہیں کہ دوبارہ جب دلی آئے تو ماموں ہی کے ہاں آ کے ٹھیرے، چنانچہ فرماتے ہیں "بعضے چندے پیش او ماندم و کتابے چند از یاران شہر خواندم"، اس کے بعد انھوں نے اپنی تعلیم کا حال لکھا ہے کہ کیونکر اتفاق سے راستے میں میر جعفر سے مٹھ بھیڑ ہوئی اور ان سے فارسی پڑھنی شروع کی، اتفاق سے جب وہ اپنے وطن پٹنے چلے گئے تو میر سعادت علی سے جو امروہے کے باشندے تھے، ملاقات ہوئی، انھوں نے میر صاحب کو ریختے میں شعر موزوں کرنے کی ترغیب دی اور اس وقت سے ان کی شعر گوئی کی بنیاد پڑی میر صاحب نے بھی ایسی جان توڑ کے محنت کی اور وہ مشق بہم پہنچائی کہ تھوڑے ہی عرصے میں اُن کی شہرت سارے شہر میں پھیل گئی حقیقت یہ ہے کہ وہ کسی کے شاگرد نہ تھے بلکہ شاعر پیدا ہوئے تھے۔

۴۔ میر صاحب کے لکھنؤ پہنچنے کا حال بھی عجیب ڈھنگ سے بیان کیا گیا ہے اور آزاد نے نمک مرچ لگا کر اسے ایک افسانہ بنا دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آزاد کے سحر نگار قلم نے اس وقت اور

موقع کی اور میر صاحب کی قطع وضع اور ان کی بے کسی اور استغنا
کی ایسی سچی تصویر کھینچی ہے کہ ڈراما کا لطف آجاتا ہے اور آنکھوں
کے سامنے عبرت کا نقشہ پھر جاتا ہے۔ لیکن لکھنؤ پہنچ کر سرائے
میں اترنا، مشاعرے میں جانا، اُن کی پرانی وضع پر اہلِ مشاعرہ
کا ہنسنا اور شمع سامنے آنے پر غزل میں حسبِ حال فی البدیہ اشعار کا
پڑھنا حقیقت سے بعید ہے۔ یہ صحیح ہے کہ دلی اُجڑ گئی تھی، قدردان
اُٹھ گئے تھے، اہلِ کمال کس مپرسی کی حالت میں تھے اور اُن کا ٹھکانا
صرف ایک ہی رہ گیا تھا یعنی لکھنؤ کا نوابی دربار جو اس وقت بہار
پر تھا زمانے کے ہاتھوں تنگ آکر ہر باکمال قدردانی کا بھوکا اپنے
عزیز وطن سے منہ موڑ کر وہیں جا پہنچا تھا۔ میر صاحب اگرچہ دلی میں
تنگ حال اور شکستہ دل تھے مگر بڑے غیور تھے۔ وہ بعض اور لوگوں
کی طرح دوسروں پر بار ہونا یا احتیاج لے کر پہنچنا اپنی وضع کے خلاف
سمجھتے تھے۔ جس طرح شجاع الدولہ نے ازراہِ قدردانی مرزا سودا کو
دلی سے بلا بھیجا تھا اسی طرح آصف الدولہ نے نواب سالار جنگ
کے ذریعے زادِ راہ بھیج کر میر صاحب کو لکھنؤ بلایا۔ لکھنؤ پہنچ کر نواب
سالار جنگ کے ہاں گئے جو اُن کے حال پر پہلے ہی سے مہربان تھے،
انھوں نے فوراً بندگانِ عالی کی خدمت میں اطلاع کی۔ چار پانچ آصف الدولہ
روز بعد بندگانِ عالی مرغوں کی لڑائی کے لئے تشریف لائے۔
میر صاحب بھی وہاں تھے۔ محض فراست سے سمجھ گئے کہ میر صاحب ہیں،

دلی کے وزیر کو بندگانِ عالی کہتے تھے۔

نہایت لطف و عنایت سے بغل گیر ہوئے اور اپنے ساتھ نشست
کے مقام پر لے گئے۔ اپنے شعر میر صاحب کو مخاطب کرکے سنائے
اور پھر میر صاحب سے کلام سننے کی فرمائش کی مگر میر صاحب نے اپنی
غزل کے صرف دو چار ہی شعر سنائے اس سے ظاہر ہے کہ میر صاحب
فقیروں کی طرح لکھنؤ نہیں گئے جیسا کہ آزاد نے بیان کیا ہے بلکہ
عزت سے بلائے گئے اور آخر دم تک اسی عزت سے رہے۔

۵۔ میر صاحب کی بد دماغی اور نازک مزاجی کو بڑے مبالغے
سے بیان کیا گیا ہے، لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ نازک
مزاج ضرور تھے۔ اس کا راز اُن کی ابتدائی تربیت اور پرورش
اور بعد کے حالات میں ہے۔ میر صاحب کے والد بڑے پائے کے
درویش تھے، لوگ اُن کے قدم لیتے اور ہاتھ چومتے تھے، بڑے
بڑے لوگ ان کے ملنے کی تمنا کرتے تھے۔ ایسے حالات میں
درویش دماغ دار نہ ہو تو ممکن ہے، لیکن صاحبزادے کے دماغ
کا کیا پوچھنا وہ تو آسمان ہی پر ہوتا ہے۔ سید امان اللہ جو اُن کے
والد کے مرید خاص تھے، میر صاحب انھیں چچا کہتے تھے۔ سید صاحب
نے انھیں بڑے چاؤ چوچلے سے پالا۔ یہ شب و روز انھیں کے پاس
رہتے، انھیں کے ساتھ کھاتے، انھیں کے ساتھ سوتے، جب
کبھی کسی درویش سے ملنے جاتے تو میر صاحب کو ساتھ لیتے جاتے
اور یہ ان کی ملاقاتوں اور صحبتوں میں حاضر رہتے۔ اُن کے والد

کی خدمت میں بھی اکثر درویش اور صوفی حاضر ہوتے، یہ چپکے چپکے سب کچھ دیکھتے اور سنتے رہتے تھے۔ انھوں نے اس کتاب میں جو اپنے والد کی ملفقین اور دوسرے درویشوں کی باتیں اور اقوال لکھے ہیں وہ سراسر درویشی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ یہیں سے اُن میں غیرت، استغناء قناعت اور بے نیازی کی شان پیدا ہونے لگی تھی ابھی دس گیارہ ہی برس کی عمر تھی کہ دُھری یتیمی دیکھنی پڑی، ایک تو چچا جو باپ سے زیادہ ناز بردار تھا داغ مفارقت دے گیا، دوسرے اُسی سال باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ پھر عزیز و اقارب کی طوطا چشمی خصوصاً بھائی کی بے مروتی اور ماموں کی بدسلوکی اور دل آزاری، اس پر بے سروسامانی اور پریشانی، ان سب پر مزید ملک وحکومت کی ناگفتہ بہ حالت جہاں آئے دن نئے نئے انقلابات اور دلخراش واقعات، خانہ جنگیاں بربادیاں برپا رہتی تھیں۔ ان سب نے اُن کے دل پر ایسے چرکے دیئے کہ تن بدن کا ایک ایک تار بلبلا اُٹھا۔ اسی نے اُن کے کلام میں فصاحت کے ساتھ وہ سوز و گداز اور درد پیدا کر دیا جو اُن کے بعد آج تک کسی کو نصیب نہیں ہوا۔

آزاد نے خان آرزو سے ناچاقی کی وجہ میر صاحب کی نازک مزاجی ہی قرار دی ہے اگرچہ اس کے تسلیم کرنے میں کسی قدر تامل ہوتا ہے تاہم دو ایک واقعات ایسے موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نازک مزاج ضرور تھے۔ مثلاً سادات خاں ذوالفقار جنگ بخشی کے ہاں ملازم

ہیں۔ ایک روز خان موصوف شب ماہ میں مہتابی پر بیٹھے تھے اور قوال کا لڑکا ان کے سامنے بیٹھا کچھ گا رہا تھا، اتنے میں میر صاحب پہنچے، خان نے کہا میر صاحب اسے اپنے ریختے کے دو چار شعر بتا دیجئے تو یہ اپنے طور پر درست کر کے گالے گا۔ میر صاحب نے کسی قدر ترش ہو کر کہا کہ مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا، تو اس نے اپنے سر کی قسم دی اور خوشامد کی تو میر صاحب نے چار و ناچار چند شعر اُسے یاد کرا دیئے لیکن یہ بات انھیں ایسی ناگوار گزری کہ اس کے بعد سے خان صاحب کے ہاں جانا چھوڑ دیا اور خانہ نشین ہو گئے، خان موصوف نے بہت منت سماجت کی مگر انھوں نے ایک نہ سنی۔ مگر اس شخص کی مروت کو دیکھئے کہ اُس نے اِس کا کچھ خیال نہ کیا اور محض میر صاحب کی خاطر سے اُن کے بھائی میر محمد رضی کو اپنے پاس سے گھوڑا دے کر نوکر رکھ لیا۔ راجہ جگل کشور جو محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں وکیل بنگالہ تھے اور بڑے امیر آدمی تھے، شوق اور قدر دانی سے میر صاحب کو گھر سے اٹھا کر اپنے ہاں لے جاتے ہیں اور اپنے شعر اصلاح کے لئے پیش کرتے ہیں مگر میر صاحب اُس کے کلام کو قابل اصلاح نہیں سمجھتے اور سب پر خط کھینچ دیتے ہیں۔ راجہ ناگر مل جو میر صاحب کا بڑا قدر دان تھا، اس کی رفاقت محض اس وجہ سے چھوڑ دی کہ جو معاہدہ وہ اُس کے ایما سے بادشاہی امرا سے کر کے آئے تھے اُس پر اُس نے عمل نہ کیا۔ بادشاہ بڑے اشتیاق سے بار بار بلاتے ہیں مگر یہ نہیں جاتے غرض میر صاحب کو اپنی وضع کا بڑا پاس تھا اور ابتدائی تربیت اور فقر و فاقے نے وضعداری کے ساتھ

بر دوا اول ابن نار آ تھا۔

نازک مزاجی بھی پیدا کر دی تھی۔

۹- اس کتاب میں بعض مقامات ایسے آتے ہیں کہ ان کے پڑھنے کے بعد انکی بعض نظموں کی اصل حقیقت معلوم ہوتی ہے اور لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ مثلاً جب اُن کے سوتیلے ماموں خان آرزو نے اپنے بھانجے (میر صاحب کے بڑے بھائی) کے اشتعال سے انھیں طرح طرح سے ستانا شروع کیا اور ان کی خصومت اور دل آزاری اور بدسلوکی حد سے بڑھ گئی تو اس بے کسی اور بے نوائی کے عالم میں اُن کے قلب پر اس کا بڑا صدمہ ہوا اور بہت ہی دل شکستہ اور دل گرفتہ رہنے لگے اس غم و غصے کی حالت میں ان پر ایک جنون کی سی حالت طاری ہو گئی اور راتیں چاند میں ایک عجیب صورت نظر آنے لگی، اس وہم کے ساتھ وحشت و دیوانگی بڑھنے لگی اور حالت نازک ہو گئی۔ اس تمام کیفیت کو میر صاحب نے بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ اس کے بعد آپ اُن کی مثنوی "خواب و خیال" پڑھیئے تو اس واردات کی سچی تصویر اور اس خواب کی پوری تعبیر نظر آتی ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض خواب و خیال نہیں بلکہ ایک واقعہ تھا جو اُن کے مایوس اور حزیں دل پر گزرا تھا۔

اس مثنوی کے شروع میں اپنی پریشان حالی کا ذکر کیا ہے کہ ہوش سنبھالتے ہی اپنے بیگانے ہو گئے، یاروں نے بے وفائی کی۔ اور عزیز و اقربا نے بے مروتی۔ ناچار وطن چھوڑنا پڑا اور یہ پہلا وقت تھا جو گھر سے قدم باہر نکالا۔

چلا اکبر آباد سے جس گھڑی — در و بام پر چشم حسرت پڑی
کہ ترک وطن پہلے کیونکر کروں — مگر ہر قدم دل کو پتھر کروں

اب دلی پہنچتے ہیں۔

پس از قطع رہ لائے دلی میں بخت — بہت کھینچے یاں میں نے آزار سخت
جگر جور گردوں سے خوں ہو گیا — مجھے رکتے رکتے جنوں ہو گیا

اب اس کے بعد سے جنون کی کیفیت بیان کی جو عجیب و غریب ہے۔

میر صاحب کو دو بار کاماں جانا پڑا اور دونوں بار پریشان حالی ان کے ہم رکاب تھی۔ پہلی بار، جب دیکھا شہر کی حالت رہنے کے قابل نہیں رہی تو راجہ (ناگرمل) سے اجازت چاہی کہ شہر چھوڑ کر کسی دوسری جگہ چلا جاتا ہوں، یہاں رہنے کی تاب نہیں۔ راجہ نے اپنی عنایت سے اجازت دی۔ میر صاحب توکل علی اللہ لواحقین کے ساتھ چل کھڑے ہوئے اور یہ بزار پریشانی کاماں پہنچے۔ یہ ذی الحجہ کی آخری تاریخ تھی۔ عشرہ وہیں بسر کیا اور عاشورے کے روز وہاں سے آگے چلے۔ دوسری بار جب راجہ جاٹوں کے ہاتھوں سے تنگ آ کر اپنے تمام متوسلین کے ساتھ قلعے سے نکل کر کوچ کرتے ہوئے کاماں پہنچتے ہیں تو میر صاحب بھی بہ سبب ملازمت اس قافلے کے ساتھ ہیں۔ یہ عالم بھی پریشانی کا تھا اور غالباً اسی حالت میں انھوں نے ایک مخمس لکھا ہے۔ زمانے کی شکایت میں فرماتے ہیں:

کاما سے تلخ کام اٹھایا مرے تئیں
دلّی میں بیدلانہ پھرایا مرے تئیں
ہم چشموں کی نظر سے گرایا مرے تئیں
حاصل کہ پیس سرمہ بنایا مرے تئیں
میں مشت خاک مجھ سے اسے اس قدر غبار

تلاش معاش میں جگہ جگہ مارے مارے پھرنے کے متعلق کئی بند لکھے ہیں، ایک یہ ہے۔

جاتا جہاں نہ تھا مجھے سو بار واں گیا
ضعف قویٰ سے دست بدیوار واں گیا
محتاج ہو کے تاں کا طلب گار داں گیا
چارہ نہ دیکھا مضطر و ناچار واں گیا
اس جان ناتواں پہ کیا صبر اختیار

آگے چل کے کہتے ہیں۔

حاجت مری روا دلِ پر درد نے نہ کی
تاثیر اشکِ سرخ ورخ زرد نے نہ کی
تدبیر ایک دم بھی دم سرد نے نہ کی
دل جوئی میری حیف کسی فرد نے نہ کی
طاقت رہی نہ دل میں، گیا جان سے قرار

اور بند تو دو آخر کے ہیں جو میر صاحب کی حالت اور مزاج کا سچا نقشہ ہیں۔

دل سر بسر خراب ہے تعمیر کیا کروں
آشفتگیٔ حال کی تعبیر کیا کروں
خونا بہائے چشم کی تعزیر کیا کروں
زردیٔ رنگ چہرہ کی تحریر کیا کروں
آیا جو میں چمن میں خزاں ہو گئی بہار

حالت تو یہ کہ مجکو غموں سے نہیں فراغ
دل سوزش درونی سے جلتا ہے جوں چراغ
سینہ تمام چاک ہے سارا جگر ہے داغ
ہے نام مجلسوں میں مرا میر بے دماغ
از بسکہ بے دماغی نے پایا ہے اشتہار

اسی طرح شہر آشوب اور مستزاد (جو دلی کے حال پر لکھی ہے) اور خاص کر جو نظم دنیا کے نام سے ہے اُن کا لطف اس کتاب کے پڑھنے کے بعد آتا ہے۔ آخری نظم (دنیا) کے پڑھنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا اس کتاب کے آخری صفحے کے لفظ لفظ کو نظم کر دیا ہے۔ غرض میر صاحب کے کلام کے سمجھنے اور لطف حاصل کرنے میں بھی اس کتاب سے بہت کچھ رہنمائی ہوتی ہے۔

۷۔ ذکر میر میں جہاں اُس زمانے کی معاشرت اور حکومت کے بہت سے واقعات ملتے ہیں وہاں ایک یہ بات بھی صاف نظر آتی ہے کہ اُس زمانے میں ہندو مسلمان کی کوئی بحث ہی نہ تھی۔ اس سے بڑھ کر بُرا کونسا زمانہ ہوگا جب کہ ملک میں ہر طرف خود غرضی، خانہ جنگی، لوٹ مار کی وبا پھیلی ہوئی تھی اور زوال اور انحطاط کا انتہائی وقت آگیا تھا، تاہم ہندو مسلمانوں کے تعلقات آپس میں ایسے تھے جیسے بھائیوں بھائیوں میں ہوتے ہیں۔ وہ لڑتے بھی تھے، ملتے بھی تھے، مگر اس دوستی محبت اور لڑائی بھڑائی میں مذہب و ملت کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ یہ آفت اس زمانے کی لائی ہوئی ہے جس میں بدبختی سے دونوں مبتلا ہیں یا اس کا انجام سمجھے ہوئے ہیں مگر اپنے وہم کے ہاتھوں لاچار ہیں۔ خود میر صاحب کئی راجاؤں کے متوسل رہے، اُن کی مروت اور انسانیت کا ذکر کس محبت اور عزت سے کرتے ہیں۔ راجہ ناگرمل کی شرافت اور وضعداری دیکھیے۔ جاٹوں کی چیرہ دستی اور مردم آزاری سے آزردہ ہو کر دلیرانہ قلعہ

چھوڑ باہر نکل کر جاتے ہیں تو اپنے ساتھ بیس ہزار گھروں کو جو انھیں کی وجہ سے آباد تھے اور اکثر ان کے متوسل تھے اور جن میں ہندو مسلمان سب ہی تھے ساتھ لیکر جاتے ہیں۔ یہ وقت خطرے سے خالی نہ تھا، میر صاحب لکھتے ہیں "راجہ نظر بر خدا کردہ آنچہ لازمۂ سرداریست بکار بردہ باہر دو پسر بجراءت تمام سوار شد و بیرون قلعہ آمد چناں ہمت بامداد غربا گماشت کہ ناموس نفرے ہم آنجا نگذاشتند از لطف داداریے ہمال و بہ یمن نیت خوب در دو سہ روز مع این قافلہ گراں داخل کاما گشت"۔ اگرچہ ملک کی حالت بہت خراب وخستہ اور ابتر تھی، عام وخاص، نواب اور راجہ سب خود غرضی میں مبتلا اور ناعاقبت اندیشی میں گرفتار تھے، مگر پرانی وضعداریاں برابر چلی جا رہی تھیں۔ بزم ہو یا رزم، غم ہو یا شادی، معاملات ہوں یا مطائبات ان میں وہ تنگ دلی اور تعصب نہ تھا جس کا جلوہ ہمیں آج کل نظر آ رہا ہے۔ بداخلاقی ان میں بھی تھی، بدمعاملگی اس وقت بھی تھی، غداری اور بے وفائی سے وہ زمانہ بھی خالی نہ تھا، مگر وہ عیب جسے مذہبی تعصب کہتے ہیں، اس سے ان کے سینے پاک تھے۔

۱۸۔ میر صاحب بڑے مہذب اور باوضع شخص ہیں وہ کہیں مذہب کا ذکر یا بحث نہیں کرتے، تاہم ضمناً بعض واقعات سے ان کے مذہب در خفر کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ اپنے والد کے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں "روزے در خدمت شیخ سوال کرد کہ بندہ آنچہ عقائد خود درست کردہ ام بخدمت عالی واضح است، امّا در حق حاکم شام چہ فرمایند"۔ شیخ نے

فرمایا "کہونگا"۔ کچھ مدت کے بعد مُنہ اندھیرے محرم خاں خواجہ سرائے شاہجہانی کی مسجد تشریف لائے میرے والد کے نوکر وضو کے لئے پانی لانے کو دَوڑے، والد خود اٹھے اور آفتابہ لے کر ہاتھ منہ دھلانے لگے۔ فرمانے لگے "اے علی متقی میں عمر بھر کبھی اُس کا نام زبان پر نہیں لایا ہوں، اس کا شکر کس زبان سے ادا کروں"۔ والد کہتے تھے کہ اس کے بعد سے میں نے بھی اُس کا نام کبھی نہیں لیا۔

سبحان اللہ، کس خوبی اور حکمت سے تلقین کی ہے یہ بزرگ شاہ کلیم اللہ اکبرآبادی، میر علی متقی کے پیر و مرشد تھے اور میر علی متقی کا شیخ سے یہ کہنا کہ "میں نے جیسا کہ آپ پر ظاہر ہے، اپنے عقائد درست کر لئے ہیں" شیخ کے اثر کو ظاہر کرتا ہے۔ میر صاحب بھی آخر اُسی باپ کے بیٹے تھے، ابتدا سے درویشوں میں تربیت پائی، خود درویش منش واقع ہوئے تھے، اسی لئے اُن کا مشرب وسیع اور دل صاف تھا۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ جب میر صاحب سادات خاں ذوالفقار جنگ کے پاس تھے تو ایک لڑائی میں وہ بھی ساتھ تھے، لڑائی قصبہ سامر کے پاس ہوئی جو اجمیر سے بیس کوس ہے۔ غرض ملہار راؤ کے بیچ میں پڑنے سے لڑائی موقوف ہوئی اور صلح صفائی ہوگئی۔ میر صاحب نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور حضرت خواجہ معین الدین اجمیری کی زیارت کے لئے اجمیر جا پہنچے۔ اس ماجرے کو ان چند الفاظ میں بیان کرتے ہیں، "من پس از صلح برائے حصول سعادت زیارت درگاہ فلک اشتباہ خواجہ بزرگ رفتم"۔

۹- میر صاحب کی وفات کا سال تو صحیح صحیح معلوم ہے، ۱۲۲۵ھ (۱۸۱۰ء) میں انتقال ہوا، ناسخ نے تاریخ کہی ہے "واویلا مردِ شہ شاعراں" لیکن پیدائش کا سال معلوم نہ ہونے سے اُن کی عمر کے متعلق بہت اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔ آزاد لکھتے ہیں کہ سو برس کی عمر پائی۔ مصحفی اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں "عمرش تخمیناً قریب بہ ہشتاد است"۔ تذکرے کی تالیف کا سنہ ۱۲۰۹ھ ہے۔ اس حساب سے تقریباً ۹۶ سال ہوتے ہیں۔ جہاںؔ نے اُن کی عمر ۸۰ ہی برس لکھی ہے۔ اگرچہ میر صاحب نے اس کتاب میں اپنی پیدائش کا سنہ نہیں لکھا تاہم بعض حالات اور قرائن ایسے موجود ہیں جن سے اُن کی عمر اور پیدائش کا تخمینی سنہ معلوم ہو سکتا ہے۔

جب سید امان اللہ کا (جنھیں میر صاحب عم بزرگوار کر کے لکھتے ہیں) انتقال ہوا اور رنج و غم سے اُن کی حالت بہت نڈھال ہوئی تو ان کے والد ان کو سمجھانے لگے، اس میں ایک فقرہ بھی فرمایا "کہ ما من! نہ طفل ہائے، الحمد اللہ کہ دہ سالۂ" اور اسی سال میر علی متقی کا بھی انتقال ہو گیا۔ گویا باپ کی وفات کے بعد اُن کی عمر دس سال کی تھی یا زیادہ سے زیادہ گیارہ سال کی ہو گی۔ باپ کے مر جانے سے اس چھوٹی سی عمر میں فکر معاش ہوئی جس کی تلاش میں وہ اکبر آباد کے آس پاس بہت کچھ پھرے۔ جب مایوس ہوئے تو شاہجہاں آباد کا قصد کیا۔ نواب صمصام الدولہ امیر الامرا نے اُن کے باپ کے حقوق کا خیال کر کے میر صاحب کا ایک روپیہ روز مقرر کر دیا اور یہ روزینہ نادر شاہ کے حملے تک ملتا رہا۔

اس جنگ میں نواب صاحب کے مارے جانے سے بند ہو گیا۔ نادر کا حملہ
۱۱۵۱ھ میں ہوا۔ اس کتاب کے اختتام پر میر صاحب نے اپنی عمر ساٹھ
سال بتائی ہے اور کتاب کی تاریخ اس قطعہ سے نکالی ہے۔

مسمی باسمی شد اے پاسنہ   کہ این نسخہ گردد بہ عالم سمر
ز تاریخ آگہ شوی بیگمان   فزای عدد بست و ہفت از برا

کتاب کا نام "ذکر میر" ہے جس کے عدد ۱۱۷۰ ہوتے ہیں، اس میں ۲۷
ملائے تو ۱۱۹۷ھ ہوئے۔ اس میں سے اگر ساٹھ گھٹا کیے تو ان کی پیدائش
کا سال تقریباً ۱۱۳۷ھ نکلتا ہے۔ اس حساب سے نادر کے حملے کے وقت
ان کی عمر کوئی پندرہ سال کی سمجھنی چاہیے۔ اس حادثے کے بعد وہ پھر
دہلی جاتے ہیں اور چند روز اپنے ماموں خان آرزو کے مہمان ہوتے
ہیں۔ ایک مدت کے بعد جب راجہ ناگرمل کے ہمراہ اکبرآباد جانے کا
اتفاق ہوتا ہے تو لکھتے ہیں کہ تیس سال بعد وطن میں آنا ہوا۔ یعنی
اس وقت ان کی عمر ۴۵، ۴۶ برس کی ہوگی۔

آب حیات میں لکھا ہے کہ میر صاحب نے دلی ۱۱۹۰ھ میں چھوڑی
لیکن گلشن ہند (اور گلزار ابراہیم) میں ان کے لکھنؤ جانے کی تاریخ
۱۱۹۷ھ لکھی ہے اور لکھا ہے کہ اس وقت مرزا محمد رفیع سودا اس
جہان فانی سے عالم باقی کو سدھار چکے تھے۔ سودا کا انتقال ۱۱۹۵ھ
میں ہوا۔ میر حسن اپنے تذکرے میں میر صاحب کا حال لکھتے ہوئے کہتے
ہیں کہ اس وقت وہ دلی ہی میں ہیں، حسن کے تذکرہ کا سنہ تالیف ۱۱۹۴ھ ہے

غرض لطف ہی کا قول صحیح معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب لکھنؤ ۱۱۹۷ھ میں پہنچے۔ اس حساب سے میر صاحب کے لکھنؤ پہنچنے اور ذکر میر کے ختم ہونے کا ایک ہی سال ہوتا ہے اور اس وقت ان کی عمر ساٹھ تھی۔ اب اگر سنہ پیدائش ۱۱۳۷ھ اور سنہ وفات ۱۲۲۵ھ ہو تو میر صاحب کی عمر تقریباً ۸۹ برس ہوتی ہے، بہر حال ۹۰ سے زائد کسی حال میں نہیں اور میری رائے میں یہی صحیح بھی ہے۔

۱۰۔ ذکر میر ایک نادر الوجود کتاب ہے۔ ہماری زبان میں ایک نہیں بیسیوں تذکرے شعرا کے لکھے گئے ہیں اور ابھی تک یہ سلسلہ جاری ہے مگر کسی تذکرے میں اس کتاب کا نام نہیں۔ آزاد نے بہت تفصیل سے میر صاحب کے کلام اور تصنیفات کی فہرست دی ہے مگر ذکر میر کا ذکر اس میں بھی نہیں۔ سوائے ڈاکٹر سپرنگر کے کہ اس نے اپنی فہرست میں ذکر کیا ہے اور کہیں اس کا پتہ نہیں۔ یہ محض اتفاق ہے کہ یہ کتاب خان بہادر مولوی بشیر الدین احمد صاحب بانیٔ مسلم ہائی اسکول اٹاوہ کے ہاتھ لگ گئی اور ان کی عنایت سے ہمیں دیکھنی نصیب ہوئی اور اس کے شائع کرنے کا موقع ملا۔ میں مولوی صاحب کے اس لطف و کرم کا بیحد ممنون ہوں۔ یہ نسخہ بہت صاف اور اچھا لکھا ہوا ہے۔ کتابت ۱۲۲۲ھ (۱۸۰۸ء) کی ہے یعنے میر صاحب کی زندگی ہی میں لکھا گیا اور کیا تعجب ہے کہ انھیں کے نسخے کی نقل ہو۔ کہیں کہیں مشکل الفاظ اور محاورات کے معنے بھی دیئے ہیں جو ہم نے

بجنسہ چھاپ دیئے ہیں البتہ مضامین کے عنوان اس میں نہیں تھے وہ ہم نے اضافہ کیے ہیں۔ جب پروفیسر محمد شفیع ایم۔ اے۔ وائس پرنسپل اورینٹل کالج لاہور کو جو علم و ادب کا خاص ذوق رکھتے ہیں یہ معلوم ہوا کہ میرا ارادہ اس کتاب کے شائع کرنے کا ہے تو انھوں نے مجھے فوراً لکھا کہ ایک نسخہ اس کا میرے پاس بھی ہے۔ کہو تو بھیج دوں، چنانچہ انھوں نے میرے لکھنے پر اپنا نسخہ مجھے مستعار عنایت فرمایا جس کا میں بہت شکرگزار ہوں۔ میں نے کتاب کا چھپنا روک دیا اور اٹاوے کے نسخے سے مقابلہ کرنا شروع کیا اس سے بعض بعض جگہ بہت مدد ملی۔ پروفیسر صاحب کا نسخہ ایسا اچھا لکھا ہوا نہیں ہے جیسا اٹاوے کا ہے اور ناقص بھی ہے یعنی ایک چوتھائی سے زائد کم ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آخری حصہ میر صاحب نے بعد میں بڑھایا ہے، چنانچہ لکھنؤ جانے کا حال لاہور کے نسخے میں مطلق نہیں۔ جہاں کہیں ان دو نسخوں کی عبارت میں اختلاف تھا۔ اس اختلاف کو ہم نے حاشیے میں (ن) کا نشان کر کے لکھ دیا ہے، کتاب کے آخر میں میر صاحب نے کچھ لطیفے بھی جمع کر دیئے ہیں بعض پرانے اور تاریخی ہیں اور بعض خود کے زمانہ کے ہیں اور پُر لطف ہیں۔ مگر افسوس کہ بعض اُن میں سے ایسے فحش ہیں کہ اُن کا لکھنا یا بیان کرنا ممکن نہیں، اس سے اُس زمانے کا ذوق معلوم ہوتا ہے ورنہ میر صاحب کی تہذیب اور متانت کا کیا کہنا ہے! اس وجہ سے نیز اس لیے کہ یہ ایک غیر متعلق چیز تھی ہم نے یہ لطیفے اس کتاب سے خارج کر دیئے ہیں

مقدمہ تمدّن ہند

مترجم کا مختصر تذکرہ

شمس العلما ڈاکٹر مولوی سید علی بلگرامی مرحوم ہندوستان کے عہد جدید کے ان نامور علما میں سے ہیں جنھوں نے علوم والسنہ مشرقیہ و مغربیہ میں کمال پیدا کر کے ہند کے تمدن علمی ترقی اور روشن خیالی میں ایک نئی شان پیدا کی ہے۔ یہ لوگ بہ تحقیق جدید تعلیم کے رہبر و رہنما ہیں اور انکے متعلق وہ شکایت پیدا نہیں ہوئی تھی جو اسوقت انگریزی تعلیم یافتہ اصحاب کے متعلق عام طور پر پائی جاتی ہے کہ وہ اپنے قدیم علوم و تہذیب سے بے بہرہ رہ جاتے ہیں جس سے حمیت قومی میں ضعف پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اس شکایت کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کی توجہ اس نقص کی طرف جلد مبذول ہو گئی اور اسکی اصلاح کی ہر طرف کوشش کی جا رہی ہے۔

مرحوم بلگرام کے ایک نہایت شریف و نجیب خاندان سے تھے اور یہ خاندان مسلمانوں کے ان معدودے چند خاندانوں سے ہے جنھوں نے ایسے زمانہ میں جبکہ

ہند میں مختلف قوتیں کام کر رہی تھیں اور باہمی کشمکش سے ملک میں بے اطمینانی تھی زمانے کا رخ پہچاننا اور عاقبت اندیشی اور دور بینی سے کام لے کر اُدھر کو چلے جدھر زمانہ جا رہا تھا اور جہاں آخر سب کو جھکنا پڑا۔

اُنکے آبا و اجداد شہر واسط سے جو عراق عرب میں بغداد و بصرہ کے درمیان واقع ہے چھٹی صدی میں ہندوستان آئے۔ اور اودھ میں مقیم ہوئے۔ انکے جدامجد مولوی سید کرامت حسین خان بہادر والسرائے کے دربار میں شاہ اودھ کی طرف سے قائمقام تھے۔ بعد الحاق انکے دالدا اور چچا دونوں انگریزوں کی ملازمت میں اعلیٰ اور معتبر خدمات پر سرفراز رہے۔

انکے چچا سید اعظم الدین حسین خاں لارڈ ولیم بنٹنگ کے مصاحب (اے ڈی سی) اور اوریئنٹل انٹرپریٹر (ترجمان السنہ مشرقیہ) تھے اور بعد میں سندھ میں پولٹیکل ایجنٹ مقرر ہوئے اور دریائے سندھ کی نگرانی بھی انھیں تحویل کی گئی۔ یہ ایسی باوقعت اور اہم خدمت تھی کہ سوائے انگریز کے کسی دوسرے کو ملنی محال تھی لیکن چونکہ امیران سندھ اپنے ہاں انگریز کا آنا پسند نہیں کرتے تھے اس لئے یہ اعظم الدین خان کا انتخاب کیا گیا جس سے اُنکی وقعت اور قابلیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ آنریبل نواب عماد الملک بہادر (مولوی سید حسین بلگرامی) برسبیل تذکرہ فرماتے تھے کہ جب اہل سندھ کو یہ معلوم ہوا کہ یہ سید ہیں تو انکے بنگلے پر جو دریا کے کنارے تھا لوگوں کا ہجوم رہتا تھا اور بوجہ خوش اعتقادی بے انتہا حرمت و توقیر کرتے تھے اور بیماروں کے لیے تعویذ مانگتے تھے۔ چنانچہ انکا قاعدہ تھا کہ فرصت کے بعد عربی کے اشعار یا قرآن کی آیات جو اسوقت یاد آتیں کاغذ کے پرچوں پر لکھ لکھ کر ٹوکرے میں ڈالتے جاتے تھے اور دوسرے روز لوگوں کو تقسیم کر دیتے

تھے اور ان میں سے اکثر اچھے بھی ہو جاتے تھے۔ انگریزی خوب جانتے تھے لیکن جب تک وہاں رہے کسی کے سامنے انگریزی کتاب نہ پڑھی تاکہ لوگ بدگمان نہو جائیں۔ مگر بدگمانی سے نہ بچ سکے۔ چونکہ بہت وجیہ گورے چٹے تھے لوگوں میں مشہور ہو گیا کہ در اصل یہ انگریز ہے لیکن مسلمان بنا ہوا ہے اسلئے وہاں عام طور پر بھی پیدا ہوگئی یہاں تک کہ جان سے مار ڈالنے کی سازش کی گئی۔ انھیں بھی اسکی اطلاع ہوگئی اور راتوں رات جہاز میں بیٹھ کر وہاں سے بھاگ گئے۔ دو بار بنگال لیجس لیٹیو کونسل کے ممبر منتخب ہوئے بہار میں ڈپٹی کلکٹر اور سٹلمنٹ افسر (افسر بندوبست) رہے۔ دیسی طبقہ میں سی۔ ایس آئی کے پہلے گروہ میں سے تھے۔ غدر کے زمانے میں انہوں نے آرہ ہاؤس کے بچانے میں کنور سنگھ کا بڑی بہادری سے مقابلہ کیا اور مشہور آرہ گاریسن ہاؤس کے ہیرو سمجھے جاتے ہیں۔

مرحوم کے والد سید زین الدین خاں بنگال اور بہار کے مختلف اضلاع میں ڈپٹی کلکٹری اور ڈپٹی مجسٹریٹی کے عہدہ پر مامور رہے اور ۱۸۴۵ء سے ۱۸۷۵ء تک اپنی خدمات کے فرائض کو حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیا۔ اور پنشن پانے کے بعد ریاست حیدرآباد میں کمشنری انعام کی خدمت پر متقرر رہا۔

مرحوم کے چچا اور والد مشرقی علوم والسنہ کے عالم اور فاضل تھے اور بعد ازاں انہوں نے مدرسہ عالیہ میں جو لارڈ وارن ہیسٹنگز نے کلکتہ میں قائم کیا تھا تعلیم پائی، ہندوستان میں یہ پہلے مسلمان تھے جنہوں نے باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔

مولوی سید علی مرحوم اپنے باپ کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ ۱۰ نومبر ۱۸۵۱ء میں تولد ہوئے۔ آٹھ برس کے سن سے چودہ برس تک علوم عربیہ حاصل کرتے رہے

ہیں کہ حافظہ انکا بڑے غضب کا تھا۔ جو چیز ایک دفعہ پڑھ لی یا نظر سے گزر گئی وہ پتھر کی لکیر تھی۔ پندرہ سال کی عمر میں عربی فارسی تعلیم سے فارغ ہو کر ۱۸۶۶ء میں انگریزی میں داخل ہوئے یہاں بھی انہوں نے خوب ترقی کی دو سال بعد کیننگ کالج لکھنؤ میں شریک ہوئے اور ۱۸۷۴ء یعنی کل آٹھ سال میں پٹنہ کالج سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ بی اے میں انکی اختیاری زبان سنسکرت تھی۔ کالج کے مدرس اور پروفیسر مرحوم کی ذہانت قابلیت اور حافظے کے قائل تھے۔ اسکے بعد تین سال تک قانون ملکی کا مطالعہ کیا اور سال بھر بعد امتحان نیٹو سول سروس میں کامیاب ہوئے اور کل ضلع بہار میں نمبر اول رہے۔ بعد ازاں طامسن اسکالرشپ پاکر وہ رڑکی کے انجینئرنگ کالج میں داخل ہوئے۔ ابھی پورے چھ مہینے بھی نہ گزرنے پائے کہ حیدرآباد دکن کے نامور مدبر اور عالی دماغ وزیر نواب مختار الملک سر سالار جنگ بہادر اول نے جنکی قدردانی اور جوہر شناسی مشہور آفاق ہے انھیں حیدرآباد میں طلب کر کے اپنے پرسنل اسٹاف میں داخل کیا اور ولایت جاتے وقت اپنے ساتھ لیگئے اور لندن کے شاہی مدرسہ معدنیات میں داخل کر دیا۔ اور بجائے تین سال کے دو سال میں السوشی ایٹ کا امتحان بدرجہ اعلیٰ پاس کیا اور علم طبقات الارض میں (مرچی سن) تمغہ پایا۔ علاوہ اسکے کیمسٹری، طبیعیات، مکانیک، نقشہ کشی، معدنیات، علم الحیوۃ وغیرہ علوم میں دستگاہ وافر حاصل کی پروفیسروں نے انکی لیاقت و ذہانت کی بہت تعریف کی ہے اور اعلیٰ درجہ کے صداقت نامے دئیے ہیں۔ مرحوم کی یہ خوش نصیبی تھی کہ انہوں نے بزمانہ قیام انگلستان ایسے ماہرین فن اور علمائے نامور سے تلمذ حاصل کیا جو اسوقت آسمان فضل و کمال کے آفتاب و ماہتاب تھے۔ مثلاً پروفیسر ہکسلے، پروفیسر جڈ، پروفیسر گتھری، پروفیسر ٹنڈل وغیرہ جو ہر ایک

اپنے فن میں یکتا تھا۔ اس سے قبل انہوں نے ۱۹۰۹ء میں لندن یونیورسٹی کا امتحان میٹری کولیشن بدرجۂ اعلیٰ پاس کیا تھا اور اس امتحان میں انکی اختیاری زبانیں جرمن اور فرانسیسی تھیں تکمیل تعلیم کے بعد انہوں نے فرانس، اسپین اور جرمنی کا سفر کیا، اور اٹالین زبان اور علوم کی تحصیل کے لیے کچھ مدت اٹلی میں قیام کیا۔ اور اس طرح علوم مغربی و مشرقی سے بہرہ ور ہو کر حیدرآباد واپس آئے جہاں سرکار عالی نے انہیں انسپکٹر جنرل معدنیات مقرر کیا کچھ عرصے کیلئے وہ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم اور ہوم سکرٹری بھی رہے۔

مرحوم مختلف السنہ و علوم کے فاضل تھے اور لاطینی، انگریزی، جرمنی، فرانسیسی، عربی، فارسی، اردو، سنسکرت، بنگالی، ہندی، مرہٹی، تلنگی اور گجراتی زبانیں خوب جانتے تھے مرحوم پہلے مسلمان تھے جو بار بار مدراس یونیورسٹی کے امتحان ایم۔ اے کے سنسکرت کے ممتحن مقرر ہوئے اور دید دن اور دیدک علم ادب میں امتحان کے پرچے مرتب کیے میں نے کئی پنڈتوں سے یہ سنا ہے کہ انکا تلفظ ایسا صحیح اور عمدہ تھا کہ اگر وہ پردے کے پیچھے سے دید پڑھتے تو یہ معلوم ہوتا کہ کوئی بڑا پنڈت پڑھ رہا ہے۔ اور یہ تو ہم نے خود دیکھا ہے کہ وہ جرمنی فرانسیسی اور لاطینی کتابوں کا ترجمہ نہایت روانی کے ساتھ بلا تکلف پڑھتے چلے جاتے تھے۔

مرحوم آخر عمر تک (باستثنائے بعض عارضی تقررات کے) معتمد تعمیرات و ریلوے و معتمد تجارت رہے۔ سر آسمان جاہ بہادر مرحوم کی وزارت میں بعض انقلابات سے بد دل ہو کر انہوں نے امتحان وکالت کی تیاری اسوقت کی جبکہ کلکتہ یونیورسٹی کے امتحان بی ایل میں صرف چار مہینے باقی رہگئے تھے، لیکن حیرت کی بات ہے کہ اس امتحان میں تمام یونیورسٹی میں اول رہے اور طلائی تمغہ، یونیورسٹی لا اسکالرشپ اور جی انعام کتب

حاصل کیا۔ اس سے پہلے کلکتہ یونیورسٹی میں کسی مسلمان طالب علم کو قانونی امتحان میں یہ اعزاز حاصل نہیں ہوا تھا یہ امتحان انہوں نے نومبر ۱۸۹۱ء میں پاس کیا اس سے مولوی سید علی مرحوم کے خداداد حافظہ اور ذہانت کا ثبوت ملتا ہے ۱۸۹۱ء میں گورنمنٹ ہند نے انہیں شمس العلما کا خطاب عطا فرمایا اور بلا شبہ وہ اس کے مستحق تھے سنہ ۱۹۰۱ء میں بعض پولیٹیکل وجوہ سے ایک پنشن قرار وظیفہ (لکھ ماہانہ) لیکر خدمت سے علیحدہ ہو گئے اور انگلستان میں جا کر مقیم ہوئے۔ سنہ ۱۹۰۲ء میں کیمبرج یونیورسٹی میں مرہٹی زبان کے لکچرار مقرر کئے گئے اسی سال انڈیا آفس میں عربی فارسی کے قلمی نسخوں کی فہرست تیار کرنے پر مامور ہوئے یہ بہت بڑا ذخیرہ ہے جس کی تعداد چھ ہزار سے کم نہیں۔ اس کی فہرست کا ترتیب دینا معمولی کام نہ تھا بلکہ ایک بڑا اور اہم کام خیال کیا گیا انڈیا آفس لائبریری کا حصہ "دہلی مینوسکرپٹ" (قلمی نسخہ ہائے دہلی) کے نام سے مشہور ہے۔ یہ دلی کا شاہی کتب خانہ تھا جو غدر کے بعد لندن بھیج دیا گیا

شاہجہان نے پورب کو شیراز کہا تھا، لیکن پورب میں بلگرام کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ یہ عجیب مردم خیز خطہ ہے اسی قصبے سے سید مرتضی صاحب تاج العروس، علامہ سید عبد الجلیل، مولانا آزاد وغیرہم جیسے فاضل پیدا ہوئے اور اس آخری دور میں شمس العلما مولوی سید علی مرحوم اور انکے بڑے بھائی مولوی سید حسین نواب عماد الملک بہادر سی۔ ایس۔ آئی کا شمار بھی انہیں باکمال علما میں ہو سکتا ہے۔

مولوی سید علی مرحوم بلا شبہ مختلف علوم دانستہ کے عالم تھے لیکن جب انکے کام پر نظر ڈالی جاتی ہے تو افسوس کے ساتھ یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ انکے علم کے مقابلہ میں انکا عمل بہت ہی کم تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ طبعاً جفاکشی اور

علمی کام کی طرف کم راغب تھے، دوسرے دکن کی آب و ہوا اور خاص کر یہاں کے حالات کچھ ایسے ہیں کہ آدمی کرنا بھی ہو تو کچھ نہ کر سکے اور خاص کر علمی کاموں کو زیادہ راس بھی نہیں۔ یہ سرزمین آج سے نہیں بلکہ صدہا سال سے کچھ ایسی انقلاب انگیز واقع ہوئی ہے کہ ہر دور میں ایک نہ ایک طوفان بپا رہا ہے۔ گو اب جنگ و جدل کا زمانہ نہیں رہا طوائف الملوکی اور غارت گری کا دور ختم ہو چکا ہے مگر پھر بھی کوئی ایسا شوشہ نکل آتا ہے کہ چین سے بیٹھنا اور اطمینان سے کام کرنا نصیب نہیں ہوتا اور خصوصاً مرحوم کی سی بے چین اور متلون طبیعت کیلئے اس دلدل سے نکلنا بہت دشوار تھا لیکن باوجود اسکے مرحوم علمی کام کی طرف سے غافل نہ رہے، اگرچہ انکا کام زیادہ تر بلکہ کل کا کل ترجمہ ہی تک رہا۔ لیکن اس زمانہ میں بہ نسبت ناقص اور فضول تالیف و تصنیف کے غیر زبانوں کی عمدہ تصانیف کا ترجمہ بیش قیمت اور قابل قدر رہے۔ کیونکہ ہندوستان کی اور خاص کر مسلمانوں کی اس وقت جیسی کچھ حالت ہے اسے مد نظر رکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ علمی بیداری کا پہلا دور ترجمہ ہی ہے۔ اگر غیر زبانوں کی عالی اور اعلیٰ تصانیف کے ترجمے ہو جائیں، تو آئندہ دور کی تالیف و تصنیف کیلئے بیش بہا سرمایہ اور پیش خیمہ ہوگا یہاں ہم مرحوم کی تالیفات و تراجم کی فہرست پیش کرتے ہیں۔

ا۔ میڈیکل جورس پروڈنس یعنی اصول قانون متعلق بہ طب۔ یہ کتاب علاوہ اطبا و وکلا و حکام عدالت کے عام ناظرین کیلئے بھی بہت دلچسپ ہے (ڈاکٹر مہر کی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے) اس کتاب میں انسانی فطرت کے تاریک پہلو کو پڑھ کر بڑی عبرت حاصل ہوتی ہے۔ بہ زمانہ وزارت سر آسمان جاہ مرحوم سرکار نے مترجم کو چھ ہزار روپے بطور صلہ عنایت فرمائے اس کتاب میں ایک امر یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ علمی اصطلاحات کا ترجمہ نہیں کیا گیا ہے

۲۔ رسالہ در تحقیق تالیف کتاب کلیلہ و دمنہ اس میں مرحوم نے مشہور و معروف کتاب کلیلہ و دمنہ کے متعلق بڑی تحقیق سے کام لیا ہے اور اس امر کے پتہ لگانے کی کوشش کی ہے کہ اصل میں یہ کتاب کہاں کی ہے، پھر کہاں کہاں گئی اور کس کس زبان میں اسکا ترجمہ ہوا اور کیا کیا تغیرات عمل میں آئے۔ مرحوم کی یہ مختصر تالیف بہت دلچسپ اور قابل قدر ہے۔ اسے مرحوم نے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرس کے ایک اجلاس منعقدہ علی گڈھ میں پڑھا تھا مرحوم فرماتے تھے کہ بزمانۂ قیام لندن ایک علمی سوسائٹی میں مسلمانون کے تمدن و علم و ادب کا ذکر تھا، ہر شخص اپنی اپنی سمجھ کے موافق اپنی اپنی رائے دے رہا تھا، اسی میں مرحوم نے فرمایا کہ اگر مسلمانون کے تمام آثار اور انکے کارنامے دنیا سے نابود بھی ہو جائیں اور دو کتابین کلیلہ و دمنہ اور الف لیلہ باقی رہ جائین تو انکے کارہائے نمایان کیلئے کافی ہیں۔ مرحوم کا ارادہ تھا کہ کلیلہ و دمنہ کی طرح ایک رسالہ الف لیلہ پر بھی لکھیں اور اسکے لئے دو الماریوان بھر کتابیں جمع کی تھیں۔

۳۔ فارسی کی تعلیمی قدر و قیمت بمقابلہ سنسکرت پر ایک نوٹ۔

۴۔ غارہائے الورہ کا گائڈ۔

۵۔ حیدرآباد کے اقتصادی و طبقات ارضی معدنیات۔

۶۔ تمدن عرب۔ موسیو لیبان کی فرانسیسی کتاب کا اردو ترجمہ جو ہندوستان میں بہت مقبول ہوا۔ درحقیقت یہ کتاب عربی و اسلامی تمدن پر بہت دلچسپ اور مفید کتاب ہے

۷۔ تمدن ہند۔ یہ کتاب بھی موسیو لیبان کی فرانسیسی کتاب کا ترجمہ ہے جس کا مفصل ذکر اس دیباچہ کے دوسرے حصے میں کیا گیا ہے۔

۸۔ مرحوم نے موسیو سدیو کی کتاب تمدن عرب کا ترجمہ بھی فرانسیسی سے اردو میں

کیا تھا، لیکن جب انہون نے یہ سنا کہ اسکا ترجمہ عربی میں ہوگیا ہے تو اسکو طبع نہیں کرایا
حالانکہ اگر یہ ترجمہ شائع ہوجاتا تو بہت مفید ہوتا اس لئے کہ عربی میں کامل کتاب کا ترجمہ نہیں ہوا
بلکہ صرف اس کا خلاصہ شائع کیا گیا ہے[1]

مرحوم نے حیدرآباد سے ایک عربی سہ ماہی رسالہ الحقایق نامی ۱۹۰۸ء میں جاری
کیا تھا جسکے چیف ایڈیٹر مرحوم ہی تھے۔ اس رسالہ میں اچھے اچھے مضمون لکھے گئے،
لکھنے والون میں نواب عمادالملک بہادر مولوی سید حسین بلگرامی، علامہ مولوی سید علی شوستری
ڈاکٹر لائٹنر، مولوی سید کرامت حسین صاحب جیسے فاضل اور عالم لوگ تھے لیکن افسوس ہے
کہ استقلال کے ساتھ کام نہوا اور رسالہ کچھ عرصہ کے بعد بند ہوگیا۔ ایسے رسالون اور اخبارون
کی اب بھی ضرورت ہے کیونکہ ہندوستان اور دیگر ممالک اسلامی میں تعلقات و روابط
قائم رکھنے اور ایک کو دوسرے کے خیالات وحالات سے آگاہ کرنے کا ذریعہ عربی
زبان ہی ہوسکتی ہے۔ نیز یہ یاد رکھنا چاہئے کہ آیندہ اسلام کی ترقی وعروج میں عربی زبان
کو بہت بڑا دخل ہوگا اس لئے کہ اسوقت مختلف اسلامی ممالک میں باوجود موجودہ انحطاط
وانتشار کے باہمی اتحاد اور ہمدردی قائم رکھنے والی علاوہ دیگر اسباب کے ایک عربی
زبان بھی ہے اور آیندہ چل کر یہی بکھرے ہوئے شیرازہ کو یکجا کرنے میں مدد دیگی
مسلمانون کو اس زبان کی تحصیل سے کبھی غافل نہیں رہنا چاہئے کیونکہ ہماری مذہبی،
علمی، تاریخی، اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی ترقی بغیر اس زبان کے ناقص و نامکمل رہے گی

اپنے زمانۂ ملازمت میں مرحوم نے ایک بہت قابل قدر کام کیا تھا اور اگر وہ
جاری رہتا اور قاعدہ سے چلایا جاتا اور اسکا چلانے والا ایسا شخص ہوتا جس کے دل
میں علمی ترقی اور قومی ہمدردی کی آگ ہوتی تو وہ بڑے برکت وخیر کا باعث ہوتا۔

[1] اس کا ترجمہ اردو میں ہوگیا ہے۔ انشاءاللہ ناظرین الناظر جلد اسکے سے مستفید ہوں گے۔

مرحوم نے نواب سر وقار الامرا بہادر مرحوم کے عہد میں جو بڑے قدر دان امیر تھے ایک ایک سر رشتۂ علوم و فنون قائم کیا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ اردو زبان میں بذریعۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ علمی کتب کا ذخیرہ بہم پہونچایا جائے۔ مرحوم اس سر رشتہ کے نگران مقرر ہوئے اور انکی زیر نگرانی دکن کی تاریخ اور بعض دیگر مضامین پر کتابیں تالیف و ترجمہ ہوئیں۔ لیکن اس وقت اس کام کے چلانے کیلئے کوئی مناسب شخص نہیں نہ ملا تھا لہذا انہوں نے شمس العلما مولنا شبلی کا انتخاب کیا اور انکا تقرر خدمت ناظم سر رشتہ علوم و فنون پر بمشاہرہ الفا ہوا اور درحقیقت یہ انتخاب بہت ہی اچھا ہوا تھا۔ مولانا کی چند کتابیں بھی اسی سلسلہ میں شائع ہوئیں لیکن ملک کی بدنصیبی سے یہ سر رشتہ ٹوٹ گیا اور کام اب تک بند ہے جس ضرورت سے یہ سر رشتہ قائم ہوا تھا وہ اب تک باقی ہے اور جب سے شمالی ہند و دیگر حصص ملک میں اردو پر لے دے ہوئی ہے ضرورت اور نمایاں طور پر محسوس ہو رہی ہے فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے بعد اردو کی سرپرستی دو مقامات پر خاص طور پر ہوئی ایک تو پنجاب میں دوسرے حیدرآباد دکن میں۔ پنجاب میں اسکے بانی ڈاکٹر لائٹنر اور کرنل ہالرائڈ تھے۔ ان صاحبوں کی تحریک سے پنجاب یونیورسٹی نے بیش بہا اور گرانقدر انعامات کے ذریعہ سے بہت سی عمدہ عمدہ کتابیں اردو زبان میں لکھوائیں اور ترجمہ کرائیں، اور یہ سلسلہ اب تک جاری رہا۔ لیکن حال میں اس عام مرض کی وجہ سے جو ملک کی بدقسمتی سے ہر جگہ شائع ہو گیا ہے بعض حضرات نے وطن پرستی کے پردے میں پنجابی کو اردو کا حریف بنا کر لا کھڑا کیا ہے اور پنجاب یونیورسٹی نے اردو کی سرپرستی سے کسقدر اپنا ہاتھ روک لیا ہے۔ اب اردو کو صرف ایک دولت آصفیہ کا آسرا

رہگیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اُردو زبان کو علاوہ اسکے کہ دکن نے اسکی نشو ونما میں ابتدا سے بہت بڑا حصہ لیا ہے اور مختلف وجوہ سے بھی دولت آصفیہ پر بہت بڑا حق حاصل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سرکارعالی نے عربی فارسی اُردو تصانیف کی ہمیشہ سرپرستی کی ہے اور اب بھی جاری ہے، لیکن خاص اصول اور کوشش کے ساتھ یہ کام اب تک نہیں ہوا ہے۔ اب کہ سب طرف سے مایوسی ہے سرکارعالی کا یہ فرض ہے کہ اس مسئلہ پر غور کرکے اس مفید اور ضروری کام کو اصول کے ساتھ چلائے۔ اور نہیں تو کم سے کم پنجاب یونیورسٹی کی طرح متعدد بیش قدر انعامات مقرر کرکے عام طور پر اشتہار دے اور علمی کتابیں اُردو میں لکھوائے۔ یا ترجمہ کرائے۔ تاکہ مولفین و مترجمین کی ایک حد تک حوصلہ افزائی ہوسکے۔ اس پر توجہ کرنے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ابھی پبلک میں اس قدر قدرشناسی کا مادہ پیدا نہیں ہوا کہ مصنفین و مولفین اس کے بھروسہ پر بڑے بڑے کام کرسکیں اور اس لئے ضرورت ہے کہ ایک زمانہ تک اس کے سر پر حکومت و دولت کا ہاتھ رہے۔

مرحوم کو کتابوں کا حد درجہ شوق تھا چنانچہ ایک نہایت عمدہ کتاب خانہ چھوڑا ہے جس میں کتابوں کی تعداد دس ہزار سے کم نہیں۔ یوں تو قریباً ہر فن اور علم کی کتاب ہے لیکن خاص کر وہ تمام مطبوعات جو یورپ میں اسلامی علوم و علم ادب پر اس زمانہ میں شائع ہوئی ہیں بڑے شوق اور محنت سے جمع کی ہیں صرف ان کتابوں ہی کے جمع کرنے پر اکتفا نہیں کی بلکہ یورپ کی مختلف زبانوں کے وہ موقت الشیوع رسالے بھی جمع کئے ہیں جن میں اسلامی مباحث پر عمدہ عمدہ مضامین شائع ہوئے ہیں اسلامی لٹریچر کا یہ ذخیرہ بہت بیش قدر اور نادرالوجود ہے اور تمام ہندوستان میں کسی دوسری جگہ ایسا

بے بہا مجموعہ موجود نہیں کاش کوئی خدا کا بندہ جس کے دل میں درد ہو یہ کتاب خانہ خرید کر مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڈھ کی نذر کر دے تاکہ کالج جب حقیقی یونیورسٹی بن جائے تو یہ اسکے لئے باعث رونق و افادہ ہو اور اُس محسن کو زندگی جاوید حاصل ہو۔

مرحوم ہمیشہ عمدہ اور نادر الوجود کتابوں کی ٹوہ میں رہتے تھے چنانچہ کتاب لو صایا لابو حاتم السجستانی کا قلمی نسخہ جس پر شہاب الدین خفاجی مصنف ریحانۃ الادب و امام عبد القادر بغدادی مصنف خزینۃ الادب کے دستخط تھے کیمبرج یونیورسٹی کے کتب خانہ میں تھا، فرانس کے کسی عالم نے بغرض طبع طلب کیا کیونکہ دنیا میں اس کتاب کا اور کوئی نسخہ نہیں ہے جب کتاب کتب خانہ کی الماری سے نکالی گئی تو معلوم ہوا کہ وہ اس قدر بوسیدہ ہو گئی ہے کہ فرانس پہونچتے پہونچتے آٹا ہو جائے گی تو یہ رائے قرار پائی کہ اسکا فوٹو لے لیا جائے چنانچہ دس کاپیاں بذریعہ فوٹو لی گئیں۔ مرحوم کے ولایت پہونچنے سے چار روز پہلے سب کاپیاں تقسیم ہو چکی تہیں۔ مرحوم کو جب معلوم ہوا تو اس پروفیسر کے پاس پہونچے جس نے فوٹو لیا تھا اور جا کر بمنت اصرار کیا کہ ایک نسخہ مجھے بھی عنایت ہو۔ پروفیسر موصوف نے عذر کیا کہ اس کا کوئی نسخہ موجود نہیں سوائے ایک کتاب کے جو میرے ذاتی کتب خانہ کیلئے ہے مگر چونکہ آپ مجھ سے زیادہ شایق معلوم ہوتے ہیں لہذا وہ نسخہ آپ کی نذر کرتا ہوں چنانچہ وہ نسخہ اب تک مرحوم کے کتابخانہ میں موجود ہے اسکی جلد بھی بہت قیمتی ہے۔

مرحوم نے جمہرۃ اللغۃ لابن درید جو لغت کی ایک نایاب کتاب ہے پانسو روپیہ میں خریدی۔ انکے ایک معزز دوست جو حیدرآباد میں ایک اعلیٰ خدمت پر تھے ان سے مستعار لے گئے اور کچھ عرصہ بعد کتب خانہ آصفیہ (حیدرآباد) میں ڈیڑھ دو ہزار کو فروخت کر دی۔ مرحوم بھول گئے تھے، چار سال بعد جو ایک روز کتب خانہ میں آئے اور اس کتاب کا ذکر آیا تو

معلوم ہوا کہ اسکا ایک نسخہ کتب خانہ میں بھی موجود ہے۔ دیکھنے کیلئے طلب کی تو معلوم ہوا کہ یہ نسخہ تو انہیں کا ہے اور جب اسکے فروخت کی کیفیت سنی تو بہت رنج ہوا۔ آخر بڑی احتیاط سے اسکی ایک نقل لی اور جب برلن گئے تو ایک پروفیسر کو دکھائی اُسے بیحد پسند آئی چونکہ روپیہ کی ضرورت تھی لہذا پندرہ ہزار میں فروخت کر دی۔

تزک بابری کا کامل ترکی نسخہ اب تک دنیا میں کہیں طبع نہیں ہوا۔ اصل ترکی نسخہ ایک سینٹ پیٹرز برگ میں ہے اور دوسرا فرانس میں لیکن دونوں ناقص ہیں مرحوم نے ترکی تزک کا کامل نسخہ نواب سالار جنگ بہادر مرحوم کے کتب خانہ میں دیکھا اور وہ اُسے انگلستان جاتے وقت اپنے ساتھ لیتے گئے۔ یورپ کی علمی سوسائیٹیوں میں جب تزک کا ذکر آیا تو مرحوم نے اس قلمی نسخہ کو پیش کیا بعد مقابلہ اور تحقیق کے یہ ثابت ہوا کہ سوائے اس نسخے کے باقی جس قدر نسخے دنیا میں اس وقت تک معلوم ہوئے ہیں ناقص ہیں۔ چونکہ تصحیح کیلئے متعدد نسخوں کا ہونا ضروری ہے اور اسمیں تاخیر بھی بہت ہوتی ہے لہذا یہ قرار پایا کہ گب میموریل فنڈ کی طرف سے کل کتاب کا فوٹو لے لیا جائے چنانچہ ایسا ہی ہوا اور یہ تمام کیفیت عکسی نسخے میں درج ہے۔ چونکہ اس زمانہ میں جاگیر نواب سالار جنگ مرحوم محکمۂ مالگزاری کی نگرانی میں تھی بعض حسّاد نے محکمۂ مالگزاری میں یہ شکایت کر دی کہ مولوی سید علی ایک نایاب کتاب کتب خانہ سے لیگئے ہیں انکو لکھا جائے یا تو کتاب واپس کریں ورنہ انکے وظیفہ سے اسکی قیمت وضع کر لی جائے۔ چنانچہ محکمۂ مالگزاری کی طرف سے یہی لکھا گیا۔ مرحوم نے اسکے جواب میں اصل نسخہ اور ایک جلد اس کے عکسی نسخے کی معتمد مالگزاری کی خدمت میں بھیجدی اور لکھا کہ میں نے آپ کی کتاب کا کوئی نقصان نہیں کیا بلکہ اسے زندہ کر دیا ہے۔

مرحوم کو ابن عرب شاہ مصنف تاریخ تیموری کی ایک دوسری نادر الوجود کتاب جو مصر کی تاریخ پر مشتمل تھی ولایت میں دستیاب ہوئی۔ مرحوم نے اسے جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں طبع کرانا شروع کیا لیکن دوران طبع میں وجع مفاصل کا مرض لاحق ہو گیا اور اسی وجہ سے وہ تکمیل کو نہ پہونچ سکی۔

مرحوم کو اکثر یہ خیال رہتا تھا کہ تحصیل علم کیلئے سہولتیں پیدا کی جائیں ایک مرتبہ انکی رائے ہوئی کہ حاجی خلیفہ کی کتاب کشف الظنون کی ترتیب بدل دی جائے۔ موجودہ کتاب کی ترتیب یہ ہے کہ کل کتاب کتب کی حروف تہجی پر تقسیم کیگئی ہے۔ اس ترتیب میں یہ خرابی ہے کہ جب تک کوئی پوری کتاب نہ پڑھے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ فلاں مصنف کی اس میں کون کون سی کتابوں کا ذکر ہے اور کن کن مقامات پر ہے۔ مرحوم نے یہ تجویز کی تھی کہ کل کتاب کے مصنفین کو حروف تہجی پر مرتب کیا جائے اور ہر مصنف کے نام کے ذیل میں اسکی تصانیف لکھدی جائیں تاکہ جب کوئی کسی مصنف کا تذکرہ دیکھنا چاہے تو اسکے حالات اور تصانیف ایک جگہ مل جائیں۔ چنانچہ اس کام کے انجام دینے کیلئے ایک شخص کو مامور کیا اور تقریباً دس سن تک پندرہ روپیہ ماہانہ خرچ کرتے رہے۔ لیکن افسوس ہے کہ چونکہ مرحوم میں استقلال نہ تھا اسلئے یہ کام بھی تکمیل کو نہ پہونچا

اسی طرح مرحوم کو گستاف فلوجل کے مرتبہ انڈکس قرآن میں ترمیم کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ عالم موصوف نے ایک جلد میں قرآن مجید کو اصل عربی میں اور دوسری میں اسکا قیمتی انڈکس یورپ میں شایع کیا ہے۔ جسکے طفیل میں قرآن پاک کی ہر صورت اور آیت آسانی سے نکل آتی ہے اور جو مصنفین و مولفین کیلئے نہایت کارآمد اور مفید ہے لیکن اس میں ہر آیت اور سورت کیلئے صرف ہندسوں کا نشان ہے۔ لیکن مرحوم

یہ چاہتے تھے کہ بجائے ہندسوں کے سورۃ کا نام لکھدیں چنانچہ اس طریقہ پر انڈکس مرتب کرالیا گیا تھا اور ارادہ تھا کہ بیروت میں طبع کراکر کم قیمت پر فروخت کیا جائے لیکن افسوس کہ طبع کی نوبت نہ آئی۔

مرحوم اہل علم کی بڑی قدر کرتے تھے اور جب ایسے لوگوں میں سے کوئی اُن سے ملنے جاتا تو اُس سے ملنے میں کبھی عذر نہ کرتے خواہ کیسے ہی ضروری کام میں مصروف ہوں اور اگر اس اثنا میں کوئی بڑا آدمی آجاتا تو اس سے بہت جلد پیچھا چھڑا لیتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک غریب صاحب علم سے باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں ملازم نے اطلاع دی کہ سرو قار الامرا بہادر مرحوم کے فرزند نواب ولی الدین خان بہادر تشریف لائے ہیں۔ مرحوم نے ملنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ نواب صاحب سے عرض کردو کہ میں ایک عالم سے گفتگو کر رہا ہوں جس کو آپ کی خاطر سے ترک نہیں کر سکتا، اگر آپ کو مجھ سے ملنا ایسا ضروری ہے تو دو گھنٹے انتظار فرمائیے اس گفتگو سے فارغ ہونے کے بعد آپ سے ملوں گا۔

یوں تو عام طور پر اور ہم لوگوں میں خاص کر یہ بڑا عیب ہے کہ لوگ اپنے ہم عصروں کے کمال کی داد دینے میں بڑا بخل کرتے ہیں لیکن مرحوم اسمیں بڑے فیاض تھے، وہ نہ صرف اہل علم کی قدر و منزلت کرتے تھے بلکہ انکے کام کو بھی وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ مولانا حالی کی انکے دل میں بہت وقعت تھی۔ چنانچہ جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ حیات جاوید چھپ چکی ہے اور مولوی عبداللہ خان صاحب کے پاس کچھ نسخے آگئے ہیں تو رات کے آٹھ بجے کتاب منگوائی اور اسی وقت مطالعہ کرنا شروع کیا اور بہت سا حصہ پڑھ ڈالا اور دوسرے دن بغیر ختم کئے نہ چھوڑی۔

ایک روز یہ واقعہ بیان کیا کہ علامہ نولڈکی ہشتاد سالہ سالگرہ پر اسکے شاگردوں اور اور مداحوں نے اسکی یادگار میں مختلف علمی رسائل لکھکر ایک کتاب کی صورت میں طبع کرائے۔ جو ایک ایسے فاضل کی یادگار کیلئے نہایت موزون اور عمدہ یادگار ہے اسی طرح انہوں نے یہ تجویز کی کہ ہم لوگوں کو چاہیئے کہ مولانا حالی کی علمی خدمات کی شکرگزاری کی یادگار میں ایک ایک رسالہ لکھیں اور خود بھی ایک رسالہ لکھنے کا وعدہ کیا اور راقم سے بھی تحریک کی اور اس کتاب کے اخراجات طبع وغیرہ کی خود ذمہ داری لی۔

جس زمانے میں تمدن ہند کا ترجمہ کر رہے تھے تو اول صبح کو اُٹھ کر چند ورق حیات جاوید کے پڑھ لیتے تھے اور اسکے بعد ترجمہ شروع کرتے تھے۔

ایک بار حیات جاوید کے پڑھنے کے بعد فرمایا کہ جو لوگ تذکیر و تانیث اور دلّی لکھنؤ کی زبان کے متعلق دور از کار اور فضول بحثوں اور جھگڑوں میں پڑے ہوئے ہیں وہ بڑی غلطی پر ہیں جب ہماری زبان میں ایسی کتاب موجود ہے جو ہادی اور راہبر کا کام دے سکتی ہے تو پھر ان لاطائل بحثوں میں پڑنا محض تضیع اوقات ہے زبان دلّی اور لکھنؤ کی تابع نہیں ہے بلکہ خیالات کی تابع ہے جن لوگوں کے خیالات رکیک ہیں انکی زبان کبھی فصیح نہیں ہو سکتی۔

مرحوم مولوی نذیر احمد کے ترجمۂ قرآن کو بہت پسند کرتے تھے چنانچہ تمدن عرب میں جابجا آیات قرآنی کا ترجمہ اس ترجمے سے لیا ہے۔ ایک روز مولوی عبد اللہ خاں صاحب نے جن سے مرحوم کو بہت خصوصیت تھی اور ہم کو ان سے مرحوم کے اکثر حالات معلوم ہوئے ہیں آیت استویٰ علی العرش پڑھی اور کہا کہ مولوی نذیر احمد نے اسکا ترجمہ یہ کیا ہے کہ "عرش پر جا براجا" مرحوم پھڑک اٹھے اور کہا کہ استویٰ کا ترجمہ اس سے بہتر ہو نہیں سکتا۔

مرحوم جب نواب وقار الامرا بہادر مرحوم کے ساتھ شملہ تشریف لے گئے تو مولوی سید احمد مولف فرہنگ آصفیہ نے اپنی تالیف ارمغان دہلی کے بعض اجزا پیش کئے مرحوم نے انکی بہت تعریف کی اور سفارش کر کے پچاس روپیہ وظیفہ مقرر کرا دیا۔ اور انعام کیلئے خود گزارش لکھ کر سرکار میں پیش کی۔ سرکار عالی سے بعد ازان مولف کو گران قدر انعامات عطا ہوئے۔

مولوی صاحب موصوف پر ایک بار کئی ہزار روپیہ کی ڈگری ہوئی جس سے وہ بہت پریشان تھے انہوں نے مرحوم کو اطلاع دی مرحوم نے کل رقم انکے پاس بھجوا دی۔

مرحوم بہت بامروت تھے۔ اگر کوئی شخص اُن سے کسی قسم کی درخواست کرتا اور وہ اُسے پوری نہ کرسکتے تو خاموش ہو رہتے مگر جب دوسری بار پھر آتا تو اُسی شرمندگی میں سب سے مقدم اس کا خیال کرتے اور حتی الامکان اسکی مقصد برآری میں کوشش کرتے یہان تک کہ کتابیں جو انہیں بہت عزیز تھیں انکے دینے میں بھی تامل نہ تھا بشرطیکہ وہ سچا قدر دان ہو۔ خاص کر طالب علموں اور اہل علم کا بہت خیال کرتے تھے چنانچہ ایک روز مولانا شبلی، مولوی عزیز مرزا مرحوم، مولوی ظفر علی خان مرحوم کے یہان مدعو تھے بارہ ۱۲ بجے کھانے کے بعد سے چار بجے تک مولوی شبلی مختلف اساتذہ کے شعر سناتے جس سے سامعین نہایت محظوظ ہوئے۔ مرحوم سے ان کی درخواست پر فوراً کامل مبرد کا بہت عمدہ نسخہ مطبوعہ یورپ جس کی قیمت ستر روپیہ ہے مولانا کی نذر کیا اور فرمایا کہ مجھ جیسا طالب علم جو خود کتابوں کا شوقین ہے اہل علم کی درخواست رد نہیں کرسکتا۔ اسی طرح کا ایک دوسرا واقعہ ہے کہ ۱۹۰۳ء میں جب سر سید مرحوم آخر بار حیدر آباد تشریف لائے اور بشیر باغ میں سرکار عالی کے مہمان ہو کر فروکش ہوئے۔ تو چونکہ مرحوم

کو اپنے کتب خانہ کی نادر کتب کے دکھانے کا شوق تھا، سرسید کو اپنے مکان پر لے گئے اور کتابیں دکھانا شروع کیں۔ منجملہ دیگر کتب ایک بیش بہا کتاب ایسی تھی کہ اس میں اوّل سے آخر تک اسپین کی اسلامی عمارات کے نقشے اور بہت عمدہ تصویریں تھیں سرسید مرحوم نے اس کتاب کی بہت تعریف کی اور فرمایا کہ یہ کتاب اس قابل ہے کہ کالج کی لائبریری میں رہے تاکہ مسلمان اسے دیکھ کر عبرت حاصل کریں۔ مرحوم نے کہا بیشک اسی قابل ہے اور چلتے وقت وہ نسخہ سرسید کی گاڑی میں رکھ دیا۔

مرحوم نے ردالمنطق لابن تیمیہ اپنے خرچ سے نقل کروا کر مولوی شبلی کے نذر کی تھی انگلستان پہونچ کر مرحوم نے مولانا کو خط لکھا کہ یہاں کی ایک علمی سوسائٹی اس کتاب کو چھپوانا چاہتی ہے آپ وہ نسخہ بھجوا دیجئے۔ مولانا اپنی عادت کی موافق اس پر بہت بگڑے اور جواب میں بہت سخت سست لکھا بلکہ یہ تک تحریر فرمایا کہ چونکہ یہ کتاب آپکے خرچ سے نقل ہوئی تھی اس لیئے آپ طلب کرتے ہیں مرحوم نے اس درشت اور عتاب آمیز خط کا جواب دیا کہ پانسو روپیہ کی عمدہ کتابیں خرید کر مولانا کی خدمت میں بھجوا دیں۔ چنانچہ اسکے بعد جب مولانا شبلی سرکار عالی کی درخواست پر دارالعلوم کے نصاب تعلیم کے ترتیب کرنے کیلئے حیدرآباد تشریف لائے تو اس شرمندگی کے مارے مرحوم سے ملے نہیں لیکن کتب خانے کے جلسۂ انتظامی میں اتفاق سے جب مڈبھیڑ ہوگئی تو مرحوم اسی خندہ پیشانی سے پیش آئے جو ان کا شیوہ تھا۔

جب اہل علم میں سے کوئی شخص حیدرآباد میں وارد ہوتا خواہ وہ کیسا ہی ہو تو انکی یہ بڑی خواہش ہوتی تھی کہ انکا مہمان ہو۔ چنانچہ مولانا شبلی جب حیدرآباد تشریف لائے تو مولوی محمد عزیز مرزا مرحوم کے مہمان ہوئے مرحوم کو جب دوسرے روز اطلاع ہوئی تو فوراً

آپہونچے اور اپنے گھر لیگئے۔ لیکن جب مولنا ملازم ہوتے ہی دوسری جگہ اٹھ گئے تو مرحوم کو بہت رنج ہوا اور یہ رنج انکے خطوط سے صاف مترشح ہوتا ہے۔

مرحوم اپنے دوستون کو مدد دینے اور اُنکے کام نکالنے مین بڑے بہادر تھے اور اور اس مین وہ کسی رکاوٹ یا مشکل کی پرواہ نہیں کرتے تھے اور بعض اوقات حیرت انگیز کام کر جاتے تھے۔ چنانچہ منجملہ دیگر واقعات کے ہم ایک واقعہ کا یہان ذکر کرتے ہیں۔ مرحوم کے والد مولوی سید زین الدین خان صاحب کی عمر کا اکثر حصہ پٹنہ میں صرف ہوا تھا، اور مولوی خدابخش خان صاحب کے مرحوم سے بہت تعلقات تھے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ مولوی خدابخش خان صاحب مرحوم کسی مقدمہ میں وکیل ہو کر حیدرآباد تشریف لائے اور دیرینہ تعلقات کی وجہ سے مرحوم ہی کے مکان پر ٹھہرے۔ انہیں ایام میں ایکبار انہون نے مرحوم سے یہ خواہش ظاہر کی کہ برٹش انڈیا میں درجۂ دوم کا وکیل ہوں اگر آپ کی سعی سے سرکار عالی مجھے وکالت درجۂ اول کی سند عطا کردے تو میں آپ کا بہت ممنون ہوں گا۔ مرحوم نے نہایت خوشی سے اس میں مقدور بھر کوشش کرنے کا وعدہ کیا۔ دوسرے ہی روز وہ میر افضل حسین صاحب مرحوم میر مجلس عدالت العالیہ (چیف جسٹس ہائیکورٹ) کے یہان پہونچے اور بہت منت اور لجاجت سے اظہار مطلب کیا اور کہا کہ مولوی صاحب ہمارے والد کے دوست اور ہمارے بزرگ ہیں، اگر آپ کی عنایت سے انکا یہ کام نکل جائے، یہ کوئی بڑی بات نہیں تو مجھ پر بڑا احسان ہوگا۔ مگر میر صاحب مرحوم نے کچھ ایسا غیر متوقع اور دل شکن جواب دیا کہ اسکے بعد مرحوم نے مولوی خدابخش خاں کا اُن سے تعارف کرانا بھی پسند نہ کیا اور بغیر ملائے ساتھ واپس لے گئے۔ جب راستے میں تمام واقعہ مولوی صاحب سے بیان کیا تو مولوی صاحب مرحوم کو بے انتہا رنج اور مایوسی ہوئی مرحوم نے

کہا آپ چل نہیں سکتے اور مایوس نہوں اگر میر افضل حسین صاحب نے سند نہیں دی تو کچھ مضائقہ نہیں انشاء اللہ اب ہم کوشش کرینگے کہ آپ خود میر مجلس ہو جائیں اور دوسروں کو سندیں عطا کریں۔ چنانچہ مرحوم نے جان توڑ کے کوشش کی اور آخر مولوی خدا بخش خان صاحب کو میر مجلس کرا کے رہے۔

مرحوم کی عادت تھی کہ جب کوئی شخص کسی علمی کام یا تجارت کیلئے روپیہ طلب کرتا تو وہ حتی الامکان بڑی خوشی سے اسکی مدد کرتے تھے۔ چنانچہ حیدر آباد کے ایک صحاف نے وہاں سے آکر کہا کہ مجھے آپ کوئی کتاب جلد باندھنے کیلئے دیجئے مرحوم نے ایک کتاب دی اور کہا اگر تم عمدہ جلد باندھوگے تو ہم تمھیں اور کام دینگے جب وہ جلد باندھ کے لے گیا تو مرحوم نے بہت پسند فرمائی اور اسکے کام کی تعریف کی صحاف نے کہا سرکار یہ کیا کام ہے افسوس سامان نہیں اگر میرے پاس سامان ہوتا تو پھر آپ میرا کام دیکھتے۔ مرحوم نے فوراً اسے دو ہزار روپیہ کا سامان ضروری مشینیں منگوادیں۔ مطبع شمسی (حیدر آباد دکن) بھی اسی قبیل سے ہے اور مرحوم کے فیض کی یادگار ہے کبھی کبھی وہ طالب علموں کی بھی اسی طرح مدد کرتے رہتے تھے۔

مرحوم اگرچہ شیعہ خاندان سے اور شیعہ والدین کی اولاد تھے اور اسی سے شیعہ بھی کہے جاتے تھے لیکن وہ تعصب سے بالکل بری تھے اور شیعہ سنی کی تفریق کو بہت برا خیال کرتے تھے۔ حالانکہ مرحوم کا کتب خانہ نہایت وسیع تھا یہ عجیب بات ہے کہ اس میں مذہب کی کوئی کتاب نہ تھی۔

چنانچہ جب مرحوم کتب خانہ دیکھنے کیلئے رام پور گئے تو نواب صاحب رامپور سے بھی کتب خانے کے متعلق ذکر آیا۔ نواب صاحب نے کسی قدر فخر سے فرمایا کہ ہم نے وہ

کام کیا جو ہمارے اجداد نے نہیں کیا تھا یعنی اس کتاب خانے میں سنی مذہب کی کتابیں تو جمع تھیں ہی لیکن ہم نے مذہب شیعہ کی کتب بھی جمع کی ہیں خصوصاً ملا محمد باقر مجلسی کی بحار الانوار کی پچیس جلدیں جو حال ہی میں طہران میں طبع ہوئی ہیں ہم نے منگائی ہیں" مرحوم نے فرمایا کہ شیعون کی مذہبی کتب محض بیکار ہیں اور ہرگز قابل استدلال نہیں۔ جب بخاری و مسلم جیسی کتابیں جنکے متعلق بے انتہا چھان بین کی گئی ہے اسقام و اغلاط سے بری نہیں ہیں تو ملا باقر کی کتاب کس شمار میں ہے" نواب صاحب نے فرمایا کہ اور کچھ نہیں تو اتنا تو ضرور ہے کہ اہل بیت نبوی کے فضائل جو سنیون نے خصوصاً بخاری و مسلم کے جامعین نے قلم انداز کر دیئے ہیں وہ اس میں درج ہیں۔ مرحوم نے کہا "یہ بھی ایک مہمل بات ہے نبی روحانی و اخلاقی اصلاح کیلئے مبعوث ہوا تھا نہ کہ اپنے اہل بیت کے محامد بیان کرنے کیلئے۔ ایک معمولی تمیز دار شریف آدمی بھی اپنے اہل بیت کے محامد اس طرح بیان کرنے کو خلاف آداب سمجھتا ہے نبیؐ کا درجہ اس سے بہت ارفع تھا ان سے ایسی باتوں کا سرزد ہونا خلاف قیاس ہے"۔

ایک روز مرحوم نے فرمایا کہ کیمبرج یونیورسٹی میں ایک ایرانی سے ملاقات ہوئی جو پڑھا لکھا اور عالم شخص تھا میں نے پوچھا "تم حضرت عمرؓ سے کیون عداوت رکھتے ہو؟" ایرانی عالم نے جواب دیا کہ "ہم حضرت علیؓ کی پیروی کرتے ہیں" اس پر میں نے کہا کہ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ میں کوئی عداوت نہ تھی اگر ایسی عداوت ہوتی جیسا کہ آپ لوگون کا خیال ہے تو وہ اپنی بیٹی ام کلثوم کا نکاح حضرت عمرؓ سے کبھی نہ کرتے۔ ایرانی نے تعجب سے پوچھا "اس واقعہ کی تصدیق کی آپ پاس کیا دلیل ہے؟" مرحوم نے اپنے کتب خانہ سے فوراً تاریخ یعقوبی مصنفہ ابن واضح کاتب عباسی جو

شیعہ مذہب کا عالم ہے لاکر دکھائی۔ یہ کتاب یورپ میں طبع ہوئی ہے اور جس کے دیباچہ میں مصنف کے شیعہ ہونے کی تصدیق کی گئی ہے۔ ایرانی عالم اس کتاب اور واقعہ کو دیکھکر تائب ہوگیا اور عہد کیا کہ آیندہ کبھی حضرت عمرؓ کو برا نہ کہونگا اور تعجب کیا کہ ہمارے لوگ ان باتون کو کیون چھپاتے ہیں۔

قیام بلدۂ حیدرآباد میں بھی ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا، ایک روز راقم، مولوی عبداللہ خان صاحب اور ظہیر الدین فرزند مولوی بشیر الدین احمد صاحب مرحوم کے یہان بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں ایک بڑے شیعہ مولوی تشریف لائے۔ مرحوم نے عبداللہ خان سے کہا کہ ذرا الیعقوبی کی تاریخ جلد دوم تو اندر سے لیکر آؤ۔ جب وہ کتاب لیکر آئے تو انھون نے پوچھا کہ آپ اسمیں کیا ملاحظہ فرمانا چاہتے ہیں؟ تو مرحوم نے اُنکے ہاتھ سے کتاب لیکر ایک مقام پر سے پڑھکر سنانی شروع کی۔ یہ وہی مقام تھا جس کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ اس کے بعد شیعہ عالم سے مخاطب ہوکر کہا کہ "آج کئی روز سے ہم میں اور ہماری بیوی میں بحث ہورہی ہے، وہ میری اس بات کو قبول نہیں کرتین کہ حضرت ام کلثوم کا نکاح حضرت عمر سے ہوا اور اسقدر مہر مقرر ہوا تھا، اور اُن سے ایک بیٹا مسمی زید پیدا ہوا تھا" اسپر حاضرین جلسہ میں سے ایک صاحب نے کہا کہ علمائے شیعہ اس واقعہ کے منکر نہیں ہیں بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ جبر واکراہ کا نکاح تھا۔ مرحوم نے نہایت تعجب سے کہا کہ "یہ خیال نہایت جاہلانہ اور ذلیل ہے دنیا میں کوئی ایسی طاقت تھی کہ وہ فاطمہ کی لڑکی کو علیؓ سے چھین سکے یا اس سے زبردستی نکاح کرلے!!" آخر مولوی صاحب خفیف ہوکے رہ گئے اور کچھ جواب نہ بن پڑا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک شخص نے پوچھا کہ خلفائے اربعہ کے مناقشات

اور خانگی جھگڑوں کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے مرحوم نے فرمایا کہ خلفائے اربعہ میں کوئی ذاتی عداوت یا دشمنی تو تھی نہیں' اگر تھی تو اتنی جتنی ہم میں اور مولوی عزیز مرزا صاحب میں۔ مثلاً اگر کوئی جگہ خالی ہو اور اسکے لئے مولوی عزیز مرزا بھی کوشش کریں اور ہم بھی تو اسکے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم دونوں میں دشمنی یا عناد ہے۔ اگر اس مقام یا موجودہ ملازمت سے قطع تعلق کرنے کے بعد دوسری جگہ چلے جائیں تو ہم لوگوں میں کوئی دشمنی نہ ہوگی، اور اپنے حق کے لئے کوشش کرنا کوئی دشمنی کی بات نہیں ہے۔

شیعہ سنی کے جھگڑے کے متعلق انکی یہ رائے تھی کہ یہ پولیٹیکل جھگڑا ہے۔ انکے پاس ایک عالم جرمن کی کتاب بھی تھی جس میں اسنے اسپر خوب بحث کی ہے مرحوم کا ارادہ تھا کہ اس کتاب کا ترجمہ اُردو میں کردیں' لیکن افسوس کہ یہ خیال عمل میں نہ آیا۔

آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے ایک معزز ممبر نے انھیں لکھا کہ میرا ارادہ ہے کہ آپ کا نام اب کے سالانہ جلسہ کی صدارت کے لئے تجویز کردوں اور مجھے قوی امید ہے کہ سب ممبر اسے خوشی خوشی قبول کریں گے۔ آپ کے انتخاب کے لئے تین بڑے وجوہ ہیں۔ اول آپ شیعہ ہیں' دوسرے عالم ہیں۔ تیسرے صاحب مال و جاہ ہیں" مرحوم نے جواب میں لکھا کہ "جو وجوہ آپ نے میرے انتخاب کے لئے لکھے ہیں وہ صحیح نہیں ہیں۔ اسلئے کہ آپ کا فرمانا ہے کہ میں عالم ہوں' یہ غلط ہے میری حیثیت ایک طالب علم سے زیادہ نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ میں مال دار ہوں یہ بھی صحیح نہیں' البتہ اتنا ہے کہ فراغت سے کھا پی لیتا ہوں۔ تیسرے یہ کہ میں شیعہ ہوں یہ سچ ہے لیکن میں سلسلہ مجری کا شیعہ ہوں اس سے آگے بڑھنے کی میں نے ذرا بھی کوشش

نہیں کی ہے۔ علاوہ اسکے میں اس قسم کی کانفرنسون کو ہرگز پسند نہیں کرتا جبکہ آل انڈیا
محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس موجود ہے۔ اور اسی لئے میں آل انڈیا شیعہ کانفرنس کا پریسیڈنٹ
ہونا بھی پسند نہیں کرتا۔"

ایک دن شمس العلما مولوی شبلی نے پوچھا کہ شیعون کو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رح سے
کیوں عداوت ہے۔ حالانکہ انھوں نے شیعون کے رد وغیرہ میں بھی کوئی کتاب نہیں
لکھی۔ مرحوم نے فرمایا کہ رد لکھنے یا نہ لکھنے سے دشمنی نہیں ہوتی بلکہ دشمنی کے بہت سے
اسباب ہیں۔ اگر آپ ہمارے بجائے ہوتے تو آپ کو بھی اُن سے دشمنی ہوتی حضرت
شیخ عبدالقادر رح جیلانی نے ہماری آدھی سلطنت چھین لی۔ مولانا نے پوچھا وہ کیونکر
فرمایا کہ آدھی اسلامی دنیا حضرت شیخ عبدالقادر رح کی نذر و نیاز کرتی ہے۔ اٹھتے بیٹھتے
انکا نام لیتی ہے اگر یہ شخص نہوتا تو سب ہمارے ائمہ کی پرستش کرتے۔ اگر اسی طرح آپ
کی آدھی سلطنت جاتی رہتی تو ہم آپ سے پوچھتے کہ آپ کیا فرماتے ہیں"

مذکورۂ بالا واقعات سے مرحوم کے مذہبی خیالات کا صحیح اندازہ ہوسکتا ہے
زیادہ تصریح کی حاجت نہیں۔

مرحوم صحیح بخاری کے بڑے مداح اور قدردان تھے اور کہتے تھے کہ عربی زبان
سیکھنے کے لئے اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں۔ ہدایہ کے بھی وہ بہت ثناخوان تھے
اور جس قدر مختلف نسخے انکے پاس بکنے آتے وہ خوشی خوشی انھیں خریدتے
تھے حالانکہ متعدد نسخے موجود تھے۔

اگرچہ مرحوم تعصب سے بری اور مشرب وسیع رکھتے تھے لیکن غیرت و حمیت
قومی اُن میں ضرور تھی اور اسلام و بانیٔ اسلام پر دل سے یقین کرتے تھے مگر

مولویوں کی جاہلانہ اور متعصبانہ باتوں سے سخت ناراض ہوتے تھے۔ قیام انگلستان میں وہ اکثر ہندوستانی اور دیگر بلاد عثمانی کے طلبہ اور مقیم اصحاب کی دعوتیں کرتے رہتے تھے۔ ایک بار انھوں نے کنگ ایڈورڈ ہفتم کے باڈی گارڈ کو دعوت دینے کا خیال کیا اور بذریعہ ٹیلیفون ان سے دریافت کیا۔ اُنکے افسر نے نہایت خوشی کے ساتھ دعوت قبول کی اور کہا کہ یہ تو ہمارے لئے بڑی عزت وفخر کی بات ہے کہ عالم سید نے ہماری دعوت کی ہے۔ دعوت کے دو گھنٹے پہلے اس افسر نے ٹیلیفون کے ذریعہ سے پوچھا کہ اگر آپ اجازت دیں تو مولوی صاحب کو جو ہمارے ساتھ ہیں لیتے آئیں کیونکہ ہم لوگ جاہل ہیں آپ سے کیا باتیں کرینگے۔ مرحوم نے فرمایا کہ آپ ایک نہیں بلکہ جتنے آدمی چاہیں اپنے ساتھ لا سکتے ہیں۔ ہندوستان کے ان مسلمانوں سے تعارف پیدا کرانے کے لئے ترکی اور ایرانی قونصلوں کو بھی دعوت دی اور اس بے تکلفی کی وجہ سے کسی انگریز کو دعوت میں نہ بلایا۔ شام کے وقت جب سب لوگ کھانے کی میز پر آئے تو باڈی گارڈ والوں کے مولوی صاحب نے جو غالباً پنجابی تھے کہا کہ کھانے سے پہلے یہ بتلائیے کہ آپ کے پاس گوشت کہاں سے آیا ہے مرحوم نے پوچھا کہ اس سے آپ کا کیا مقصد ہے۔ مولوی صاحب نے کہا لندن میں کہیں حلال گوشت نہیں ملتا، سب حرام ہوتا ہے اسلئے میں نے یہ عہد کیا ہے کہ جب تک اپنے ہاتھ سے ذبح نہ کروں گا کبھی گوشت نہ کھاؤں گا مرحوم نے غصے سے تلخ لہجے میں جواب دیا کہ افسوس آپ جاہل ہیں اور دین اسلام سے بالکل بے خبر اور ناواقف ہیں۔ ایک مسلمان کے دسترخوان پر آپ کو اس قسم کے فاسد خیالات وشبہات

کرنے کا کوئی حق نہیں ہے کیا آپ کو لا تجسسوا کا قول یاد نہین ہے؟ کیا آپ کو یہ معلوم نہیں ہے کہ حضرت عمر جب غیر قومون کے ساتھ معاہدہ کرتے تھے تو منجملہ اور شرایط کے ایک شرط یہ بھی ہوتی تھی کہ جو مسلمان وہان وارد ہو اسکی تین دن تک دعوت کرین۔ کیا ان مسلمان مسافرون کے لئے مسلمان ذبح کرتے تھے یا مسلمان باورچی ہوتے تھے؟ کیا آپ کو یہ مسئلہ معلوم نہیں ہے کہ جبتک کسی شئے کے حرام ہونے کا علم نہو اُسے حلال سمجھنا چاہیئے"۔ چونکہ یہ گفتگو مرحوم نے کسی قدر تلخ اور درشت لہجے میں کی تھی اور سوائے ہندوستانیون کے دوسرے اسے سمجھ نہیں سکتے تھے اسلئے باقی لوگ حیرت سے مرحوم کا مُنھ تک رہے تھے۔ آخر ترکی قونصل نے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ مرحوم نے سارا قصہ دہرایا اور کہا کہ یہ ہندوستان کے مسلمانون کا نمونہ ہے اس سے آپ انکی اخلاقی حالت کا اندازہ کر لیجئے۔ یہان یورپینون نے اول ہی میرا دم ناک میں کر رکھا ہے، کوئی پوچھتا ہے "تمہارے مذہب میں پردہ کیون ہے"؟ کوئی کہتا ہے "تمھارے پیغمبر نے تعدد زوجات کی اجازت کیون دی ہے"؟ کوئی سوال کرتا ہے "تمھارے نبی نے عورتون کے مارنے کا کیون حکم دیا ہے"؟ ان اعتراضات اور سوالات کا جواب دیتے دیتے ہم تنگ آگئے ہین اور پھر جب یہ مولوی صاحب اور انکے ہم خیال یہان کی سوسائیٹی میں رہکر اس قسم کی رکیک باتین کرتے ہیں تو مسلمانون کے متعلق غیر قومون کے خیالات کیا ہونگے۔ ایسے شخص کے زہریلے خیالات کا اثر تمام قوم اور ملک پر پڑتا ہے۔ ترکی قونصل نے کہا اگر واقعی ہندوستان کے مسلمانون کی یہ

حالت ہے تو نہایت قابل افسوس ہے۔ جب اہل فوج کو یہ معلوم ہوا کہ اُنکے مولوی صاحب نے سید صاحب کی دل آزاری کی ہے اور انھین رنج پہونچایا ہے تو ان سب نے بالاتفاق مولوی صاحب سے یہ کہا کہ وہ سید صاحب کے قدمون پر گرین اور معافی مانگین ورنہ ہم اپنی جماعت سے خارج کردینگے۔ چنانچہ مولوی صاحب نے اُٹھ کر معافی مانگی اور مرحوم نے خندہ پیشانی سے معاف کردیا اور جب رخصت ہونے لگے تو مولوی صاحب کو گلے لگایا اور اُلٹی معافی مانگی اور سو روپیہ کا چک انکی نذر کیا اور یہ نصیحت کی کہ ایسے شخصی اور ذاتی خیالات سے ملک و قوم بدنام ہوتے ہیں آیندہ کبھی کسی سوسائیٹی میں ایسی گفتگو نہ فرمائیے گا ورنہ تمام ہندوستان کے مسلمان غیر قومون کی نظرون مین ذلیل ہوجائین گے۔

مرحوم ہندوستان کے مروجہ پردے کو بہت بُرا سمجھتے تھے نیز اُن لوگون کو وہ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے جو تعدد زوجات کے حامی تھے۔

پارسی قوم کی نسبت مرحوم کا خیال تھا کہ یہ قوم پچاس سال میں فنا ہوجائے گی کیونکہ ثروت کا مدار تجارت پر ہے اور یہ لوگ تجارت چھوڑ چھوڑ کر نوکری کی طرف ڈھل رہے ہیں۔

مرحوم کے مزاج میں مزاح بھی تھا۔ چنانچہ اُس زمانے میں جبکہ وہ تمدن ہند کا ترجمہ کررہے تھے انھون نے اپنے ایک دوست کو وہ باب سُنانا شروع کیا جسمیں ڈراوڈی قوم کا (جو ہندوستان کی ایک قدیم وحشی قوم تھی) ذکر تھا۔ جب مرحوم پڑھنا ختم کرچکے تو اُس دوست نے سوال کیا کہ کیا یہ قوم اب بھی باقی ہے؟ اتفاق سے اسوقت ایک مولوی صاحب جو مرحوم سے ملنے کے لئے آئے تھے پاس ہی بیٹھے تھے۔ مرحوم نے اشارہ سے بتایا کہ یہ حضرت اسی قوم کی یادگار ہیں۔

مولوی محمدؐ سورتی نے جو عربی زبان کے مستند عالم اور قدیم کتب کے شوقین ہیں مرحوم سے ایک کتاب بغرض نقل مستعار طلب کی، کتاب تھی نادر، مرحوم کو دینے میں تامل تھا مگر مروت کے مارے صاف صاف انکار بھی نہ کرسکتے تھے۔ کتاب نکال کر لائے اور مولوی صاحب کے ہاتھ میں دیدی مگر ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ مولوی صاحب یہ خیال رہے کہ کتاب تو بیشک نہایت عمدہ ہے مگر اُسکی جلد سؤر کے چمڑے کی ہے مولوی صاحب نے یہ سُننتے ہی فوراً لاحول ولا قوۃ کہکر کتاب وہیں میز پر پٹک دی۔

ایک بار حضرت خواجہ معین الدین چشتی رح کی درگاہ پر فاتحہ پڑھنے گئے مجاوروں نے موٹی اسامی سمجھ کر آگھیرا، مرحوم نے جب یہ دیکھا تو کہا بھئی مجھے کیوں گھیرے ہوئے ہو میں تو وہابی ہوں یہ کہنا تھا کہ سب چھوڑ کر الگ ہو گئے۔

مرحوم بزمانہ طالب علمی نیز بعد ازاں پنشن لینے کے بعد انگلستان میں کئی سال مقیم رہے اور انھیں اعلیٰ سے اعلیٰ سوسائٹی میں جانے اور ملنے کا اتفاق ہوا۔ مگر باوجود اسکے کہ وہ انگریزی سوسائٹی کو پسند نہیں کرتے تھے اور اُنکے آداب وتکلفات کو مہمل سمجھتے تھے وہ فرماتے تھے کہ انگریزوں کی قوم حب جاہ ومال میں منہمک رہتی ہے اور اُسے صرف روپیہ کمانا اور اسکا صرف کرنا آتا ہے اور باقی کسی دوسرے کی بات کی پرواہ نہیں۔ وہ انگریزی قوم کو کچھ اچھا نہیں سمجھتے تھے۔

زندگی کے آخر زمانے میں مرحوم کو بعض وجوہ سے حیدرآباد دکن کا قیام ترک کرنا پڑا۔ اس وقت انھیں اُسکا رنج بہت تھا۔ کیونکہ یہاں اُنکے

مکانات تھے، کتب خانہ تھا بیوی بچے سب یہین تھے اور دو بیٹون کی ملازمت کا سلسلہ بھی یہیں ہو گیا تھا، دوسرے عمر کا بہترین حصہ یہین کٹا تھا اور دنیا کے نشیب و فراز اور ادبار و اقبال کے تماشے یہین دیکھے تھے۔ لہذا اسکی محبت وطن کی محبت سے کم نہ تھی۔ لیکن جب یہان سے جا کر انھون نے ہردوئی میں قیام کیا (جہاں انھون نے ایک بڑا مکان اپنے رہینے کے لئے خرید لیا تھا) اور پھر وہاں سے مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڈھ میں آنے جانے لگے اور قوم کی خدمت میں وقت صرف ہونے لگا تو اس وقت آنکھیں کھلین اور معلوم ہوا کہ کام کرنے کا وقت اب آیا ہے، اس سے پہلے عمر عزیز بیکار بکھیڑون اور تفریح میں گزری، زندگی کا لطف اب آئے گا تھوڑے ہی عرصہ بعد یونیورسٹی کا مسئلہ چھڑ گیا۔ جسمین انھون نے بڑے شوق اور جوش سے کام شروع کیا اور یونیورسٹی کے کانسٹی ٹیوشن کی ترتیب بھی انہیں کے تفویض ہوئی جسکے لئے وہ خاص طور پر موزون تھے۔ اسمیں انھون نے بڑی محنت کی اور قابل قدر کام کیا۔ آخر وہ وقت جو اگرچہ معین نہیں ہے مگر کسی کے ٹالے نہیں ٹلتا آگیا اور بے وقت اجل سر پہ آن پہونچی اور دفعتہً ہردوئی میں قلب کی حرکت بند ہو جانے سے بتاریخ ۳ مئی ۱۹۱۱ء انتقال ہو گیا۔ اور قوم کا ایک برگزیدہ فرد اُٹھ گیا۔

مرحوم علاوہ عالم و فاضل ہونے کے متعدد زبانون کے ماہر تھے اور افسوس کہ اب قوم میں کوئی شخص ان کا جانشین نہیں ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ مرحوم پر حُبِ دولت و جاہ غالب تھی لیکن جب روپیہ اُنکے

پاس آتا تو اسکے دینے میں بھی وہ بڑی فیاضی سے کام لیتے تھے، اگرچہ اکثر اس سے وہی متمتع ہوتے تھے جو چالاک اور چلتے پرزے ہوتے یا اشاعت شہرت میں مدد دیتے تھے۔ مرحوم علما اور طالب علموں کی قدر کرتے تھے اور خواہ اُنکی دنیاوی حیثیت کیسی ہی ادنیٰ کیوں نہو اور وہ کیسے ہی پھٹے حال میں کیوں نہوں اُن سے بڑی مروت اور اخلاق سے پیش آتے تھے اور جائز مدد دینے میں کبھی دریغ نکرتے تھے۔ اُنکی صحبت سے خوش ہوتے تھے اور اسلئے اکثر اُنکے ہاں علمی تذکرے اور چرچے رہتے تھے۔ اُنکی مہمان نوازی دیکھکر عربوں کی ضرب المثل مہمان نوازی یاد آتی تھی۔ ہند اور غیر ممالک کے سیاح اور علما کے لئے اُنکا عالیشان مکان مہمان خانہ تھا اور بڑی فراخ دلی کے ساتھ حق میزبانی ادا کرتے تھے۔ جب جائے انکے مکان پر کوئی نہ کوئی ہندی، انگریز، فرانسیسی، جاپانی، امریکن، ترکی یا مصری سیاح یا عالم نظر آتا تھا۔ دوسروں کی بھلائی اور مقصد برآری کے لئے ہر وقت مستعد رہتے تھے اور بعض اوقات دلیرانہ کام کر گزرتے تھے۔ بےکسوں اور درماندوں کا سہارا اور مایوسوں کی آس تھے۔ نہایت بے تعصب اور روشن خیال مسلمان تھے اور اس بات کو خوب سمجھتے تھے کہ اس درماندہ قوم کی دست گیری کرنا فرض ہے چنانچہ ایک زمانے میں محکمۂ تعمیرات و معدنیات و ریلوے میں سب کے سب یوروپین، یوریشین اور دیسی عیسائی تھے مسلمان اکا دکا نظر آتے تھے، لیکن جب مرحوم کا تقرر اس عہدے پر ہوا تو مسلمان رفتہ رفتہ داخل ہونے شروع ہوئے اور اب معاملہ بالکل برعکس ہے۔ مرحوم کو اپنی بیوی سے بے انتہا محبت تھی

چنانچہ جب وہ حیدرآباد سے وظیفہ لیکر انگلستان گئے تو وہ بھی اُنکے شریک سفر تھیں۔ جس زمانے میں مولانا شبلی، مرحوم کے ہاں مہمان تھے تو ایک روز فرمانے لگے کہ میں اسکا احسان تو نہیں جتا سکتا کہ آپ میرے مہمان ہیں بلکہ اُلٹا میں آپکا احسان مند ہوں کہ آپ نے مجھے یہ عزت بخشی، مگر ایک بات کا آپ کو میرا شکرگزار ہونا چاہئیے آپ کو معلوم ہے کہ میری ایک بیوی ہے اور پھر بھی میں اُسے تو مہینے چھوڑکر آپ کے ساتھ کھانا کھاتا ہوں۔ مرحوم میں ایک بڑا نقص یہ تھا کہ وہ متلون مزاج تھے اور بعض اوقات خود غرض لوگوں کے بہکانے سے بھٹک جاتے تھے یا عُجب جاہ میں بعض ایسی باتیں کرگزرتے تھے جو انکی شان کے شایان نہوتی تھیں۔ خفا ہوجانے کے بعد پھر ملتے تو بالکل صاف ہوجاتے تھے اور دل بہ مطلق میل نہیں رہتا تھا۔ یہ اُن میں لاکھ خوبیوں کی ایک خوبی تھی۔ مرحوم اگر اپنے فضل و کمال سے کام لیتے تو وہ بہت بڑے آدمی ہوتے، لیکن افسوس کہ حیدرآباد کی گوناگون دل فریبیوں اور مجبوریوں نے اُنکے وقت عزیز کا بہت سا بیش قیمت حصہ غصب کرلیا اور جاہ طلبی کے بکھیڑوں نے وہ الجھاؤ پیدا کیا کہ اس قدر اطمینان نصیب نہوا کہ وہ علمی مشاغل میں اطمینان کے ساتھ مصروفیت رکھتے جسکے وہ ہر طرح موزون اور اہل تھے۔ انسان اگر ٹھنڈے دل سے اپنی زندگی کے واقعات پر نظر ڈالے تو اُسے معلوم ہوگا کہ وہ مقاصد جنکے لئے وہ دن رات سرگردان و حیران رہا، وہ آرزوئیں جنکی خاطر کھانا پینا اور سونا حرام ہوگیا اور وہ کوششیں جنکے لئے اس نے اپنی جان تک کھپادی پانی کے بلبلہ سے زیادہ ناپائیدار اور مکڑی کے جالے سے زیادہ بودی تھیں۔

اور کچھ انھیں کاموں کو بقا حاصل ہے جن پر بہت کم وقت صرف ہوا اور جو شاید محض ضمنی طور پر کئے گئے تھے۔ انسان کی زندگی بہت تھوڑی ہے، بہت مشکل ہے کہ وہ اس چند روزہ حیات میں تحصیل بھی کرے، پایۂ کمال کو بھی پہونچے اور پھر ایسے کام کرے جنھیں بقائے دوام ہو اور خلق خدا کو ان سے فائدہ پہونچے۔ وقت ایک نعمت ہے اور خدا کی دوسری نعمتوں کی طرح انسان وقت پر اسکی بھی قدر نہیں کرتا اور قدر اسوقت ہوتی ہے جبکہ وقت ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ انسان دنیا میں نہیں رہتا مگر اسکے اعمال رہجاتے ہیں لیکن کتنے اعمال ایسے ہیں جنھیں بقا ہو، جو قدر اور وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہوں اور جو لوگوں کے دلوں پر قبضہ رکھتے ہوں۔ مرحوم نے زمانۂ ملازمت اور باقی عمر میں بہت سے کام کئے لیکن اکثر ایسے ہیں جیسے ہوا کا جھونکا کہ آیا اور گیا، لیکن یادگار دنیا میں وہی رہیں گے جن کا اثر دوسروں کے قلوب اور دماغوں تک پہونچے گا اور یہ اُنکی بعض تحریریں ہیں جو اُنکے قلم سے نکلیں ملک میں پھیلیں اور سورج کی روشنی کی طرح سے ایک سرے سے دوسرے سرے تک حیات عالم میں اپنا مفید کام کرتی رہیں گی اور مرحوم کی یادگو اُنکے قدردانوں کے دلوں میں تازہ رکھیں گی۔

۲

تمدن ہند

یہ مرحوم کی آخری کتاب ہے اور یہ بھی تمدن عرب کے مشہور مصنف موسیو لیبان کی تصنیف ہے۔ مرحوم نے ان دو ایسی کتابوں کا ترجمہ کیا ہے کہ

انکا نام بہت عرصہ تک یاد رہے گا۔ کیونکہ یہ دونوں کتابیں اہل ملک کے لئے مفید اور دلچسپ ہیں۔ عربی تمدن کو جس طرح اشاعت اسلام کی وجہ سے خاص وسعت حاصل ہوگئی ہے، اسی طرح ہندی تمدن اپنی قدامت کے لحاظ سے بے نظیر ہے۔ تمدن کی نشو و نما میں ہزاروں مختلف اثرات کام کرتے ہیں جن کا سراغ لگانا امکان سے باہر ہے لیکن ایک ظاہری اور بڑا سبب خود ملک اور اسکی آب و ہوا ہے۔ ہندوستان بلا مبالغہ خلاصہ عالم ہے۔ کیا ہے جو یہاں نہیں ہے، اور کونسی اسکی ایسی ادا اور دلکشی ہے کہ جس کی دنیا بھر دل دادہ و شیدائی نہیں۔ سر پہ سر بفلک پہاڑ کھڑے پہرہ دے رہے ہیں، قدموں کے نیچے بحر زخار موجیں مار رہا ہے، ملک کے ایک حصے میں اسقدر گنجان آبادی ہے کہ تل رکھنے کو جگہ نہیں دوسرے حصے میں لق و دق بیابان پڑے ہیں، آب و ہوا کو دیکھئے تو ایک طرف وہ کڑکڑاتے جاڑے پڑے ہیں کہ دانت سے دانت بجنے لگتے ہیں۔ اور لہو بدن میں جم جاتا ہے، اور دوسری طرف وہ قیامت کی گرمی ہے کہ لہو پسینہ ہوکر بہ جائے، اور پھر بعض مقامات پر وہ اعتدال ہے کہ انسان بھولے سے بھی جنت کی ہوس نہ کرے۔ تہذیب کا یہ عالم ہے کہ ایک جگہ کمال تمدن کی وہ انتہا نظر آتی ہے کہ دنیا کی اعلیٰ سے اعلیٰ تہذیب و تمدن کی آنکھیں نیچی ہو جائیں، اور دوسری جگہ وہ وحشی اقوام آباد ہیں کہ جنھیں دیکھکر حضرت آدم اور انکی اولاد کی طرز معاشرت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جائے۔ مال و دولت اور زر و جواہر کی یہ حالت ہے کہ ابتدا سے اب تک بڑے بڑے تاجداران عالم کی للچائی ہوئی نظریں اس پر

پڑتی رہیں اور خدا ہوس کا بھلا کرے کہ اب بھی بڑے بڑے شہنشاہ کن انکھیوں سے اسے دیکھ رہے ہیں اور سوتے جاگتے اسی محبوبۂ دلربا کے خواب نظر آتے ہیں۔ زمین ہے کہ بے چھیڑے سونا اُگل رہی ہے اور چھوتے ہی جھک اُٹھتی ہے، پیداوار کی وہ بہتات کہ اس ملک کو حدیقۂ عالم اور باغ کائنات کہا جائے تو بجا ہے، ہزاروں قسم کے درخت، جڑ بوٹیاں پھول پھل میوے، اجناس اور غلے اس افراط سے کہ جنکی نظیر دنیا میں نہیں۔ پھر حیوانات کی ویسی ہی کثرت، کہ بھانت بھانت کے جانور بھیرو درندے چرند پرند کہ بجائے خود ایک عجائب خانہ ہے۔ مختلف اقوام اتنی کہ دنیا کی شاید کوئی نسل ایسی ہو کہ اسکی یادگار یہاں نظر نہ آتی ہو، زبانیں اور بولیاں سینکڑوں اور اسقدر مختلف کہ اگر ملک کے ایک حصہ کا آدمی دوسرے حصے میں پہونچ جائے تو اسقدر اجنبی معلوم ہو کہ گویا دنیائے مریخ سے کوئی اُتر آیا ہے۔ مذاہب کی وہ شان کہ دنیا کے تمام مذاہب ایک طرف اور یہاں کے ایک طرف۔ غرض ابتدائے آفرینش سے لیکر اتبک جتنے انقلابات ہوئے، جتنی ترقیاں ہوئیں، جتنے نشیب و فراز پیدا ہوئے، انسان نے جتنے چولے بدلے، جتنی کروٹیں لیں، ان سب کے سچے نشان یہاں اتبک الگ الگ موجود ہیں۔ یہاں آکر تمدن کی سچی تعریف اور اصلی قدر معلوم ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اہل یورپ باوجود اس ترقی و تہذیب کے تمدن کی صحیح تعریف سے قاصر رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمدن ہند کی تاریخ تمدن عالم کی تاریخ ہے اور اسی لئے جو کوشش اسکے متعلق کی جائے وہ قابل قدر اور لائق شکر ہے۔

تمدن ہند کی تاریخ گویا تین ہزار سال کی تاریخ ہوا۔ اسے کئی قرنون میں تقسیم کیا گیا ہے
قرن اول یعنی رگ وید کا زمانہ۔ اسمیں آریون کے زور و قوت اور جنگ و فتح کا آغاز ہے۔ جسمیں وہ ملکیون سے لڑائی بھڑائی میں مصروف رہے۔ یہ لوگ بعد کے ہندوؤن سے بالکل مختلف تھے جو گیان دھیان اور فلسفہ و آلہیات میں مگن رہتے تھے۔ اسوقت کا علمی کام صرف رگ وید کے ۱۰۱۷ گیت ہیں جو اگرچہ مذہبی ہیں مگر اُن سے ابتدائی زندگی کی حالت مترشح ہوتی ہے اور دنیا کے ابتدائی فلسفہ کی جھلک کہیں کہیں نظر آتی ہے۔ یہ گویا پندرہ سو سال قبل مسیح کا زمانہ ہے۔

قرن دوم۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ وہ ستلج تک پہونچے اور گنگا جمنا تک بڑھے۔ اسمین انھون نے اپنے فتوحات کی تکمیل کی اور ملک کے اصلی باشندون کو بالکل مغلوب و محکوم کرلیا۔ اسی زمانہ میں وید تصنیف ہوئے اور کورو اور پانچالون کی جنگ ہوئی۔ یہ زمانہ پندرہ سو قبل مسیح سے ایک ہزار قبل مسیح تک ہے۔

قرن سوم۔ اسمین آریون نے اپنے فتوحات کو اور وسیع کیا۔ یہ زمانہ جنگی اور علمی کارنامون سے ممتاز ہے۔ فلسفہ کا خاص کر زور رہا اور ایک ایسی تحریک کا آغاز ہوا جو دنیا میں ابتک عالم گیر ہے یعنی بدھ مذہب کی بنیاد پڑی۔ اس زمانہ کو ایک ہزار سال قبل مسیح سے تین سو بیس قبل مسیح تک سمجھنا چاہیئے۔

قرن چہارم۔ یہ مذہب بدھ کا زمانہ ہے۔ اسمیں بدھ حکومت اور بدھ مذہب کا زور و شور رہا۔ علوم و فنون کو رونق ہوئی۔ شاعری، بلد

صرف ونحو، قانون، نجوم، فلسفہ وغیرہ کی تالیف وتصنیف کا بازار گرم ہوا اور ہندو تمدن جنوبی ہند وسیلون وغیرہ میں پھیلا۔ یہ زمانہ ۳۲۰ قبل مسیح سے ۵۰۰ سن عیسوی تک شمار کیا جا سکتا ہے۔

قرن پنجم۔ جدید برہمنی مذہب پھر ابھرتا ہے اور بدھ مذہب کو مغلوب کرلیتا ہے۔ یہ پولٹیکل اور علمی کارناموں کا زمانہ ہے جو ۵۰۰ سے ۱۰۰۰ سن عیسوی تک رہا یعنے محمود غزنوی کے حملے تک۔

قرن ششم۔ مسلمانوں کا عہد

قرن ہفتم۔ یورپی عہد۔

ہند کے قدیم تمدن پر اگر ابتدا سے غور کیا جائے تو تحقیق ہو سکتا ہے کہ انسانی تمدن کیونکر بنتا، بڑھتا، نشو ونما پاتا اور پھلتا پھولتا ہے۔ اول اول جب آریا خانہ بدوش گلہ بانوں کی طرح ملک میں داخل ہوئے اور پھر آخر میں رفتہ رفتہ سارے ملک میں چھا گئے اور انکی معاشرت، نظام سیاست، علم وفضل، اور قوت وعظمت کو عروج وکمال حاصل ہوا جب اول سے آخر تک یہ تمام قرون اپنی مختلف نیرنگیوں کے ساتھ ہماری نظر سے گزرتے ہیں تو سب سے پہلے قدیم خیالات، معتقدات اور توہمات کا دہ خاکہ آتا ہے کہ انپر غور کیا جائے تو انکی دہند میں واقعات کی جھلک نظر آتی ہے اور یہ پتہ لگ سکتا ہے کہ انسان جب تمدن کی اول سیڑھی پر قدم رکھنے کو ہوتا ہے تو اسکی کیا حالت اور حیثیت ہوتی ہے اور آئندہ مدارج کیونکر طے کرتا ہے۔

ہمیں اس زمانہ کی حالت ویدوں سے کیا معلوم ہوتی ہے؟ آریہ

جب شمالی ہند میں داخل ہوئے تو انھیں اپنے پیشرو تورانیون اور یہان کے اصلی وحشی باشندون سے مقابلہ کرنا پڑا اور مدت تک اسی جنگ وجدل میں بسر ہوئی آخر رفتہ رفتہ دشمن پسپا ہوئے اور آریاؤن کا قبضہ شمالی ملک پر ہوگیا۔ انکی حالت اسوقت ویسی ہی تھی جیسی ایک جنگجو فاتح قوم کی ہوتی ہے۔ فاتح وید کی سوکتون میں اپنی فتح ونصرت کے گیت گاتے، حصول دولت وثروت اور پامالی دشمن کی دعائین مانگتے ہیں۔ اسوقت نہ مندر تھے نہ بت۔ اور سوائے آریاؤن اور اصلی باشندون کے کوئی زات پات کا امتیاز نہ تھا۔ وہ آگ، پانی، آسمان اور سورج سے التجائین کرتے اور انکے بھجن گاتے ہیں ایک ایسی قوم کے لئے جو دنیا میں اول اول میدان تمدن میں قدم رکھ رہی ہے یہ بات کوئی خلاف عقل یا خلاف فطرت نہیں ہے۔ مثلاً جب وہ آندھیون سے التجا کرتے ہیں کہ تم تھم جاؤ یا آسمان سے گڑ گڑا کر یہ کہتے ہیں کہ مینھ برساؤ یا سورج سے درخواست کرتے ہیں کہ نکل اور چمک تو یہ ایسی باتین ہیں جواب بھی بعض سادہ لوح فرقون میں پائی جاتی ہیں، البتہ یہ ضرور ہے ہندوستان میں آکر جب انھون نے قدرت کے عظیم الشان مظاہر دیکھے تو وہ اُنکے آگے پرستش کیلئے جُھک گئے جو ایک امر فطرتی ہے۔

یہان ویدی زمانے کے دیوتاؤن کے متعلق مختصر سا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کیا آریہ اس وقت خدا کو مانتے تھے؟ اُنکا خدا ایک تھا یا کئی؟۔ رگ وید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کا مفہوم اُنکے

ہان نہیں ہے ۔ وہ متعدد دیوتاؤن کی پرستش کرتے تھے ۔ ان دیوتاؤن کی تین قسمتین کی جاسکتی ہیں (۱) اکاش کے دیوتا ۔ (۲) پرتھوی یعنی زمین کے دیوتا (۳) پانی کے دیوتا ۔ اور انمیں ہر ایک کے گیارہ گیارہ تھے گویا کُل ۳۳ دیوتا ہوئے اور بعضون نے ۳۳ سے تین ہزار تین سو تینتیس تک پہونچا دئے ہیں ۔ بعض انمین سے سود مندی اور فائدہ کے خیال سے دیوتا مانے گئے اور بعض خوف اور ڈر کی وجہ سے ۔ مثلاً ازروئے رگ وید اگنی (آگ) برق سے آئی اور دو لکڑیون کی رگڑ سے پیدا ہوئی ۔ آگ کا دریافت کرنا ابتدائے تمدن کے لئے نہایت ضروری ہے اور یہ ترقی کا ممد و معین ہے لوگ بجائے کچی چیزین کھانے کے پکا کے کھانا شروع کرتے ہیں ۔ اسکی مدد سے وہ رات کو بھی کام کرسکتے ہیں ۔ جاڑون میں وہ انھیں اکڑ کر مرجانے سے بچاتی ہے اور جو سورج اور صبح صادق میں نظر آتی ہے اور زمین و آسمان کو روشن کرتی ہے ۔ لہذا کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ ایک ایسی شے کو جو آسمان سے زمین پر آئی اور انسان کے اتنے کام آتی ہے دیوتا نہ سمجھین ۔ آندھی اور رعد و برق خوف کی وجہ سے دیوتا مانے گئے وغیرہ وغیرہ ۔ لیکن سب سے بڑا دیوتا اندر ہے جو نیلے آسمان کا دیوتا، بادلون کا جمع کرنے والا، مینھ کا برسانے والا، گرج کا کڑکانے والا، تاریکی کا مٹانے والا اور روشنی کا لانے والا اور قوت، حیات اور تازگی بخشنے والا ہے ۔

لیکن ان سب کے پیچھے ایک خیال ہے جو حیات سے پہلے ہے اور جسکا نام مذہب ہے ۔

ویدی زمانہ زیادہ تر اسلیئے قابل مطالعہ ہے کہ یہاں ہمیں زبان وخیالات کی پہلی صورت، مذہب وتوہمات ورسوم کی بنیاد اولین فلسفیا یہ خیالات کی ابتدائی جھلک اور خاندانی دیہی اور سیاسی زندگی کی سعی نخستیں نظر آتی ہے۔ لیکن ان سب کی بنیاد مذہب پر ہے جو فطرت کی سب سے پہلی تعبیر ہے۔ اور مذہب کی نشو نما کی ابتدائی حالت جیسی یہاں معلوم ہوتی ہے وہ کسی دوسرے ملک کے لٹریچر میں نظر نہیں آتی۔ یہودیوں، یونانیوں اور رومیوں کے ہاں یہ مفقود ہے۔ جو لوگ انسان کے ابتدائی حالات وخیالات کی تحقیق کیلئے وحشی اقوام کا مطالعہ کرتے ہیں انھیں رگ وید کا مطالعہ بھی ناگزیر ہے۔

ایک سوال اسکے متعلق تحقیق طلب ہے اور وہ یہ کہ جب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ رگ وید کا زمانہ ۱۵۰۰ برس قبل مسیح یعنی اب سے تین ساڑھے تین ہزار سال پہلے کا تھا تو کیا آریا اسوقت فن تحریر سے واقف تھے؟ اگر نہیں تھے تو یہ کب معرض تحریر میں آیا اور نیز تحریر کا رواج آریاؤں میں کب سے شروع ہوا؟ اسمیں کچھ شک نہیں کہ آریا لوگ اسوقت فن تحریر سے بالکل ناآشنا تھے اور چوتھی صدی قبل مسیح سے اول ہندوستان میں تحریر کا کہیں پتا نہیں ملتا۔ ہندوستان بھر میں کہیں کوئی کتبہ ایسا نہیں پایا گیا۔ جو تیسری صدی قبل مسیح کے وسط سے قبل کا ہو۔ سب سے قدیم کتبے زمانۂ بدھ کے ہیں جو راجہ اشوک کے عہد میں نصب کئے گئے تھے یہ راجہ سلوتس کا ہمعصر تھا اور اسکا سفیر راجہ کے دربار میں کئی سال تک رہا۔ اس راجہ نے اپنی وسیع سلطنت میں مختلف مقامات پر کتبے نصب کرائے اور اسکی حکومت کا

زمانہ ۲۵۹ - ۲۲۲ (ق م) تک تھا۔ ان کتبوں کی نسبت یہ بات دلچسپی سے خالی نہوگی کہ یہ دو قسم کے ابجدوں میں لکھے ہوئے ہیں۔ ایک تو سیدھی طرف سے بائیں جانب کو جیسے فارسی عربی لکھی جاتی ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ ابجد شامی ہے اور ہندی ابجد وہیں سے ماخوذ ہے۔ اور دوسری بائیں جانب سے داہنی جانب کو جیسے ہندی یا انگریزی وغیرہ مگر یہ بھی شامی ابجد سے حاصل کی گئی ہے مگر اُسے حسب ضرورت اپنے طور پر بنا لیا گیا ہے یہ دوسری قسم کی ابجد تمام ہندی ابجدوں کا ماخذ ہوئی۔ اس سے پورے طور پر یہ ثابت ہے کہ فن تحریر کتبوں تک میں تیسری صدی (ق م) سے قبل استعمال نہیں ہوا تھا میگھاستینز (سفیر سلوقس) صحیح لکھا ہے کہ ہندی لکھنا نہیں جانتے اور اُنکے قانون تحریر میں نہیں آئے۔ [1]

جب یہ ثابت ہے کہ چوتھی صدی (ق م) سے پہلے فن تحریر کا رواج ہندوستان میں نہیں ہوا تو ظاہر ہے کہ وید سینہ بہ سینہ چلے آئے اور قریباً تین ہزار سال تک حافظہ میں محفوظ رہے کیونکہ سب سے قدیم نسخہ رگ وید کا ۱۵۰۰ء کا ہے۔ اہل یورپ کے لئے شاید یہ امر باعث حیرت و تعجب ہو مگر ہم ایشیائیوں کے لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ اسوقت ہندوؤں میں وید اور مسلمانوں میں قرآن حفظ کیا جاتا ہے اور مطبوعہ نسخوں سے نہیں بلکہ اُن اساتذہ سے جنھوں نے سلسلہ بہ سلسلہ اپنے اساتذہ سے اسی طرح حفظ کیا تھا۔

چونکہ یہ بات مصنف تمدن ہند سے رہ گئی تھی لہذا یہاں اسکا لکھ دینا مناسب معلوم ہوا۔ لیکن اسکے ساتھ ہی ایک دوسری بات کا بیان کردینا

[1] انڈیا، پروفیسر میکس مولر۔

جو اس واقعہ سے مستنبط ہوتی ہے فائدہ اور دلچسپی سے خالی نہوگا۔ ہم ابھی ذکر کر چکے ہیں کہ قدیم سے قدیم کتبہ اشوک نواسہ چندر گپت کے عہد کا ہے؟ اسکی حکومت ۲۵۹ - ۲۲۲ قبل مسیح تک رہی۔ لیکن اِن کتبون کی زبان کیا ہے؟ کیا وہ ویدک سنسکرت ہے؟ ہرگز نہیں۔ کیا وہ برہمنون اور سوترون کی مابعد کی سنسکرت ہے؟ بالکل نہیں۔ بلکہ یہ کتبے مقامی بولیون میں لکھے ہوئے ہیں جو اُسوقت ہندوستان میں بولی جاتی تھین اور وہ نحوی سنسکرت سے بالکل مغائر ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ (۱) قدیم ویدی سنسکرت تیسری صدی (ق م) سے قبل ہی رخصت ہو چکی تھی (۲) مابعد کی علمی ونحوی سنسکرت کا رواج اُٹھ چکا تھا اور لوگ اسلئے بولنے اور سمجھنے سے قاصر تھے۔ غرض یہ کہ سنسکرت بُدھ کے مبعوث ہونے سے قبل اس ملک کی زبان نہیں رہی تھی۔ اور اسلئے قدیم ویدی سنسکرت کا شباب بدھ مذہب کی پیدائش سے کہین پہلے ہو چکا تھا۔ بُدھ غالباً سنسکرت جانتا ہوگا لیکن شاگردون کو سخت تاکید تھی کہ وہ اسکی تعلیم کی تلقین لوگون کو ملک کی عام زبان مین کرین تاکہ وہ اس سے فائدہ اُٹھا سکین۔

ویدی زمانہ کے بعد ایک دوسرے زمانہ کا آغاز ہوا جسکے خاص اور امتیازی کارنامے یہ تھے۔

(۱) جنگ وجدل اور فتوحات۔

(۲) برہمنون کی قوت اور ذات کا زور۔

(۳) معاشرتی اور علمی ترقی۔

(۴) اپنشد یعنی روحانی تعلیم۔

اس زمانہ میں آریہ ستلج کو عبور کرکے گنگا جمنا کے دوآبہ اور گنگا کی میدانوں میں آئے، انھوں نے اصلی باشندوں سے ایک مدت تک لڑائی بھڑائی کرکے انھیں نکال باہر کر دیا یا غلام بنالیا اور اس زرخیز خطے میں بخوبی آباد ہو گئے۔ اسمیں شک نہیں کہ انھیں اس زمانہ میں جنگ و جدل کرکے اپنی فتوحات کو وسیع کرنا پڑا۔ لیکن جب وہ یہاں کے باشندوں کو مغلوب کر چکے، ملک فتح کرلیا اور آبادیاں قائم کرکے انھیں "ہندوا" چکے تو انھوں نے معاشرت و تمدن کی طرف توجہ کی دنیا میں کون سا ملک اور کون سی قوم ہے جو بغیر جنگ و جدل اور بغیر تلوار اٹھائے اس منزل تک پہونچی ہو۔ اگرچہ یہ لوگ اپنے مخالفون پر غالب آچکے تھے لیکن ابھی تک ان میں جنگجوئی کا جوش باقی تھا جو باہمی مخاصموں میں بھڑک اُٹھا۔ چنانچہ مہابھارت اور رامایں کے جنگ نامے اس زمانے کی یادگار ہیں۔ اگرچہ یہ کتابیں مبالغہ سے مملو اور دور از کار باتوں سے بھری ہوئی ہیں تاہم اس زمانہ کی معاشرت کا ضرور پتہ لگتا ہے۔ رامایں تاریخی لحاظ سے بالکل ہیچ و پوچ ہے۔ رام اور سیتا وغیرہ خیالی ہیرو ہیں اگرچہ حسن نظم و بیان نے انھیں واقعی اشخاص قرار دیا ہے اور ہندوستان میں سب ہندو مرد عورت انھیں سچ مچ کے تاریخی اشخاص سمجھتے ہیں اور کتاب کے اخلاقی نتیجہ سے متاثر ہوتے ہیں۔ یہ کتاب مہابھارت کے بعد کے زمانے کی ہے مگر عام طور پر اُسے قدیم زمانہ سے منسوب کیا جاتا ہے۔ غرض یہ زمانہ دیکھا جائے تو برہمنوں کا زمانہ ہے۔ نظم و نسق سلطنت، جنگ و صلح، معاشرت و مذہب، علوم و فنون ہر شے میں برہمن پیش پیش ہیں اور ہر جگہ انھیں کا زور ہے۔

اس عہد میں ہندوؤن نے بہ نسبت ویدی زمانہ کے ہر شعبہ میں بہت کچھ ترقی کی بادشاہی ٹھاٹھ، عیش وعشرت کے سامان، معقول عمارتین ہر طرف نظر آنے لگین اور انتظام مملکت، عدالت، زراعت، فن جنگ، قانون، صرف ونحو، منطق فلسفہ، ہندسہ، نجوم، مختلف پیشون اور علم ادب کے بعض شعبون میں نمایان ترقی ہوگئی۔ اس زمانے کے کارنامون میں اپنشد کی تصنیف ہے جو ایک قسم کا فلسفہ یا تصوف ہے اور جو اُس زمانے کی عام روش سے بالکل نرالی چیز ہے جس پر آیندہ فلسفہ مذہب یا تصوف کی بنیاد قائم ہوئی۔ اپنشد بہت سے ہین اور مختلف علمار کی تصنیف سے ہیں۔ اسکی تعلیم کا اصل اصول ایک عالم گیر روح ہے جو سب میں ساری ہے اسمین اور توحید میں فرق ہے، توحید میں خالق اور مخلوق الگ الگ ہیں مگر اپنشد کی تعلیم میں خدا ایک عالمگیر ذات ہے، باقی سب اسی سے ہے یا اُسکا جزو ہے اور اسمیں مل جائے گا اور اس سے علحدہ ہستی نہیں رکھتا۔ اُسے مذہب ہمہ اوست سمجھنا چاہیئے۔ یہی اصول ہندو فلسفہ کی جان ہے جو آگے چل کر نشو ونما پاتا اور یوگ اور ویدانت میں نئے اور لطیف پہلوؤن سے ظاہر ہوتا ہے۔ اسکے بعد دوسرا اصول تناسخ کا مسئلہ ہے۔ جو اس وقت کے بعد سے ہندو فلسفہ اور مذہب کا رکن رکین ہوگیا۔

لیکن اس زمانے کا امتیازی مسئلہ ذات ہے۔ ذات کا امتیاز دنیا میں ہر جگہ تھا اور اب بھی پایا جاتا ہے خصوصاً تاریخ روم میں یہ فرق نمایان طور پر معلوم ہوتا ہے۔ وہان کھانے پینے اور شادی بیاہ کے معاملے میں امراد عوام میں وہی سدِ سکندری حائل تھی جسے ہم ہندوؤن میں ذات کہتے ہیں

اور کیا اب یورپ میں وہی امتیاز اور فرق نہیں ہے ؟ مگر بات اتنی ہے کہ وہان یہ امتیاز بدلتا رہتا ہے اور ایک حالت پر قائم نہیں رہتا کیونکہ اسکا دار مدار سوشل حالت پر ہے مگر ہندی ذات کا مدار مذہب پر ہے اور اسلئے وہ اٹل اور قائم رہنے والی ہے۔ اسمین شک نہیں کہ امارت و غربت، شرافت و رذالت کے امتیازات ہر جگہ تھے اور ہیں مگر یہ آتے اور جاتے ہیں اور پرچھائین کی طرح بدلتے رہتے ہیں، یہان تک کہ غلامی سی شے جس کی جڑین مشرق سے مغرب تک دنیا کے تمام مختلف تمدنون میں پھیلی ہوئی تھین اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ پتال تک پہونچ گئی ہیں آخر دنیا سے اُٹھ گئی، مگر نہ اُٹھی تو یہ ذات کی غلامی۔ درحقیقت ہندوون کے تمدن پر یہ ایسا بُرا دھبا ہے کہ گویہ ملک ہزار ترقی کر جائے مگر یہ نظرون میں ہمیشہ کھٹکتا رہے گا۔ بدھ مذہب اور اسلام نے مساوات اور اخوت کا ڈنکا بجایا، ذات سے بہت کچھ بیزاری ظاہر کی اور اگرچہ انکا قیام صدیون تک رہا مگر کچھ نہ ہو سکا اور ذرا ظہور اصلاح ہوئی بھی تو وہ برائے نام اور عارضی تھی۔ یہ سچ ہے کہ ذات کے امتیاز سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ کم سے کم آریاؤن (برہمنون) کی نسل مخلوط نہیں ہوئی لیکن جس حالت میں کہ نیچ ذات والے رکھے گئے ہیں اور جس تنفر اور حقارت کا برتاؤ ان سے کیا جاتا ہے وہ نہایت شرمناک ہے۔ نیچ قوم یادگار ہے فاتح کے جبر اور مفتوح کی مظلومی کی۔ غلامی ہر جگہ سے اُٹھ گئی مگر یہ غلامی جو سب سے قدیم ہے، مذہب کے پردے میں اب تک باقی ہے۔ علاوہ ذات کی اُلجھن کے ایک بڑی مصیبت اس زمانہ میں یہ تھی کہ برہمنون کا زور

تمدن کے ہر شعبہ میں روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ جس طرح کھڑے پانی پر کائی اور درخت پر کاس بیل چھا جاتی ہے اسی طرح برہمن بھی بے طرح تمام ہندوؤں اور انکے نظامات پر چھائے ہوئے تھے۔ اور خاص کر مذہب میں تو وہ افرا تفری مچا رکھی تھی کہ خدا کی پناہ۔ مختلف عبادتوں نئی نئی قسم کی پرستشوں، طرح طرح کے چڑھاووں، منتوں اور اعمال کا ایک ایسا مسلسل تار بندھا ہوا تھا کہ اس سے چھٹکارا پانا ایسا ہی محال تھا جیسے مکڑی کے جالے سے غریب مکھی کا۔ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے کسی وقت بیجان رسوم اور اکتا دینے والے اعمال سے فرصت نہ تھی۔ گویا یہی مذہب تھا یہی عبادت تھی اور یہی معاشرت اور اسکا حاصل اور یہی راہ نجات تھی۔ اور طرہ یہ کہ دن بدن یہ زنجیریں اور کڑی ہوتی جاتی تھیں اور انمیں وہ نزاکتیں اور باریکیاں پیدا کی جاتی تھیں کہ یہ نام کا مذہب وبال جان ہو گیا تھا۔ ان بیجا اور حوصلہ شکن قیود اور جکڑ بند کی شدت سے لوگ عاجز آگئے اور صبر و تحمل کا پیالہ لبریز ہو گیا اور سختی اس انتہا کو پہونچ گئی جبکہ زنجیریں خود بخود تڑخنے لگتی ہیں۔ آخر وہ وقت آیا کہ اس طوفان بے تمیزی میں تزلزل پیدا ہوا جابروں کے حواس پراگندہ ہوئے اور قیدیوں کی بیڑیاں کٹ کٹ کے گرنے لگیں۔ اور وہ دھند جو ملک پر چھائی ہوئی تھی آفتاب صداقت کے طلوع ہوتے ہی کافور ہو گئی۔ بعثت بدھ علیہ السلام نے ایک نئی روح پھونکدی اور ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ تمام عالم میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اور اس سرزمین پر اس رحمت باران کا نزول ہوا جس کا پیمان پتا پتا اور ذرہ ذرہ تشنہ لب تھا۔ اس نے

مردہ دلوں کو شگفتہ کر دیا، مایوسوں کو آس دی، امیر و غریب، برہمن، سودر، سب کو ایک نظر سے دیکھا، مساوات اور اخوت کی صلائے عام دی اور یہی اسکی کامیابی کا بڑا راز تھا۔ جو لوگ برہمنوں کے سخت شکنجے میں نیم جان ہو رہے تھے انکی جان میں جان آگئی، ذات پات کا امتیاز اٹھ گیا، ویدوں کے دیوتا اور برہمنوں کے مہمل اعمال اور بے معنی ریاضتیں بالائے طاق رکھ دیں۔ اسکی عام ہمدردی، ذاتی نیکی اور نیکی کی تلقین نے سب کو برابر کر دیا اور بڑے بھلے چھوٹے بڑے سب اسکی طرف جھک گئے۔ اسکی تعلیم کا ماحصل یہ ہے کہ زندگی ایک مصیبت ہے اور زندگی اور اس کی لذات کی خواہش اس مصیبت کا باعث ہیں۔ اس خواہش کا مٹانا مصیبت کا کم کرنا ہے اور یہ خواہش پاک زندگی سے مٹ سکتی ہے۔ ہمیشہ صداقت، نیکی، ہمدردی، مہربانی اور خیر پر قائم رہنا چاہیئے۔ اور بڑے جذبات اور نفسانی لذات پر غالب آنا چاہیئے۔ غرض تزکیہ نفس اس تعلیم کا بڑا اصول ہے۔ اس دنیا میں پاک اور نیک زندگی بسر کر کے بلحاظ سزا و جزا تزکیہ نفس حاصل کرنا اسکا اصل مقصد ہے۔ اور یہی بے گناہ اور پاک زندگی نروان ہے۔ دنیا میں اول بار بدھ نے یہ تعلیم دی کہ انسان بلا احتیاج دیوتاؤں اور خدا کے اسی زندگی میں نجات حاصل کر سکتا ہے۔ اور اس طرح اس نے انسان کا رتبہ بڑھا دیا۔

بدھ ایک طرح سے تناسخ کا قائل ہے لیکن اسکے اور برہمنوں کے تناسخ میں فرق ہے۔ بدھ روح کا قائل نہیں اور جب روح نہیں تو تناسخ کیسا اسکا جواب اسکے ہاں یہ ہے کہ انسان کے اعمال فنا نہیں ہو سکتے۔

جب انسان مرجاتا ہے تو اعمال کے لحاظ سے نیا وجود پیدا ہوتا ہے۔ اسکے ہاں آیندہ کی سزا و جزا کوئی چیز نہیں اور نہ اس کے ہاں جنت کا وعدہ اور جہنم کا وعید ہے۔ پاک زندگی سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں اور یہی نروان یا نجات ہے۔ نیکی اپنا صلہ خود ہے اور پاک زندگی مذہب کا اعلیٰ اور آخری مقصد ہے۔ اگر زندگی میں نروان حاصل نہوا تو کرم یا اعمال کے رو سے وہ نئے جنم لے گا یہانتک کہ تزکیہ نفس کامل ہو اور نروان حاصل ہو جائے۔

تین صدی تک اس تعلیم کی تلقین ملک میں ہوتی رہی لیکن نہ تو چندرگپتا اور نہ اُسکے بیٹوں نے اس مذہب کو قبول کیا مگر اسکا جانشین بندوو سار اجو ۲۶۰ ق م میں گدی نشین ہوا اس مذہب کے حلقے میں آیا اور اسکا بہت بڑا حامی اور داعی ثابت ہوا جس نے نہ صرف ہندوستان میں بلکہ ہندوستان کے باہر بھی اسکی دعوت دی۔ راجہ اشوک کا نام والگا سے جاپان اور سائبیریا سے سیلون تک مشہور اور عزت سے لیا جاتا ہے۔ اسکے احکام سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنے دعاۃ ہندوستان کے مختلف صوبوں میسور، مدراس، پنجاب، کشمیر، ٹراونکور اور انکے علاوہ سیلون، شام، مصر، مقدونیہ وغیرہ میں بھیجے۔ خود اسکی سلطنت تمام شمالی ہند میں پھیلی ہوئی تھی اور اسکے کتبے دہلی، الہ آباد، پشاور اور گجرات، اڑیسہ اور میسور میں پائے جاتے ہیں۔ اس نے اپنے بیٹے کو سیلون بھیجا اور مہندا نے وہاں کے بادشاہ اور رعایا کو بدھ مذہب سے مشرف کیا۔ یہانتک کہ یہ مذہب سیام اور جاوا میں بھی پہونچا۔ دوسری صدی قبل مسیح میں بدھ مذہب کی کتابیں شہنشاہ چین کے پاس پہونچیں اور ایک

دوسرے شہنشاہ چین نے ۶۲ء مسیحی میں اور کتابیں منگوائیں اور بدھ مذہب وہاں پھیلنا شروع ہوا یہانتک کہ چوتھی صدی مسیحی میں وہاں کا عام مذہب ہوگیا چین سے کوریا پہونچا (۳۷۲ء) اور وہاں سے جاپان (۵۵۲ء) اور کوچن چین، فارموسا، منگولیا میں چوتھی اور پانچویں صدی میں گیا۔ اور کابل سے اس مذہب نے تاشقند، بلخ و بخارا تک رسائی حاصل کی۔

علاوہ بدھ کی تعلیم کے جسمیں نیکی، عام ہمدردی اور تزکیہ نفس کی تلقین تھی بدھ مذہب کی اشاعت اور ترقی کا بڑا باعث یہ خیال کیا جاتا ہے کہ راجہ اشوک نے اس مذہب کو اختیار کر لیا جسکی وجہ سے یہ راج دہرم (یعنی سلطنت کا مذہب) ہوگیا اور اسمیں شک نہیں کہ اس نے اسکی اشاعت میں بڑے جوش اور شدومد سے کام لیا۔ لیکن درحقیقت دیکھا جائے تو یہی واقعہ اسکے ضعف کا بھی باعث ہوا، کیونکہ شاہی اثر سے لوگ کثرت سے برائے نام اسمیں داخل ہوگئے اور خصوصاً اُن صوبجات سے جو نئے نئے سلطنت میں شریک ہوئے تھے اور جہاں ہندوؤں نے بہت کم ترقی کی تھی۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ اس عظیم الشان اور عالمگیر اصلاح، میں بجائے قوت کے ضعف پیدا ہونے لگا اور قدیم خالص مذہب کا یہ ضعف توہموں کے پسند خاطر ہوا اور رفتہ رفتہ بوجہ اس اختلاط کے بدھ مذہب اور برہمنی مذہب میں فرق کم ہوتا گیا۔ روح کے عقیدہ میں پھر ترقی ہونے لگی اور عام پسند رسوم اور توہمات کا رواج خود بدھوں میں بڑھتا گیا۔ اصلی خیالات کی جگہ جدید خیالات نے لینی شروع کی، یہانتک کہ ویدی دیوتا اور چڑھاوے

وغیرہ کی رسوم بھی رخصت ہوگئیں لیکن اسکے ساتھ ہی بدھ مذہب کو بھی زوال آگیا۔ یہ زوال ساتویں صدی عیسوی سے شروع ہوا اور جدید برہمنی مذہب نے پھر اپنا زور قائم کرلیا۔ چنانچہ گیارھویں صدی میں صرف کشمیر اور اڑیسہ میں رہگیا اور مسلمانوں کے آنے سے قبل ہندوستان سے رخصت ہوگیا۔ اور اب ایک طرف صرف نیپال میں اور دوسری طرف سیلون میں پایا جاتا ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ بدھ مذہب بہ نسبت اپنے جنم بھوم کے غیر ممالک میں زیادہ پھیلا اور قائم رہا۔ افغانستان، نیپال، مشرقی ترکستان، تبت، منگولیا، منچوریا، جاپان، چین، مشرقی جزائر ہند، سیام، برہما، اور سیلون سب اسکے زیرنگین تھے اور اب بھی دنیا کی آبادی کا ایک تہائی حصہ اسکے نام لیواؤں میں سے ہے۔ اور اسکی خانقاہیں کاسپین سے بحر کاہل تک برابر چلی گئی ہیں اور سلطنت روس کے حدود تک پہونچتی ہیں۔

اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ یہ مذہب دنیا کی عظیم الشان تحریکات اور حیرت انگیز انقلابات میں سے ہے اور گو اسے مدت ہوئی ہندوستان سے دیس نکالا مل چکا ہے لیکن کہا جاتا ہے کہ اسکی یادگار جین مذہب میں اب تک باقی ہے جو محقق نہیں۔ مگر درحقیقت اسکی یادگار کسی خاص مذہب یا فرقہ میں نہیں بلکہ اہل ملک کے مذہب و معاشرت اور اخلاق میں پائی جاتی ہے۔

غور کرنے سے معلوم ہوا کہ ہندو مذہب اور ہندوؤں پر مفصلہ ذیل خاص اثرات اس مذہب کے ہوئے جو اس وقت بھی پائے جاتے ہیں۔

(۱) طبائع میں خاص نرمی، لینیت اور انکسار پیدا ہوا جس کا اثر نہ صرف

انسانوں کے باہمی تعلقات پر ہوا بلکہ بے زبان حیوانوں تک پہونچا۔

(۲) بدھ سے قبل ہندوؤں کے تمام خیالات اور علوم کا دار و مدار ویدوں پر تھا لیکن بدھ کے بعد انکے فلسفہ اور علوم کا تعلق ویدوں سے بالکل اُٹھ گیا۔ یہاں تک کہ جدید برہمنی مذہب (پُرانی مذہب) ویدوں کا مذہب نہ تھا بلکہ ایسے دیوتاؤں اور ریتوں کی پرستش رائج ہو گئی جن کا ویدوں میں ذکر تک نہیں۔

(۳) ذات پات کا امتیاز اُٹھ جانے سے مختلف فرقوں میں میل جول بڑھ گیا اور مساوات کا خیال پیدا ہوا اگرچہ ذاتیں قائم رہیں مگر جدید برہمنی مذہب نے اسے پھر دبا دیا۔

(۴) گوشت خوری کا رواج اُٹھ گیا۔

(۵) لوگوں میں جنگ جوئی کا مادہ کم ہو گیا۔

زمانۂ بدھ کی ایک اور خصوصیت بھی ہے جو ابتک اسکی یادگار کے طور پر قائم ہے۔ وہ اس زمانہ کی تعمیر اور سنگ تراشی ہے جو ہندوستان کے مختلف حصوں میں پائی جاتی ہے۔ اور درحقیقت ان لوگوں نے اس فن کو پایۂ کمال تک پہونچا دیا تھا۔ اس زمانہ سے قبل پتھر صرف فصیل، شہر یا پلوں وغیرہ کی تعمیر میں استعمال ہوتا تھا لیکن بدھ کے زمانہ سے بڑی بڑی عمارتوں میں کام آنے لگا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ فن تعمیر ہندی اور انکا طبع زاد ہے لیکن اس میں بھی کلام نہیں کہ بعض بدھی عمارتوں میں جو پنجاب میں اب دریافت ہوئی ہیں صاف طور سے یونانی فن عمارت کے آثار بھی پائے جاتے ہیں۔ بدھ مذہب نے ہندوؤں کو جہاں اور چیزیں ارث میں دی ہیں وہاں فن عمارت بھی ہے

بدھی اور ہندوانی عمارتوں میں فرق یہ ہے کہ بدھی پہاڑ کو کھود کر غار بنلتے اور اس میں اپنا کمال سنگ تراشی و فن تعمیر دکھاتے لیکن ہندو پتھر صاف کر کے پہاڑ کے روبرو اپنی عمارت تیار کرتے تھے۔ یہ فرق خاص کر ایسے مقامات پر یاد رکھنے کے قابل ہے جہاں جہاں ساتھ ساتھ اُس زمانے کی عمارتیں موجود ہیں جبکہ بدھ مذہب برہمنی مذہب میں محو ہو چلا تھا اور بت پرستی عام ہو گئی تھی۔

بلحاظ علوم کے اگرچہ بدھ کا زمانہ کوئی خاص امتیاز نہیں رکھتا لیکن ایسا بھی نہیں کہ ناقابل توجہ ہو۔ پتنجلی کے یوگ اور دیاسا کے ویدانت کا آغاز اسی زمانے میں ہوا اگرچہ بدھ مذہب کو اس سے کوئی خاص تعلق نہیں منو کا شاستر بھی اسی زمانہ کی یادگار ہے۔ لیکن بڑی چیز علمی لحاظ سے اس زمانہ کی یہ ہے کہ علم نجوم میں معتدبہ کامیابی ہوئی اور اس کامیابی میں یونانیوں کا بھی حصہ ہے جنھوں نے اس میں خاص امتیاز حاصل کیا تھا۔ ہندوؤں نے اس فن میں اُن سے بہت کچھ اکتساب کیا۔ طب کو بھی ترقی ہوئی کیونکہ بدھ مذہب کے اثر سے انسانوں اور حیوانوں کے لئے ملک میں جا بجا شفاخانے قائم کئے گئے تھے۔

نیز اس زمانے میں علم کا چرچا ضرور تھا۔ ہیون سانگ مشہور چینی سیاح نے اپنے سفرنامے میں بعض بدھ دارالعلوموں کا ذکر کیا ہے۔ نالندہ کی خانقاہ خاص طور پر قابل ذکر ہے جس میں ایک بہت بڑا دارالعلوم تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ یہاں کئی ہزار بھکشو (بدھ درویش) تھے جو بلحاظ علم وفضل

خاص امتیاز رکھتے تھے، لوگ انکی بہت وقعت و توقیر کرتے تھے اور یہ دن رات بحث مباحثہ اور تکرار علمی میں مصروف رہتے تھے۔ دور دور کے علما و فضلا وہاں آکر شریک ہوتے اور نالندہ کی شرکت سے شرف حاصل کرتے تھے۔ نالندہ کا طالب علم ہونا یا وہاں سے تعلق رکھنا باعث عزت سمجھا جاتا تھا۔ گویا اسے وہی عزت تھی جو کبھی مسلمانوں میں قرطبہ و بغداد یا فرانس میں کلونی اور کلرو کو حاصل تھی۔ یا جیسے آج کل علی گڑھ کالج کے طلبا کو حاصل ہے۔

وہ مذہب جو اخلاق و خیالات کی اصلاح کے لئے آیا تھا اور جس نے انسان کا رتبہ دیوتاؤں سے بڑھا دیا تھا اور جس نے اپنی پاک تعلیم کے سامنے مہمل مذہبی رسوم اور دیوتاؤں بلکہ روح و خدا تک کو بھی بالائے طاق رکھ دیا تھا آخر وہ برہمنی توہمات اور باطل پرستی کا ایسا شکار ہوا کہ بت پرستی خود اسکا شعار ہوگئی، بدھ دیوتا مانا گیا اور دوسرے بتوں کی طرح اسکی بھی پرستش ہونے لگی اور رفتہ رفتہ برہمنی مذہب نے اسے اس ملک سے ایسا ناپید کیا جیسے یہ کہیں کہ کسی شئے کا بیج مارا گیا۔ برہمنی مذہب کو پھر عروج ہوا اور اس عروج کے ساتھ اس نے اپنے قیود کی جکڑبند کو اور سخت کردیا۔ اس جدید برہمنی دور کو پرانوں کا عہد اور پرانوں کا مذہب سمجھنا چاہیئے۔ ویدی اور پرانی مذہب میں بڑا فرق یہ تھا کہ ویدی مذہب میں قوائے فطرت مثلاً اندر، اگنی، سریا، ورونا وغیرہ کی پرستش تھی اور پرانی مذہب میں یہ دیوتا ہوگئے اور برہما، وشنو اور شو کی پرستش کا رواج ہوا۔ بڑی خصوصیت اس جدید عہد کی بتوں کی پوجا ہے۔ قدیم سے دیوتاؤں کے چڑھاوے آگ پر چڑھائے جاتے تھے لیکن

بدھ مذہب کے بعد سے یہ چڑھاوے بتوں کے سامنے پیش ہونے لگے اور اس بت پرستی میں طرح طرح کی رسوم اور سیکڑوں قسم کے باطل عقاید اور توہمات کو زور ہوگیا۔ یہ تغیر بہت برا ہوا۔ بتوں کی پرستش انسان کے دل پر کبھی پاک اثر پیدا نہیں کرتی اور اس وجہ سے بہت سی خرابیاں اور برائیاں ہندوؤں میں پیدا ہوگئیں البتہ تخیلات اور توہمات غالب آگئے اور بت پرستی نے شان و شوکت اور دھوم دھام کی رنگین بڑھا دیں اور اس ضمن میں سنگ تراشی، شاعری، موسیقی اور فن تعمیر اور ظاہری رسوم اور ظاہری عبادت اور اندھا دھند تقلید نے ترقی پائی۔ اور ذات کا امتیاز اور مختلف فرقوں کا نفاق درجۂ کمال کو پہونچ گیا۔ ذات نے برہمنوں کی قوت اور وقعت کو بیشک بڑھا دیا لیکن باقی تمام پیشہ وروں اور دستکاروں کو ذلیل اور کمین بنا دیا (کس قدر شرم کی بات ہے کہ طبیبوں، سناروں، لوہاروں، جولاہوں، رنگ سازوں، اسلحہ سازوں اور عطاروں کا شمار چوروں اور رنڈیوں کے ذیل میں کیا گیا ہے۔ اس سے قوم میں نفاق اور منافرت پیدا ہوگئی، برہمنوں کے عروج کے لئے ساری قوم کو ذلیل ہونا پڑا۔)

لیکن اسکے ساتھ ہی یہ زمانہ بھی عظمت سے خالی نہیں۔ گویا یہ قدیم زمانے کا آخری دور تھا۔ بکرماجیت اور اسکے نورتن اسی زمانے کی مشہور یادگاریں ہیں، جسکی شان و شوکت کی داستانیں اب تک ملک میں مشہور ہیں۔ راجپوت بھی اول بار میدان تمدن میں اسی زمانے میں نظر آتے ہیں۔ منو کا مشہور شاستر بھی اسی دور کی تصنیف ہے اور اس زمانے کی معاشرت

ور سوم اور مذہب کے سمجھنے کے لئے بڑی کار آمد ہے۔ کالیداس اور بھوابھوتی جو ہندوستان کے سب سے بڑے مشہور شاعر اور ڈراما نویس گزرے ہیں اسی زمانے میں پیدا ہوئے اور ایک دنیا اب تک انکے کمال کی عزت کرتی ہے۔ شاعری اور ڈراما اس زمانہ کا اصلی حسن تھا۔ اسکے علاوہ فن نجوم وطبابت میں بھی ترقی ہوئی۔ اور یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ کچھ اوپر دو ہزار سال پہلے اسکندر اعظم کے لشکر میں ہندو طبیب موجود تھے اور گیارہ صدی بعد ہارون الرشید کے دربار میں بھی دو ہندو طبیب (منکا اور سالا) نظر آتے ہیں۔

فاضل ابوریحان بیرونی جو محمود غزنوی کے زمانے میں ہندوستان آیا اور یہاں رہ کر اس نے ہندوؤں کے حالات وعلوم کا بڑے غور سے مطالعہ کیا اس نے اس بحث پر ایک بےمثل کتاب لکھی ہے جسکے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گیارھویں صدی میں ہندو زوال کی حالت میں تھے۔ مذہب برہمنوں کی ملک تھی عوام جہالت و باطل توہمات میں مبتلا تھے۔ علوم و سائنس کا چرچا اٹھتا جاتا تھا اور جو چند لوگ جاننے والے تھے وہ بتانے میں بڑا بخل کرتے تھے مگر باوجود اسکے اپنے ملک اور قوم پر بڑا فخر و ناز تھا۔ دوسرے ممالک اور اقوام کو نہایت حقارت سے دیکھتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ ملک ہے تو انکا۔ قوم ہے تو انکی اور علوم وفنون ہیں تو انکے اور باقی سب ہیچ اور مہمل ہے۔ ذلت اور غلامی یہاں تک بڑھ گئی تھی کہ دیسیوں (مصلح دوست کارون وغیرہ) کا شمار سوورون میں ہونے لگا تھا۔ اور

مذہبی تعلیم حاصل کرنے سے محروم کردیئے گئے تھے، اور بجائے علوم و فنون کے مہمل روایات اور فضول قصے کہانیاں رائج ہوگئیں تھیں۔ پولیٹیکل قوت میں بھی ضعف پیدا ہوگیا تھا اور ذات کی قیود نے اتحاد سے بیگانہ کردیا تھا۔

ہندوستان پر اس وقت ہر طرف انحطاط و زوال چھایا ہوا تھا اور آفتاب تمدن لب بام تھا کہ جھٹ پٹے کے وقت ایک جدید عہد کا آغاز ہوا۔ مغرب کی تاریکی میں قدیم راہ سے ایک نئی قوم نے سرزمین ہند میں قدم رکھا اور صبح ہوتے سارے ملک پر مسلط ہوگئی۔

یہ مسلمانوں کی قوم تھی جو اول سندھ میں پہونچی اور بعد ازاں افغانستان کے راستے ہندوستان میں داخل ہوئی۔ اور کئی صدی تک اس ملک پر حکمران رہی۔

اس سے پیشتر آریا اور برہمنی تمدن پر اندر اور باہر سے مختلف اور متعدد حملے ہوچکے تھے۔

۱۔ ایرانیوں نے پانچویں صدی قبل مسیح میں اس ملک پر حملہ کیا۔

۲۔ یونانیوں نے چوتھی صدی قبل مسیح میں یورش کی۔

۳۔ اسکے بعد اہل باختر کے حملے تیسری یا پانچویں صدی تک ہوئے۔

۴۔ پانچویں صدی ق م میں بدھ مذہب کا بڑا حملہ برہمنی مذہب اور تمدن پر ہوا۔

۵۔ غیر آریا اقوام ہند اور وحشی اقوام کے حملے خصوصاً غیر آریا سلطنتوں کی طرف سے ساتویں اور آٹھویں صدی میں۔

۶۔ ادنیٰ اعتقادات اور وحشیانہ رسوم کی برہمنی مذہب سے کشمکش جس پر سے شنکر اچاریہ کی تعلیم سے آٹھویں نویں صدی میں فلسفی فرقہ

شو کی بنا پڑی اور اس مذہب کے دیگر مصلحون کے ذریعہ بارہ سے سولھوین صدی تک نشوونما ہوئی ۔

۷۔ مسلمانون کے حملے گیارھوین صدی سے اٹھارھوین صدی تک ۔

۸۔ انگریزی عہد ۔

لیکن نہ یونانی اسکا کچھ کر سکے نہ ایرانی نہ بدھ مذہب قائم رہا نہ غیر آریا اقوام کا اثر ۔ یہاں خود بخود یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سی بات ہے جس سے آریا قوم ان تمام مخالف اثرات پر غالب آئی اور باوجودیکہ اسکی اکثر ہم عصر اور ہم سر قومیں دنیا سے مٹ گئیں لیکن وہ اب تک قائم ہے اور نہ صرف قائم ہے بلکہ اس میں پھر بڑھنے اور عروج کرنے کے آثار موجود ہیں ۔ اہل بابل اور انکا تمدن کہاں گیا ؟ اہل فنیشیا اور انکی تہذیب و تجارت کدھر گئی ؟ مصریون کی مشہور آفاق قوت کیا ہوئی ؟ ایرانیون کی شان و شوکت کہاں ہے ؟ یونانیون کی عالمگیر عظمت کا نام رہگیا مگر وہ عظمت والے ناپید ہو گئے ۔ روما کی شوکت و جلالت کے افسانے صرف تاریخون میں رہ گئے مگر خود ایسے مٹے کہ پھر ویسے جانشین نصیب نہوے ۔ لیکن ہندو اب بھی کم و بیش اپنی تمدن و تہذیب کے ساتھ باقی ہیں اور اقوام عالم میں بڑھنے کا دم خم رکھتے ہیں ۔ آخر اسکے وجوہ کیا ہیں ؟ میرے خیال میں اسکے بڑے اسباب یہ ہو سکتے ہیں ۔

۱۔ ہندو رشیون کی روحانی اور علمی ریاضت ۔

۲۔ اُن کا مضبوط نظام تمدن ۔

۳۔ ان کی رواداری۔

۴۔ ان کی عورتوں کی وفاداری اور جاں نثاری۔

انھیں خوبیوں کے اثر نے انھیں ابھی تک دنیا میں باقی رکھا ہے اور اگر انھوں نے انکے زندہ رکھنے کی کوشش کی تو وہ ہمیشہ قائم رہیں گے۔ لیکن یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی کہ اسلامی عہد سے قبل جس نے اس پر تسلط کیا اور اپنا اثر ڈالنا چاہا وہ یا تو خود مٹ گیا یا اس میں ضم ہوکر فنا ہوگیا۔ رہے انگریز سو انھوں نے سرے سے ایسا ڈھنگ ڈالا ہے کہ وہ ہندیوں کی سوسائیٹی سے ایسے الگ تھلگ رہتے ہیں۔ جیسے کوئی امراض متعدی سے۔ نیز فاتح کا غرور مفتوح کے میل جول کو گوارا نہیں کرسکتا۔ اس لئے نہ وہ ہم میں مل سکتے ہیں اور نہ وہ یہاں رہ سکتے ہیں (ان میں ہم میں ایک نہیں کئی سمندر حائل ہیں) اس میں شک نہیں کہ انکے تمدن اور تعلیم کا اثر ہم پر ضرور پڑے گا اور پڑ رہا ہے لیکن ہم میں ان میں حقیقی اتحاد اور میل جول پیدا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ وہ چاہتے نہیں اور افتاد ایسی آکے پڑی ہے کہ ہم بھی اسکے کچھ ایسے خواہاں نہیں۔ اور اگر کبھی انھوں نے اس کا خیال کیا بھی تو انکی ہستی بھی اسی طرح مٹ جائیگی جیسی بعض اور قوموں کی جو یہاں آکر بسیں اور اگر رہے بھی تو انہیں ہندوستان کی سب سے ذلیل قوم بن کر رہنا پڑیگا۔ اس زمانے کے حکیم شاعر نے ہندوستان کو "غارت گر اقوام و اکال الامم" کا بہت صحیح خطاب دیا ہے۔ اسکی حالت ایک سمندر کی سی ہے۔ مختلف دریا اس میں آ آکے گرتے ہیں اور اپنی ہستی فنا کرکے اسی میں مل جاتے ہیں۔ الا مسلمانوں کے

جو اگرچہ فاتح کی حیثیت سے آئے مگر بھائیوں کی طرح گھل مل کے رہے اور باوجود صدیوں کے قیام، کثرت اختلاط اور بے تکلف میل جول کے ان دونوں قوموں میں اب تک گنگا جمنی شان نظر آتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اگرچہ ہندوستان کے مسلمان ایک حد تک "ہندوا گئے" ہیں مگر اپنی قومی حیثیت اور قومی شان کو اب تک لئے ہوئے ہیں۔ ہندوستان میں مختلف قسم کے تمدن آئے مگر کسی کا اثر باقی نہ رہا اور رہا تو اس طرح کہ گویا کچھ تھا ہی نہیں۔ مگر مسلمانوں کے تمدن کے آثار نمایاں طور پر باقی رہیں گے اور اہل ہند پر اس کا ایسا گہرا اثر ہے کہ زمانہ اسے مٹا نہیں سکتا۔ ہم یہاں نہایت سرسری طور سے چند اثرات کا نام لیتے ہیں۔

(۱) مسلمانوں نے ہندوؤں کے مذہب و خیالات پر بڑا اثر ڈالا خصوصاً خالص توحید کا اثر سب سے زیادہ قابل لحاظ ہے۔

(۲) کھانے پینے رہنے سہنے اور دوسرے عام معاشرتی طریقوں میں ترقی دی۔

(۳) بیہودہ رسوم اور توہمات کا زور کم کیا۔

(۴) فن عمارت کو خاص طور پر ترقی دی۔

(۵) فن جنگ میں بھی خاص ترقی ہوئی اور توپ اور بارود کو رواج دیا۔

(۶) بعض علوم مثلاً علم النجوم۔ طبابت اور خاص کر تاریخ و جغرافیہ کا ذوق پیدا کیا۔

(۷) نئے نئے پھل پھول لائے باغبانی اور زراعت کو بڑھایا اور عام ذوق میں اصلاح کی۔

(۸) اور سب سے بڑھ کر ایک نئی زبان کا بننا ہے جو ہندو مسلمانوں کے اتحاد کی سب سے بڑی نشانی ہے۔ یہ ایک قومی وجہ ہے کہ اردو کو اس ملک کی عام زبان ہونے کا دعویٰ ہے۔

غرض دونوں قومیں ایک دوسرے کے تمدن و معاشرت اور خیالات اور دیگر اثرات سے اس قدر متاثر ہوئی ہیں کہ اب اگر کوئی چاہے کہ ان اثرات کو مٹا دے تو ناممکن ہے۔ گویا قسمت میں یہ بدا تھا کہ یہی دونوں قومیں اس ملک کی وارث ہونگی اور اسکی قسمت انہیں دونوں کے ہاتھ میں ہوگی۔ ان کے ایکے میں اسکی بہبودی و فلاح اور ترقی و عروج ہے اور انکی پھوٹ میں اسکی ذلت و خواری اور نکبت و غلامی ہے۔ جب اٹھیں گے تو مل کر اٹھیں گے اور اگر گریں گے تو اپنی نااتفاقی کی بدولت۔ دنیا میں کوئی فرد بشر ایسا نہیں ہے جو بے عیب ہو اسی طرح کوئی قوم بھی ایسی نہیں جو عیوب و نقائص سے خالی ہو مگر دنیا میں شاید ہی دو قومیں ایسی ہیں جو ایسے اوصاف اور عیوب سے متصف ہیں کہ اگر یہ اتحاد کر لیں تو ایک کے عیوب پر دوسرے کی خوبیوں سے پردہ پڑ جائے گا۔ اور ایک کے ضعف کو دوسرے کی قوت سنبھال لے گی (مسلمانوں کو یاد رکھنا چاہیئے کہ ہندو ایک ایسی قوم ہے جس کے گزشتہ کارنامے اس عالم کی بہترین اور اعلیٰ یادگاروں میں سے ہیں اور اس میں اب بھی بڑائی کے آثار اور دنیا میں ایک علمی قوم بننے کی صلاحیت موجود ہے) اور (اسی طرح ہندوؤں کو بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ مسلمان وہ قوم ہے جس نے اپنی عالمگیر فتوحات کے ساتھ علم و اخلاق کی روشنی دنیا میں پھیلائی اور گو اب انحطاط میں ہے مگر اب بھی اسکی سلطنتیں دنیا میں قائم ہیں اور اگر وہ عقل سے کام لے تو اس میں

اتنی سکت باقی ہے کہ وہ پھر دنیا کی نامور قوموں میں سے ہو جائے ۔ اسے خوش قسمتی سمجھنا چاہیئے کہ ان دو قوموں کا سنگم ایک ایسے ملک میں ہوا ہے جو دنیا میں اپنی نظیر نہیں رکھتا، اگر یہ دونوں قومیں نفسانیت اور خودغرضی کو چھوڑ دیں اور تھوڑا سا جبر اور تھوڑا سا صبر اختیار کریں تو انکے اتحاد کی بدولت ایک ایسے تمدن کی بنیاد قائم ہو جائے اور یہ خود ایک ایسی قوت بن جائیں کہ اسکی نظیر نہو اور ایک دنیا اُن کے قدموں تلے ہو۔ تاریخ عالم کو چھوڑ دو، کیا صرف ہندوستان کی تاریخ اس سبق کے لئے کافی نہیں ہے؟ کیا صدہا اور ہزارہا سال سے وقتاً فوقتاً جو آفات و مصائب کا نزول اس بدنصیب ملک پر ہوا ہے وہ کافی شہادت اس بات کی نہیں ہے کہ نااتفاقی گناہ اور اتفاق ایک بڑی نیکی ہے؟ کیا اس سبق کے سیکھنے کے لئے ابھی اور ذلتوں مصیبتوں اور ٹھوکروں کی ضرورت ہے؟ ٹھنڈے دل سے تعصب کو برطرف کر کے اگر تاریخ کا مطالعہ کرو اور واقعات و حالات کو سوچو تو اصل راز کا خودبخود انکشاف ہو جائے گا۔ مولوی سید علی مرحوم نے درحقیقت بڑا کام کیا کہ تمدن عرب اور تمدن ہند جیسی کتابوں کا ترجمہ اُردو زبان میں کر دیا تاکہ ہم ایک دوسرے کے محاسن اور کارناموں سے واقف ہو کر ایک دوسرے کی عظمت و وقعت کریں اور اپنے عیوب و نقائص پر اطلاع پا کر اصلاح کے در پے ہوں ۔ اور اصل یہ ہے کہ تمدن عرب کے بعد مولوی صاحب مرحوم کا فرض تھا کہ وہ تمدن ہند کا بھی ترجمہ کریں اور ہم خوش ہیں کہ وفات سے قبل وہ اس فرض کو انجام دے گئے۔ اس لحاظ سے اگر ہم مولوی سید علی مرحوم کا شمار فاضل ابوریحان بیرونی، علامی ابوالفضل نیاض فیضی جیسے علما میں کریں تو کچھ زیادہ بے جا نہوگا۔

لیبان کی تمدن ہند کے علاوہ ایک اور کتاب اسی بحث پر ہندی فاضل مسٹر رومیش چندر دت مرحوم کی تصنیف سے ہے۔ یہ کتابیں دو تین سال کے تفاوت سے ایک ہی زمانہ میں لکھی گئیں۔ مسٹر دت کی کتاب ہر لحاظ سے قابل قدر اور مستند ہے لیکن اسکی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص اپنے خاندان کے حالات اپنے خاندان والوں کے لئے لکھے اور ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں وہ تصویر کے روشن اور تاریک رخوں کے دکھانے میں بڑی اُستادی سے کام لے گا۔ مسٹر دت نے تحقیق میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا لیکن چونکہ ہندوؤں کو تاریخ سے دلچسپی نہ تھی اسلئے تمدن و معاشرت کے حالات دکھانے میں قصوں اور افسانوں کی کتابوں سے مدد لینی پڑی ہے اور ظاہر ہے کہ قدیم قصوں اور افسانوں میں تمدنی حالات کے دکھلانے میں کس قدر مبالغہ سے کام لیا جاتا ہے۔ بخلاف اسکے لیبان ایک غیر شخص ہے مگر ہند اور اہل ہند کے قدیم تمدن سے ہمدردی رکھتا ہے۔ اس نے جہاں محاسن دکھائے ہیں وہاں ان کے ضعف کو بھی جتا دیا ہے۔ اپنی اور غیر کی نظر میں جو فرق ہوتا ہے وہ محتاج صراحت نہیں۔ اگر کوئی ہمدرد ہیں ہمارے نقص بتائے تو وہ درحقیقت ہمارے شکریہ کا مستحق ہے۔ کیونکہ اس سے ہمیں اپنی اصلاح میں بہت بڑی مدد ملتی ہے۔ علاوہ اسکے لیبان نے یہاں کی مختلف اقوام کے حالات واصل وخصائص پر بھی بحث کی ہے اور ان اقوام کے باہمی اختلاط سے جو اثرات مرتب ہوئے ہیں وہ بھی دکھائے ہیں، جو دلچسپی و افادہ سے خالی نہیں۔ بمقابلہ مسٹر دت کے اس نے ہند کی عمارات کا حال بھی زیادہ تفصیل سے لکھا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کو اس سے خاص دلچسپی ہے۔

اگرچہ ہندی تجارت کا مجمل ذکر کیا ہے لیکن ہندی جہاز رانی کے متعلق ہر دو مصنفین ساکت ہیں حالانکہ جدید تحقیق سے یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ فن جہاز رانی ہندوستان میں قدیم سے ہے۔ علاوہ جہازوں کی اُن تصویروں کے جو اجنتا اور مدورا اور پُری کے مندروں میں موجود ہیں اور عہد آندھراں کے اُن سکوں کے جن پر جہاز کی تصویر بنی ہے، ہندوؤں کا جاوا اور سیلون میں آباد ہونا اور بدھ واعیوں کا جاپان اور چین جانا اور تجارتی تعلقات کا مصر و روم و دیگر ممالک سے ہونا اور رومی اور چینی سیاحوں کا یہاں کے بندرگاہوں اور تجارت کا ذکر کرنا کافی اور قطعی ثبوت اس امر کا ہے کہ اہل ہند فن جہاز رانی سے قدیم سے واقف تھے۔ نیز اس نے ہند کی موجودہ حالت (انگریزی عہد) سے بحث کی ہے لیکن اس ضمن میں اس نے ہندوستان کی موجودہ تعلیم اور تعلیم یافتہ اصحاب پر بڑی سختی کے ساتھ نکتہ چینی کی ہے اور موجودہ انگریزی تعلیم کو اہل ملک اور حکام ملک دونوں کے لئے خطرناک بتایا ہے۔ لیبان کی یہ رائے بعض دیگر یورپی سیاحوں اور اینگلو انڈین مصنفوں کی بھی ہے، اگرچہ اس میں کسی قدر جدت پائی جاتی ہے لیکن صاف بوئے تعصب آتی ہے۔ فاضل مصنف نے اس تنقید کے وقت دو باتوں کا لحاظ نہیں رکھا ورنہ وہ ایسی سخت رائے نہ دیا ہوتا۔

اول یہ کہ ایک ایسے ملک میں جو صدہا سال سے ایک خاص نہج پر چلا آرہا ہے، اور جو اپنا خاص تمدن اور اپنے خاص علوم رکھتا ہے جب اس میں ایک جدید تمدن اور اجنبی زبان و علوم کو رواج دیا جائیگا تو ظاہر ہے کہ دلوں میں بے چینی اور دماغوں میں پراگندگی اور انتشار پیدا ہوگا اور ابتدا میں اسکے نتائج بھی اچھے پیدا نہ ہونگے۔

دوسرے لیبان نے اوس وقت کے طریقۂ تعلیم پر غور نہیں کیا۔ تعلیمی نتائج کی خرابی زیادہ تر طریقۂ تعلیم کی وجہ سے ہوتی ہے چنانچہ اس نقص کو ملک کے اہل الرائے اور خود گورنمنٹ نے تسلیم کرلیا ہے اور اُسکی اصلاح پر برابر توجہ کی جارہی ہے چنانچہ اب کچھ تو مرور زمانہ سے اور کچھ جدید اصلاح سے بڑا فرق پیدا ہوگیا ہے اور ہمیں قوی امید ہے کہ موجودہ تعلیم اگر صحیح طریقہ سے دی گئی تو ملک اور گورنمنٹ دونوں کے لئے مفید ثابت ہوگی۔ لیبان نے ایسی ہی بعض اور خفیف غلطیاں کی ہیں جو عموماً یورپی سیاحوں سے سرزد ہوجاتی ہیں۔ مثلاً اس نے مثل ہنوشی وبعض دیگر یورپی سیاحوں اور مصنفوں کے بیگم کی اصل بیغم بتائی ہے۔

غرض مصنف کے بعد ہمیں مترجم کا ممنون ہونا چاہیئے جنکی وجہ سے یہ کتاب صحیح اور فصیح اُردو میں ہم تک پہونچی اور اردو علم ادب و تاریخ میں ایک مفید اضافہ ہوگیا۔

غلط نامہ

مقدمات عبدالحق حصہ اوّل

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۴	۴	سا	ایسا
۴	۱۴	ایک بار	ایک بار یہ
۵	۱۱	کیا	کیسا
۱۰	۳	پھلایا	پھیلایا
۱۴	۴	گی	گئے
۱۶	۵	رہا	رہا
۱۸	۱۸	ریورڈ	ریورنڈ
۱۹	۱۸	کہ	کو
۱۹	۱۹	ط	کا
۲۴	۱۳	سول	سیول
۲۵	۱	(اجہتدرائی)	(اجتہادرائی)
۲۶	۱۸	صبورتوں	سورتوں

۲۷	۱	علاوہ	باوجود
۲۹	۹	یکن	لیکن
۳۲	۳	برتاؤ	برتاؤ روا
۳۳	۳	رواتیں	رعایتیں
۳۳	۱۳	کے	کے پڑھ لینے کے بعد پھر کسی بڑی سے بڑی کتاب کے پڑھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی ۔
۳۴	۲	سکر	شکریہ
۳۵	۱۴	ہے	ہیں
۳۶	۱۴، ۱۵	حنفیہ	حنفیہ پر
۳۷	۳	آنحضرت	آنحضرت صلعم
۳۷	۱۴	کچھ کہ	کچھ
۳۸	۱	آنحضرت	آنحضرت صلعم
۳۸	۱۸	ور مکردہ	اور مکروہ
۳۹	۱۵	کھروں	گھروں
۴۰	۲	آئرونگ واشنگٹن	واشنگٹن اِرونگ
۴۰	۵	آنحضرت	آنحضرت صلعم
۴۰	۱۷	کوسش	کوشش
۴۱	۵	آنحضرت	آنحضرت صلعم
۴۱	۷	اُن	آپ

۴۱	۱۲	اٹھا رکھا	اٹھا نہ رکھا
۴۳	۱۹	تحقیق و مضموں	تحقیق وہ مضمون
۴۵	۱	مضموں	مضمون کے
۴۶	۱۱	بندہ نواز	حضرت بندہ نواز رح
۴۷	۸	سنہ ۸۱ھ	سنہ ۸۰۱ھ
۴۷	۱۷	حضرت	زندگی کی حضرت کی عمر ایک سو پانچ سال کی تھی حضرت
″	″	″	کے یہ چند واقعات ہیں اس غرض سے بیان کیے گئے ہیں
۴۸	۱۴	تقرر	تقریر
۵۳	۷	آمدہ	آمادہ
۵۴	۱۰	مبجیر	ہبجیر
۵۶	۱۹	ں میں	اِن میں
۵۸	۹	تجز	تبخیر
۵۹	۱۸	تو یہ ستتر	تو یہ ستتر
۶۲	۶	توکوئی	تو نہ کوئی
۶۳	۱	دیکھے ٹھکار	دیکھیے کیسی پھٹکار
۶۹	۲	بھی	یہی
۷۲	۱۴	ہیں	ہیں بھی
۸۰	۱	.... کرنے	پیدا کرنے
۸۰	۱۹	.... کا تصور	قوت کا تصور

۱	قوس و قزح	قوسِ قزح
۱۰	بڑی	بُڑی
۱۴	قفس	ققنس
۵	منتہے	منتہی
۴	کے	کی
۷	کہ ...	کہ میں
۱۱	میں	ہیں
۷	(جرودیمقراطیسی	(جرزودیمقراطیسی)
۷	(کانشس)	(کانشس نس)
۲	ڈنگ	ونگ
۶	جو ...اوسط	جو بہت سے اوسط
۱۴	سیرجان	سرجان
۸	جن کی	جس کی
۱۱	کاس	گاس
۱۱	مینیولا	بنیولا
۱۱	ضبایہ	ضبابہ
۹	یہ اسرار	یہ پراسرار
۱	متسکو	کے
۱	سے	شئے

۱۰۷	۲	کوئی شئے	کوئی ایسی شئے
۱۰۷	۱۱	(کانشنس)	(کانشس نس)
۱۱۱	۱۴	س	اِس
۱۱۱	۱۵	منعق	متعلق
۱۱۴	۲	ہم	اہم
۱۱۴	۸	گھر	گھرا
۱۱۵	۱	لا یجزی	لا یتجزی
۱۱۵	۲	مدرکہ توکہاں	مدرکہ کہاں
۱۱۵	۴	کانشس ...	کانشس نس ہیچ
۱۱۵	۶	بیں	ہیں
۱۱۷	۶	ڈرامہ	ڈر
۱۱۸	۱۵	مذہب	مذاہب
۱۱۹	۳	آخر مخالفت	آخر یہ مخالفت
۱۱۹	۱۴	ناکامیوں...کا	ناکامیوں اور مایوسیوں
۱۲۰	۱۷	سمجھنا	سمجھتا
۱۲۱	۷	قربانی	قربان
۱۲۲	۱	پر زیادہ	پر بہت زیادہ
۱۲۳	۱۰	فیڈس	فیڈاس
۱۲۴	۶	سر چپانے	سر چھپانے

۱۲۲	۱۳	طرف ہوتا ہے	طرف سے ہوتا ہے
۱۲۵	۵	اُس کے اصول	اُس اصول
۱۲۵	۱۵	لاتعداد	لا تعداد
۱۲۷	۴	مسائل	سائنس
۱۳۳	۱۴	بنیاد نہ ہلا سکا	بنیاد کبھی نہ ہلا سکا
۱۳۴	۵	کرتی ہے تو اور	کرتی ہے اور
۱۳۴	۶	کوئی ستارہ	کوئی نیا ستارہ
۱۳۵	۴	سے	نے
۱۳۸	۸	کا	کے
۱۳۹	۱۱	لے	سے
۱۴۰	۱	اعلیٰ	عالی
۱۴۱	۱۶	اور	یا
۱۴۲	۱۲	کیونکہ یہ ظاہر ہے	کیونکہ ظاہر ہے
۱۴۳	۱۴	سائنس وہ مذہب	سائنس و مذہب
۱۴۳	۱۵	مذہب	مذاہب
۱۴۸	۵	یا ہم	باہم
۱۴۹	۱۵	جبر	جبرِ
۱۵۸	۲	کی ... کرلیجائے	کی گفتگو کرلیجائے
۱۶۳	۸	بڑی	بدمعاش
۱۶۳	۱۴	دستی	دوستی

۱۶۳	۱۶	ٹھرے	ٹہرے
۱۶۴	۹	بیبوں	بیسیوں
۱۶۴	۱۸	تے	ہوتے
۱۶۵	۱۵	پڑ	پڑھ کر
۱۶۵	۱۷	حلے	حلیئے
۱۶۶	۱	ہمارے	ہماری
۱۶۶	۵	وقت	اوقات
۱۶۷	۷	عدل والصاف وانسانیت	عدل وانسانیت
۱۶۷	۱۱	ترکی فتح	ترکی کی فتح
۱۶۸	۸	علاقہ ربیوشہ	علاقہ ربیوسشیہ
۱۶۸	۸	مشاہیر یونان وروم منجملہ	مشاہیر یونان وروم بھی منجملہ
۱۶۹	۱	بہت سے طبائع	بہت طبائع
۱۷۳	۱۰	مزاج کے کڑے ہیں ہیں	مزاج کے کڑے ہیں۔ دنیا کے بڑے
"	"	ہیں "	بڑے تاجدار اور شہنشاہ خاص کر اسکا شکار
"	"	"	ہوگئے ہیں
۱۷۵	۱۴	دست اندازی	دست درازی
۱۷۶	۱۹	ڈنڈا	ڈانڈا
۱۷۶	۱۹	مشرق۔ الاقصی	مشرق الاقصی
۱۷۷	۲	کیو چومیں چین	کیو چو چین میں

۱۷۷	۴	انیٹہ	انیٹھ
۱۷۷	۱۴	پوانٹوریکو	پورٹوریکو
۱۷۷	۱۵	شہسوارونکا جولان گا	شہسواروں کی جولان گاہ
۱۷۸	۱۹	سرایع الاعتقادی	سریع الاعتقادی
۱۸۰	۱۷	ربیض	ابیض
۱۸۱	۴	ہوگی	ہوگئی
۱۸۱	۱۹	برا	بڑا
۱۸۲	۸	اوس	روس
۱۸۳	۴	علم	ظلم
۱۸۶	۱۴	نگر	بلکہ
۱۸۷	۱۳	بدل گئی ہو... اور	بدل گئی ہو دلوں میں منگ اور امنگوں
//	//	//	میں اپیچ پیدا ہوگئی ہو اور
۱۸۸	۹	تدبیر	تدبر
۱۸۹	۷	عزت	غیرت
۱۹۱	۵	حالات پربھی	حالات پر
۱۹۱	۶	تقدلیس	تقدس
۱۹۱	۱۵	اولی	اوّل
۱۹۲	۱	جی	دل
۱۹۲	۹	پرزہ ور	زورہ وار

۱۹۲	۹	کون	کونسا
۱۹۳	۱	تانے بانے کیطرح جکڑے ہوئے	تانے بانے کیطرح ایسے جکڑے ہوئے
۱۹۴	۳	تلاش کرنا	تلاش کرتی
۱۹۴	۳	اس تمام جہان میں	اس جہان میں
۱۹۴	۷	مثالاً	مثلاً
۱۹۵	۱۵	اردو میں ... ایسے ایسے	اردو میں اس نام میں ایسے ایسے
۱۹۵	۱۸	موقع	مرقع
۱۹۵	۱۹	بنا سے	بنیاد سے
۱۹۶	۴	ایک وسیع اور عظیم الشان منظر کی	ایک ایسے منظر کی
۱۹۶	۱۶ اور ۱۷	سوائے مراۃ العروس کے	مراۃ العروس کے سوا
۱۹۷	۲	قائل ہو جاتیں ہیں	قائل ہو جاتی ہیں
۱۹۷	۲	یہ بات سوائے مرحوم کے	یہ بات مرحوم کے سوا
۱۹۷	۹	تشبیہ	تشبیہات
۱۹۸	۴	استعمال کرتے ہیں	استعمال کر جاتے ہیں
۱۹۸	۸	ادا ہو سکتا	ادا ہو سکتا تھا
۱۹۸	۱۰	اسی سے	اس سے
۱۹۸	۱۱	آزاد رو	آزادہ رو
۱۹۸	۱۲	حمایت اسلام	حمایت الاسلام
۱۹۹	۵	حمایت اسلام	حمایت الاسلام

۱۹۹	۱۱	تخیل کے پرداز	تخیل کی پرواز
۱۹۹	۱۱	پہونچتے جاتے تھے	پہنچ جاتے تھے
۲۰۰	۹	سرسید	سرسید علیہ الرحمتہ
۲۰۰	۱۰	مولانا شبلی تک	مولانا شبلی نعمانی تک
۲۰۰	۱۶	... ان کی دینی خدمت	میں اُنکی دینی خدمت
۲۰۰	۱۸	دل کہول کے	دل کہول کر
۲۰۳	۱۶	سکوٹ	مسکوٹ
۲۰۷	۹	... ابھی ہماری قوم میں	معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ہماری قوم میں
۲۰۸	۱	... مبارک باد	دلی مبارک باد
۲۰۸	۵	ادا کردیا ہے	ادا کیا ہے
۲۰۸	۱۰	قابل مؤلف	قابل مصنف
۲۰۸	۱۵	دربار سے	درباروں سے
۲۱۲	۸	شاہ عالم بادشاہ کی بادشاہت	شاہ عالم کی بادشاہت
۲۱۲	۱۸	برٹش میویم	برٹش میوزیم
۲۱۵	۱۵	عجیب	عجب
۲۱۷	۱	لکھی ... ہے	لکھی ہے
۲۱۸	۳	انکو میر حیدر علی حیران سے تلمذ ہے	تلمذ انکو میر حیدر علی حیران سے ہے
۲۱۹	۳	شاہ جنات	شاہ اجنہ
۲۲۴	۸	اس بخیب وغریب	اس عجیب وغریب

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۲۵	۱۴	.... اور	عہد سلطنت قایم ہے اسی بادشاہ روشندل
؍؍	؍؍	؍؍	خدا پرست سے۔ پھر اسکے بعد نواب سعادت
؍؍	؍؍	؍؍	علیخاں کا ذکر کیا ہے۔ اور
۲۲۶	۱۱	اس کے بعد	ان کے بعد
۲۲۴	۲	صاف نظر آتی ہے	صاف صاف نظر آتی ہے
۲۳۵	۱۲ و ۱۳	آداب... خدمت گذاری ... ادا کیے	آداب و خدمت گذاری کے تحفے سب ادا کیے
۲۳۸	۱	شاعری کو اعتراف	شاعری کا اعتراف
۲۴۱	۷ و ۸	جو پنڈت چکبست صاحب نے	جیسے لالہ چکبست صاحب نے
۲۴۳	۱۱	بے انتہا بھبتی کی ہے	بے انتہا ہیٹی کی ہے
۲۴۴	۱۱	کبھی... دن عید اور رات شب برات	کبھی گھر گھر دن عید اور رات شب برات ہے
۲۴۶	۴	کچھ دنوں سے اسکا ساتھ دیا	کچھ دنوں اس کا ساتھ دیا
۲۴۹	۸	فارسی زبان میں نہیں	فارسی زبان میں نہیں ملتی
۲۴۹	۱۵	۲۷ ماہ صفر	۲۵ ماہ صفر
۲۵۰	۶	رسالے لکھے ہیں ۱۹۵۲	رسالے لکھے ہیں ۱ھ
۲۵۱	۶	منافہ	مناقشہ
۲۵۱	۱۶	سہالی	سہالی
۲۵۲	۳	اہالی وحوالی	اہالی و موالی

۲۵۳	۵	تالیف ...	تالیف و تصنیف
۲۵۳	۱۶	قاضی عبدالحی	قاضی عضدالحی
۲۵۳	۱۹	قاضی یحیی	قاضی عضدالحی
۲۵۴	۱۵	دلوں میں	دلوں میں
۲۵۵	۱۲	تن دھن من	تن من دھن
۲۵۹	۱	ہر جگہ موجود ہے	ہر جگہ ہوا ہے
۲۶۱	۸	اس زمانہ کے	اِس نام کے
۲۶۱	۱۲	علیہم اسلام	علیہم السلام
۲۶۱	۱۴	توتے	تھوتے
۲۶۲	۸	اِس سے.. ہدایت دی	اس سے بڑھکر ہدایت دی ہے
۲۷۱	۵	اُس کو ماناہے	اُسکو مانا ہے
۲۷۲	۴	مبقدار	بیقدار
۲۷۲	۱۳	مرصنعت	مرصنف
۲۷۳	۵	قائم	قائم
۲۷۳	۱۹	نکاتِ شعرا	نکاتِ الشعرا
۲۷۴	۱	ایں دو چار سہ بیت	ایں دو سہ چار بیت
۲۷۶	۱۵	شعلہ زن کو آتش دل	شعلہ زن کر آتش دل
۲۷۷	۱۲	ایک الزام رہ گیا	اِک الزام رہ گیا
۲۷۷	۱۸	کون یہ	کونسی یہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۷۸	۳	بہت یہ حیف	بہت پہ حیف
۲۷۸	۷	خاک سا ڈھیر	خاک کا سا ڈھیر
۲۷۸	۱۴	بے داغی سے	بے دماغی سے
۲۷۹	۱	یہ ہے	یہ ہے کہ
۲۷۹	۱۲	بجا	بجا ہے
۲۸۱	۸	سیں	میں
۲۸۱	۱۰	تک	ٹک
۲۸۱	۱۳	چاہے	چاہیئے
۲۸۳	۵	کوئی کہ جس میں بو نہیں	کوئی جس میں بو نہیں
۲۸۳	۶	یاں	بھاں
۲۸۳	۱۳	ہم سہری	ہم سری
۲۸۴	۵	کمر نہ حرارت	کر نہ حرارت
۲۸۵	۱	تائید ... ہیں	تائید کرتے ہیں
۲۸۶	۱	کریۂ شب	گریۂ شب
۲۸۶	۱۰	لے ثمری	بے ثمری
۲۹۳	۶	رکھو	رکھیو
۲۹۴	۱۱	چارہ گر... اپنا	چارہ گر ہے اپنا
۲۹۴	۱۲	ہوزگو	ہرزہ گو
۲۹۴	۱۴	کہیئے کیا	کیجیے کیا

۲۹۹	۱۱	گیارا	گیارہ
۲۹۹	۱۹	اٹھارا	اٹھارہ
۳۰۰	۹	سنہ ۱۴ء	سنہ ۱۸۴۰ء
۳۰۴	۱۴	۲۰۰ ہجری	۱۲۰۰ ہجری
۳۰۷	۵	بہم پہوچنا	بہم پہنچنا
۳۰۹	۱۰	غلا	غلو
۳۲۲	۶	نکات الشعرا...	نکات الشعرا بھی
۳۲۲	۱۷	اپنی... آپ بیتی	اپنی اس آپ بیتی
۳۲۳	۱۱	خانہ جنگیاں... بربادیاں	خانہ جنگیاں اور بربادیاں
۳۲۴	۱۹	فقر و فاقے	فقر و فاقہ
۳۲۵	۸	غم و غصے	غم و غصہ
۳۲۶	۸	کامان	کاما
۳۲۶	۱۳	کامال	کاما
۳۲۷	۱۷	مجکو	مجھکو
۳۲۸	۱۶	سیب	سب
۳۴۴	۱۵	خود...کے	خود اُنکے
۳۴۸	۱۲	اس لیئے اعظم الدین خاں	اسلیئے اعظم الدین خان
۳۵۰	۸	وہ رزکی کے	وہ روڑکی کے
۳۵۰	۱۶	صداقت نامہ	صداقت نامے

۳۵۰	۱۹	جو ہر ایک	جن میں سے ہر ایک
۳۵۴	۱۸	حاصاوتی ہے	حاصل ہوتی ہے
۳۶۰	۷	کل کتاب کتب کی	کل کتب کی
۳۶۳	۱	نولڈکی.. ہشتاد سالہ	نولڈکی ہشتاد سالہ
۳۶۲	۱۲	پڑٹا	پڑنا
۳۶۳	۱۴	سناتے	سنائے
۳۶۷	۱۵	عداوت کہتے ہو	عداوت رکھتے ہو
۳۷۱	۲	بلاد عثمانی	بلادِ اسلامی
۳۷۹	۱۱	پڑے ہیں	پڑتے ہیں
۳۸۰	۵	جرڑبوٹیاں	جڑی بوٹیاں
۳۸۱	۱۱	وید تصنیف ہوے	وید تصنیف ہوئی
۳۸۲	۱۲	ملک میں چھاگئے	ملک پر چھا گئے
۳۸۳	۵	سوکتوں میں	شوکتوں میں
۳۸۴	۲	تین قسمتیں	تین قسمیں
۳۸۵	۴	شامی	سامی
۳۸۶	۹	(سفیر سلوقس)۔ صحیح	(سفیر سلوقس) نے صحیح
۳۸۷	۲	نواسہ چندر گپت	نبیرہ چندر گپت
۳۸۷	۹	لوگ اِسلیئے بولنے	لوگ اُسکے بولنے
۳۹۰	۱۲	ذرا ظہورا اصلاح	ذرا اصلاح

۳۹۱	۲	کلاس بیل	اکلاس بیل
۳۹۱	۱۹	نزرہ زرہ	ذرہ ذرہ
۳۹۲	۱۲	بلحاظ سزا وجزا	بلا لحاظ سزا وجزا
۳۹۳	۳	جہنم کا وعید	جہنم کی وعید
۳۹۵	۱۹	نزہی لینت	نرمی لعینیت
۳۹۷	۸	تنجلی	پتنجلی
۳۹۹	۵	البتہ تخیلات	ابتر تخیلات
۳۹۹	۱۷	واستانیں	داستانیں
۴۰۰	۱۳	تھی	تھا
۴۰۰	۱۹	صناع ودستکاروں	صناع اور دستکاروں
۴۰۱	۲	رائج ہوگئیں تھیں	رائج ہوگئی تھیں
۴۰۲	۷	انگیریزیہ	انگریزیہ